"MAULANA ABDUL MAJID DARIYA BADI KI ADABI KHIDMAT"

THESIS

SUBMITTED FOR THE AWARD OF THE DEGREE OF

Doctor of Philosophy

IN

URDU

BY

Fauzia Khanam

UNDER THE SUPERVISION OF

Dr. Mohd. Ali Jauhar

DEPARTMENT OF URDU
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH (INDIA)

2012

تلخیص

ادیب، فن کار اپنے ملک وعہد کا ترجمان اور نمائندہ ہوتا ہے، وہ اپنے ملک وعہد کے تاریخی، تہذیبی، سیاسی، ثقافتی منظرناموں کو اپنی تحریروں میں پیش کر کے ادبی دنیا میں لافانی مقام حاصل کر لیتا ہے۔ اس کی تخلیقات صرف حسن خیال اور حسن کلام کی حامل نہیں ہوتی ہیں، بلکہ ادیب کی روح کی تابانی، اس کی ذات کی آرائش اور نکھار کی بھی آئینہ دار ہوتی ہے۔ ادیب اپنے غیر معمولی قوت مشاہدہ، ذوق و جمال اور حسن کردار کے ذریعہ اپنے معاشرے میں رونما ہونے والے واقعات وحادثات وغیرہ سے تاثر قبول کر کے اپنے جذبات وتاثرات کو شیریں الفاظ ودلکش انداز میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ اس کا فن پارہ قاری کے جذبات وخیالات کا ترجمان بن جاتا ہے۔ ایسے ادیبوں اور نثر نگاروں میں مولانا ماجد دریابادی کا نام سرفہرست ہے۔ مولانا نے ادب وانشا، فلسفہ، نفسیات، تنقید، سوانح، سیرت، تفسیر وترجمہ میں لافانی اور لاثانی شناخت قائم کی ہے۔ مولانا اپنے منفرد اور مخصوص طرز نگارش کی وجہ سے اپنے معاصر ادیبوں میں بلند مقام پر فائز نظر آتے ہیں۔

ادبی وتحقیقی نقطہ نظر سے اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی ہے کہ مولانا کی کثیر الجہت شخصیت کے ادبی پہلوؤں پر تحقیقی وتنقیدی کام کیا جائے۔ اسی ادبی ضرورت کے تحت یہ مقالہ بعنوان 'عبدالماجد دریابادی کی ادبی خدمات' لکھا گیا ہے، تاکہ مولانا کے ادبی خدمات کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جاسکے۔ مولانا کی شخصیت اپنے ہم عصر ادیبوں سے منفرد وممتاز ہے، وہ ایک ہمہ جہت اور آفاقی، عبقری شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے علم وادب، صحافت اور اصلاح معاشرہ کے لیے جو خدمات انجام دیئے ہیں وہ زریں حروف میں لکھے جانے کے لائق ہیں۔

مولانا نے اپنے قلم سے اردو زبان وادب کو مختلف حیثیتوں سے فیضیاب کیا ہے۔ وہ بیک وقت ایک صاحب طرز ادیب انشا پرداز، فلسفی، صحافی، عالم دین، محقق، نقاد، شاعر وڈرامہ نگار، سوانح نگار، نفسیات داں، مترجم، اور مکتوب نگار تھے۔ مولانا اسلوب بیان کی لطافتوں، نزاکتوں اور باریکیوں سے بخوبی واقف تھے۔ اسی لیے وہ جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتے تھے تو اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے موضوع کا حق ادا کر دیتے تھے۔ ان کے اسلوب نگارش کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ طرز تحریر موضوع کی مناسبت سے استعمال کرتے تھے۔ ایک کامیاب فن کار کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ موضوع کتنا ہی پیچیدہ کیوں نہ ہو لیکن اس کے طرز بیان کی دلآویزی ہر صورت میں برقرار رہتی ہے۔ مولانا کی تمام تحریریں ادبی چاشنی اور علمی وقار سے ہم آہنگ ہوتی ہیں۔ وہ یقیناً ایک ایسے صاحب طرز ادیب تھے جو اپنے اسلوب کی انفرادیت اور علمی واستدلالی نثر کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ مولانا نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ علمی، ادبی، مذہبی، صحافتی مصروفیات میں بسر کیا۔ انھوں نے اردو انگریزی میں تقریباً پچاس سے زائد کتابیں لکھیں اور بہت سے تراجم بھی کیے ہیں۔

مولانا ماجد کی ادبی تحریروں میں مولانا آزاد کی عظمت، شبلی کی بلاغت، سید سلیمان ندوی کی کی سلاست وفصاحت، اکبرالہ آبادی کی ظرافت اور اشرف علی تھانوی کی حکمت کی آمیزش پائی جاتی ہے۔

مولانا ماجد نے جب ادبی دنیا میں قدم رکھا اس وقت برطانوی سامراج پوری طرح سے ہندوستان کی سیاہ وسفید کا مالک بن چکا تھا۔ عوام وخواص میں انگریزوں اور انگریزی علوم وفنون سے مرعوبیت بڑی حد تک پیدا ہو چکی تھی، جدید علوم اور مغربی فنون کی بدولت ہمارا ملک غلام ہوا اور اسی علم جدید ہی کی بدولت ہندوستانی نوجوانوں میں اپنا حق حاصل کرنے اور غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کا جذبہ بیدار ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستانی عوام استبداد واستعماریت

، جاگیرداری اور غلامی سے نکل کر آزادی ، انصاف ، مساوات کے لیے عملی جدوجہد کرنے لگی تھی۔ جس کے نتیجے میں ہمارا ملک آزاد ہوا۔ پرانے عقیدوں اور اقدار زندگی کی جگہ جدید خیالات وافکار وجود میں آرہے تھے ، اور نئی نئی تحریکیں جنم لے رہی تھیں جیسے خلافت تحریک ، ترک موالات تحریک ، کانگریس ، مسلم لیگ وغیرہ ۔ان تحریکات کی بدولت ہندوستان میں سیاسی ، سماجی اور ادبی اعتبار سے تبدیلیاں ہونے لگیں ۔ اردو ادب میں بھی موضوع ، مواد ، ہئیت وغیرہ کی تبدیلیاں ہونی ناگزیر تھی ۔قومی جدوجہد کے زمانے میں مولانا آزاد ، حسرت موہانی ، شبلی نعمانی ، علامہ اقبال ، مولانا محمد علی جوہر ، سید سلیمان ندوی ، اشرف علی تھانوی وغیرہ جیسے عظیم المرتبت شخصیات کا ادبی ، علمی اور سیاسی اعتبار سے بول بالا تھا۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے ان تمام دانشواران قوم وملت کے اثرات قبول کیے۔

مولانا ماجد نے اس خاص ماحول وسیاسی پس منظر میں اپنے ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ ان کی تحریروں میں ایک طرف ادبی چاشنی ہے ، تو دوسری طرف حکمت وحکایات ، اصلاح معاشرہ ، مذہبی احکامات کی تعمیل کا بھی زور ہے۔ مولانا اپنی زندگی کے نوسال تشکیک والحاد میں گذار چکے تھے۔ اس لیے جب انھوں نے اسلام کی طرف مراجعت کی تو ایک نو مسلم کی طرح بڑے ہی شدومد کے ساتھ اسلام کی سر بلندی میں مصروف ہو گئے ۔ مغربی تہذیب وتمدن کی خامیوں اور مشرقی اقدار وروایات کی خوبیوں کو اپنی تحریروں کے ذریعہ اجاگر کرنا ان کا مقصد حیات بن گیا۔

مولانا ماجد دریابادی کی شخصیت ہمہ جہت وہمہ صفات تھی ۔ صحافت ، مذہب ، ادب اور تحقیق وترجمہ جیسے مختلف شعبوں میں مولانا نے اپنے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں ۔ زیر نظر مقالے کا موضوع مولانا ماجد کی ادبی خدمات ہے لیکن موضوع کی یکسانیت کی وجہ سے مولانا کا مختصر سوانحی خاکہ اور ان کی جملہ خدمات مثلاً صحافت اور مذہب کو بھی اختصار سے بیان کیا گیا ہے۔ زیر نظر مقالہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔

باب اول 'عبدالماجد دریابادی کا سوانحی خاکہ' ہے۔ اس باب میں مولانا کی ولادت سے وفات تک کے اہم واقعات ان کی تعلیم وتربیت، ازدواج زندگی اور روزمرہ کی مشغولیت اوراحباب واقارب وغیرہ کا اختصار سے تذکرہ کیا گیا ہے۔ مولانا کا سوانحی خاکہ اس لیے پیش کیا گیا ہے تاکہ ان کے معاصر سیاسی، سماجی، تہذیبی منظرنامے سے آگاہی حاصل ہوجائے۔ ادیب کی معاشرتی، تہذیبی، اقتصادی، سیاسی وسوانحی احوال وکوائف سے واقفیت کے بغیر اس کی تخلیقات ونگارشات کی تفہیم وتشریح ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ ادیب وفن کار جس ماحول ومعاشرے کا پروردہ ہوتا ہے اس کا عکس اس کی تحریوں میں نظر آتا ہے۔ اسی لیے بعض نقاد فن پاروں کی تفہیم وتشریح کے لیے سماجیاتی مطالعہ کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔

باب دوم 'عبدالماجد دریابادی اور تخلیقی ادب (بطور شاعر اور ڈرامہ نگار)' اس باب میں مولانا کا مختصر مجموعہ کلام 'تغزل ماجدی' اور ڈرامہ 'زود پشیماں' کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ مولانا نے دوسری علمی وادبی تخلیقات کے ساتھ ساتھ شعروسخن میں بھی اپنی تخلیقی صلاحیت کا جوہر دکھایا ہے۔ مولانا کا شعری سفر مشقی دور تک ہی محدود رہا۔ لیکن انھیں شعروسخن سے بڑی دلچسپی تھی اور وہ شعروشاعری کے اسرار ورموز سے بخوبی واقف تھے۔ اکبرالہ آبادی کی سرپرستی وشفقت مولانا کو میسر تھی اس کے باوجود انھوں نے شاعری پر کوئی خاص توجہ نہ دی، اور چند غزلوں کے سوا ان کا کوئی بڑا شعری کارنامہ نہیں ہے۔

مولانا کا یہ شعری مجموعہ مشقی دور کا ہوتے ہوئے بھی فکری وفنی لوازمات اور شعری محاسن سے خالی نہیں ہے۔ ان اشعار سے مولانا کی خداداد صلاحیت اور شعروسخن سے ان کی دلچسپی وتفہیم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مولانا کے کلام کو ہم فنی نقطہ نظر سے اعلی وارفع تو نہیں کہہ سکتے پھر بھی ان کے کلام کو کلی طور پر نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔ شاعری کی طرح مولانا نے صنف ڈرامہ میں بھی اپنی ایک اہم یادگار چھوڑی ہے۔ مولانا نے اپنے دور الحاد میں دوران سفر قلم

برداشتہ ایک ڈرامہ بعنوان 'زود پشیماں' لکھ ڈالا جس کی فنی وادبی اعتبار سے بڑی اہمیت ہے ۔حالانکہ مفسر قرآن مولانا ماجد اس ڈرامہ کو اپنے لیے باعث فخر نہ سمجھتے تھے، شاید اسی لیے اس کو اپنے قلمی نام ناظر کے نام سے شایع کرایا تھا۔'زود پشیماں' ایک المیہ ڈرامہ ہے ۔موضوع ومواد اور ٹکنک کے اعتبار سے بھی اس میں کوئی جدت اور خاص بات نہیں ہے، پھر بھی اردو ڈرامے کی کوئی تاریخ اس کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں مانی جاتی ہے۔معمولی ردوبدل کے بعد یہ ڈرامہ اسٹیج کیے جانے کے لائق بھی ہے۔زود پشیماں کے علاوہ مولانا نے 'بدسرشت' کے نام سے ایک اور نامکمل ڈرامہ بھی لکھا تھا۔اس باب میں مولانا کی شاعری اور ان کی ڈرامہ نگاری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تیسرے باب کا عنوان 'عبدالماجد دریابادی کی تنقید اور تحقیق' ہے۔اس باب میں مولانا کے مختلف عنوانات پر لکھے گئے تنقیدی و تحقیقی مضامین پر روشنی ڈالی گئی ہے۔بحیثیت نقاد اور محقق مولانا کے مقام ومرتبہ کے تعین کی کوشش کی گئی ہے۔مولانا کا تنقیدی سفر ان کے طالب علمی ہی کے زمانے سے شروع ہو گیا تھا۔اسی زمانے میں انھوں نے علامہ شبلی کی کتاب الکلام پر ایک طویل تنقیدی مضمون لکھا جو رسالہ 'الناظر' میں قسط وار شایع ہوا تھا۔اس کے بعد مولانا کا تنقیدی سفر جار ہمیشہ جاری رہا اور انھوں نے مختلف موضوعات پر تنقیدی مقالے، تبصرے، وغیرہ لکھے جو مختلف اخباروں اور ادبی رسالوں میں شایع ہوئے تھے۔مولانا کے بیشتر تنقیدی مضامین کتابی شکل میں شایع ہو چکے ہیں۔تنقید کے ساتھ ساتھ مولانا کی تحقیقی خدمات بھی بہت اہم ہے۔بحیثیت محقق ومرتب بھی مولانا کا ایک خاص مقام ہے۔مولانا کے تحقیقی کارناموں میں بحرالمحبت، فیہ مافیہ، تحفہ خسروی، مکتوبات سلیمانی، خطوط مشاہر کا شمار ہوتا ہے۔ اس باب میں مولانا کی تنقیدی و تحقیقی خدمات کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

چوتھے باب کا عنوان 'عبدالماجد دریابادی بحیثیت سوانح نگار' ہے۔اس باب میں مولانا

کی خودنوشت 'آپ بیتی' اورسوانح وسیرت کے موضوع پرلکھی گئی مولانا کی جملہ تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بحیثیت سیرت وسوانح نگار مولانا کا ایک اہم مقام ہے۔انھوں نے مروجہ سوانح نگاری کی روایت سے انحراف کرتے ہوئے ایک نئے انداز کی سوانح لکھی جس کی عمدہ مثال 'محمد علی ذاتی ڈائری' اور 'حکیم الامت نقوش وتاثرات' ہیں۔مولانا نے اپنی خودنوشت بھی بڑی جرات بے باکی اور ایمانداری سے سپردقلم کی ہے۔مولانا کی سوانحی تحریریں اپنے مخصوص اسلوب اورلب ولہجہ کی وجہ سے بڑی معروف ومقبول ہیں۔اس باب میں مولانا کی سیرت وسوانح کے موضوع پرلکھی جانے والی تمام تحریروں کا تنقیدی جائزہ اختصار سے پیش کیا گیا ہے۔

پانچواں باب 'عبدالماجد دریابادی کی صحافتی خدمات' ہے۔مولانا کی شہرت ومقبولیت کا ایک اہم ذریعہ ان کی صحافتی خدمات بھی ہے۔مولانا نے تقریباً پچاس سالوں تک خودکوصحافتی مشن کے لیے وقف کیے رکھا۔انھوں نے سچ ،صدق اورصدق جدید کے نام سے ہفتہ وار اخبار شایع کیا اخبار کے ذریعہ انھوں نے اصلاح معاشرہ اور مذہب کی تبلیغ وترسیل کا کام بخوبی انجام دیا۔مولانا کی فکرونظر سے آگاہی کے لیے ان کی صحافتی تحریروں کا مطالعہ بہت ضروری ہے اس لیے اس باب میں مولانا کی صحافتی خدمات کوتفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔

چھٹے باب کا عنوان 'عبدالماجد دریابادی اورمختلف اصناف ادب (سفرنامہ نگار، مترجم، مکتوب نگار)' ہے۔اس باب میں مولانا کے دوسفرناموں کا مجموعہ 'سیاحت ماجدی' اور 'سفرحجاز' کی فنی وادبی قدروقیمت کا جائزہ اختصار سے پیش کیا گیا ہے۔ترجمہ نگاری میں بھی مولانا کا ایک منفرد مقام ہے بحیثیت مترجم مولانا کی خدمات منطق وفلسفہ کے ساتھ ساتھ مذہب وقرآنیات تک پھیلی ہوئی ہے۔مولانا کی شہرت ومقبولیت کا ایک اہم سبب ان کی ترجمہ نگاری بھی ہے۔مکتوب نگاری میں بھی مولانا کا ایک اہم مقام ہے۔ان کے مکتوبات علمی، ادبی، مذہبی ،ثقافتی اعتبار سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔مولانا کے فکروفن اورشخصیت کی تفہیم کے لیے ان

کے خطوط کا مطالعہ ضروری ہے۔ 'مکتوبات ماجدی' کے عنوان سے مولانا کے خطوط کی چھ جلدیں شایع ہو چکی ہیں۔ اس باب میں مولانا کے مختلف اصناف ادب سے تعلق رکھنے والی خدمات مثلا سفرنامہ، ترجمہ، خطوط نگاری پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

ساتواں باب 'عبدالماجد دریابادی کا اسلوب نگارش' ہے۔ مولانا کے اسلوب نگارش اور ان کے منفرد لہجہ و انداز کا ذکر اس باب میں تفصیل سے کیا گیا ہے۔ مولانا کی مخصوص طرز نگارش ان کی شناخت ہے۔ صاحب اسلوب اور صاحب طرز انشا پرداز اور نثر نگار کی حیثیت سے مولانا کو یاد کیا جاتا ہے، اسی وجہ سے مولانا کی اسلوب تحریر کی تفہیم و تعبیر، تشریح کے لیے ان کی تحریروں کا اسلوبیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

آٹھواں باب 'اختتامیہ' ہے۔ یہ حصہ مقالہ کا ماحصل ہے۔ اس میں مولانا کی شخصیت اور ان کی علمی و ادبی، مذہبی و صحافتی خدمات کا جائزہ اختصار سے پیش کیا گیا ہے۔ تاکہ مولانا کی کثیر الجہت شخصیت کا ہلکا سا عکس ہمارے سامنے آسکے۔
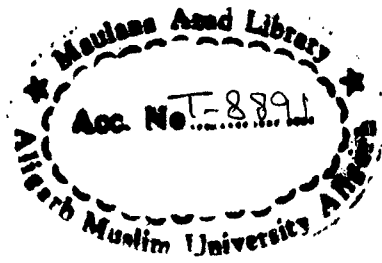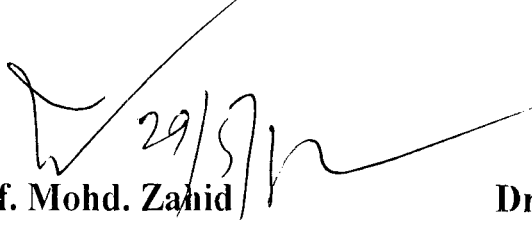
Department of Urdu

Aligarh Muslim University, Aligarh-India 202002

CERTIFICATE

This is to certify that this thesis for award of Ph.D degree entitled: "*MAULANA ABDUL MAJID DARIYA BADI KI ADABI KHIDMAT*" by ***Fauzia Khanam*** is an original research work done under my supervision and has not been submitted for any other degree of this or any other university.

It is now being forwarded for the award of Ph.D degree in Urdu Language and literature.

29/9/11

Prof. Mohd. Zahid
(Chairman)

Dr. Mohd. Ali Jauhar
(Supervisor)

فہرست

پیش لفظ

ادیب یا فن کار اپنے ملک وعہد کا ترجمان اور نمائندہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے ملک وعہد کے تاریخی، تہذیبی وسیاسی اور ثقافتی صورت حال کو اپنی تحریروں میں پیش کر کے ادبی دنیا میں لافانی مقام حاصل کر لیتا ہے۔ اس کی تخلیقات نہ صرف حسن خیال اور حسن ادا کی حامل ہوتی ہیں، بلکہ ادیب کے روح کی تابانی اور اس کی ذات کی بھی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ ادیب اپنے غیر معمولی قوت مشاہدہ، ذوق جمال اور حسن کردار کے ذریعہ اپنے معاشرے میں ہونے والے واقعات وحادثات وغیرہ کو دیکھتا اور پرکھتا ہے، اور اپنے جذبات وتاثرات اور مشاہدات کو شیریں الفاظ ودلکش انداز میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ اس کی تحریریں قارئین کے جذبات کی ترجمان بن جاتی ہیں۔ ایسے ادیبوں میں مولانا عبدالماجد دریابادی کا بھی شمار ہوتا ہے۔ انھوں نے ادب انشا، فلسفہ ونفسیات، تنقید، سوانح، سیرت، تفسیر وترجمہ میں اپنے نوک قلم سے ایسی دلکش ادبی تصاویر بنائی ہیں جو لازوال ہوگئی ہیں۔ مولانا اپنے منفرد ومخصوص طرز نگارش کی وجہ سے اپنے معاصر ادیبوں میں لاثانی مقام رکھتے ہیں۔

ادبی وتحقیقی نقطہ نظر سے اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ مولانا کی کثیر الجہت شخصیت کے ادبی پہلوؤں پر تحقیقی وتنقیدی کام کیا جائے۔ اسی ادبی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے یہ مقالہ بعنوان 'عبدالماجد دریابادی کی ادبی خدمات' لکھا گیا ہے، تاکہ مولانا کی ادبی خدمات کا اندازہ کیا جا سکے۔ مولانا کی شخصیت اپنے ہم عصر ادیبوں سے منفرد وممتاز ہے۔ وہ ایک ہمہ جہت، آفاقی وعبقری شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے علم وادب، صحافت اور اصلاح معاشرہ کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں وہ زریں حروف میں لکھے جانے کے لائق ہیں۔ مولانا نے اپنے قلم سے اردو زبان وادب کو مختلف حیثیتوں سے فیضیاب کیا۔ وہ بیک وقت ایک صاحب طرز ادیب، انشا پرداز، فلسفی، صحافی، عالم دین، محقق، نقاد، شاعر وڈرامہ نگار، سیرت وسوانح نگار، نفسیات داں، مترجم، اور مکتوب نگار تھے۔ مولانا اسلوب بیان کی لطافتوں، نزاکتوں اور باریکیوں سے بخوبی واقف تھے۔ اسی لیے وہ کسی بھی موضوع پر جب قلم اٹھاتے تو اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے موضوع کا حق ادا کر دیتے تھے۔ ان کے طرز اسلوب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ طرز تحریر بھی ویسا ہی اختیار کرتے تھے جو موضوع سے مناسبت رکھتا ہو۔ ایک

کامیاب فن کار کی پہچان یہ ہے کہ موضوع کتنا ہی پیچیدہ کیوں نہ ہو لیکن اس کے طرز بیان کی دلآویزی برقرار رہے۔ مولانا ماجد کی تمام تحریریں ادبی چاشنی سے پُرنظر آتی ہیں۔ وہ یقیناً ایک صاحب طرز ادیب تھے اور اپنے اسلوب کی انفرادیت کی بدولت پہچانے جاتے ہیں۔ مولانا نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ علمی، ادبی، مذہبی، صحافتی مصروفیات میں بسر کیا۔ انھوں نے اردو انگریزی میں تقریباً پچاس کتابیں لکھیں اور بہت سے ترجمے بھی کیے۔

مولانا ماجد نے جب ادبی دنیا میں قدم رکھا اس وقت برطانوی سامراج کا سورج قلعۂ معلی کی فصیلوں پر پورے آب وتاب سے طلوع ہو چکا تھا۔ عوام وخواص میں مغربی تہذیب وتمدن اور علوم سے مرعوبیت کا رجحان کافی حد تک پیدا ہو چکا تھا۔ اسی علم جدید ہی کی بدولت ہندوستانی نوجوانوں میں اپنا حق حاصل کرنے اور غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کا جذبہ بھی رفتہ رفتہ بیدار ہونے لگا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستانی عوام استبداد واستعماریت، جاگیرداری اور غلامی سے نکل کر آزادی، انصاف، مساوات کے لیے عملی جدوجہد کرنے لگے جس کے نتیجے میں ہمارے ملک کو آزادی نصیب ہوئی۔ پرانے عقیدوں اور اقدار زندگی کی جگہ جدید خیالات وافکار وجود میں آرہے تھے، اور نئی نئی تحریکیں جنم لے رہی تھیں جیسے خلافت تحریک، ترک موالات تحریک، کانگریس، مسلم لیگ وغیرہ۔ ان تحریکات کی بدولت ہندوستان میں سیاسی، سماجی اور ادبی اعتبار سے تبدیلیاں پیدا ہونے لگیں تھیں۔ اردو ادب میں بھی موضوع، مواد وغیرہ کی تبدیلیاں ہونی ناگزیر ہوگئی تھیں۔ اردو ادب کے شعری ونثری روایت کو جن ادیبوں نے نئی جہتوں سے آشنا کیا ان میں مولانا آزاد، اکبرالہ آبادی، حسرت موہانی، شبلی نعمانی، علامہ اقبال، مولانا محمد علی جوہر، سید سلیمان ندوی، اشرف علی تھانوی وغیرہ جیسے عظیم المرتبت شخصیات کا شمار ہوتا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان تمام دانشوران قوم وملت کے اثرات قبول کیے۔

مولانا ماجد نے اس خاص ماحول وسیاسی پس منظر میں اپنے ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ ان کی تحریروں میں ایک طرف ادبی چاشنی ہے، تو دوسری طرف حکمت وحکایات، اصلاح معاشرہ، مذہبی احکامات کی تعمیل پرزور ہے۔ مولانا اپنی زندگی کے نوسال تشکیک والحاد میں گذار چکے تھے۔ اس لیے جب انھوں نے اسلام کی طرف مراجعت کی تو ایک نومسلم کی طرح بڑے شد ومد کے ساتھ اسلام کی سر بلندی میں مصروف

ہوگئے۔مغربی تہذیب وتمدن کی خامیوں اور مشرقی اقدار وروایات کی خوبیوں کو اپنی تحریروں کے ذریعہ اجاگر کرنا ان کا مقصد حیات بن گیا تھا۔

مولانا ماجد دریا بادی کی شخصیت ہمہ جہت وہمہ صفات تھی ۔صحافت ، مذہب ،ادب اور تحقیق وترجمہ جیسے مختلف شعبوں میں مولانا نے اپنے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں ۔زیرنظر مقالے کا موضوع مولانا ماجد کی ادبی خدمات ہے لیکن موضوع کی وسعت کی وجہ سے مولانا کا مختصر سوانحی خاکہ اوران کی جملہ خدمات مثلاً صحافت اور مذہب کو بھی اختصار سے بیان کیا گیا ہے۔

تحقیقی مقالہ کے عنوان کے انتخاب کے بعد مواد کی فراہمی ایک دشوار کن مرحلہ ہوتا ہے ۔ایک سال میں نے کتابوں کا مطالعہ کرنے اور مواد کی فراہمی میں صرف کیا۔اسی دوران ڈاکٹر محمد فاروق خان کے توسط سے مولانا ماجد دریابادی کے بھتیجے اور داماد جناب عبدالعلیم قدوائی صاحب سے ملاقات ہوئی، قدوائی صاحب سے مجھے مولانا کی بہت سی نایاب کتابیں اور ڈاکٹر تحسین فراقی کی کتاب 'مولانا عبدالماجد دریابادی احوال وآثار' ملی ، یہ کتاب مواد کی فراہمی میں بہت مفید ثابت ہوئی۔مولانا ماجد صاحب کی کچھ کتابیں جواب دستیاب نہیں ہو پائی ہیں مثلاً ڈرامہ 'زود پشیماں' وغیرہ ان کے متعلق میں نے انھیں کی کتاب سے استفادہ کر کے لکھا ہے۔

پیش نظر مقالہ سات ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں مولانا کا مختصر سوانحی خاکہ پیش کیا گیا ہے تا کہ ان کے سیاسی ،سماجی ،تہذیبی پس منظر سے آگاہی حاصل ہو جائے۔کسی بھی ادیب کے معاشرتی ، تہذیبی ،اقتصادی ، سیاسی وسوانحی احوال وکوائف سے واقفیت کے بغیر اس کی تخلیقات ونگارشات کی تفہیم وتشریح ممکن نہیں ہے،اور ادیب وفن کار جس ماحول ومعاشرہ کا پروردہ ہوتا ہے اس کا عکس اس کی تحریروں میں نظر آتا ہے اسی ضرورت کے تحت مولانا کا مختصر سوانحی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ باب دوم میں مولانا کے مختصر مجموعہ کلام 'تغزل ماجدی' اور ڈرامہ 'زود پشیماں' کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔تیسرے باب میں مولانا ماجد کے مختلف عنوانات پر لکھے گئے تنقیدی مضامین اوران کے تحقیقی کارناموں مثلاً بحر المحبت ، فیہ مافیہ ،تحفہ خسروی، مکتوبات سلیمانی، خطوط مشاہیر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ باب چہارم میں مولانا کی خود نوشت 'آپ بیتی' اور سوانح وسیرت کے موضوع پر لکھی گئی مولانا کی تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے۔ باب

پنجم میں مولانا کی صحافتی خدمات کو بیان کیا گیا ہے۔ باب ششم میں مولانا کے مختلف اصناف ادب سفر نامہ، تراجم اور مکتوبات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ باب ہفتم میں مولانا کے اسلوب نگارش کی تشریح و وضاحت کی گئی ہے۔

خدائے پاک پروردگار عالم کا شکریہ ادا کرنے کے بعد اس مقالہ کے نگراں ڈاکٹر محمد علی جوہر صاحب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جنھوں نے اپنی تمام علمی و تدریسی مصروفیات کے باوجود اس مقالہ کی نگرانی قبول فرمائی اور مقالہ کی تکمیل میں میری مدد فرمائی ان کی شفقت و سرپرستی کی بدولت یہ مقالہ پایہ تکمیل تک پہنچ سکا۔

اسی کے ساتھ ہی میں صدر شعبہ اردو پروفیسر محمد زاہد صاحب اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر قاضی افضال حسین صاحب اور پروفیسر ابوالکلام قاسمی صاحب کی بھی ممنون ہوں جنھوں نے مجھے مفید مشوروں سے نوازا۔ ان کے علاوہ شعبہ اردو کے تمام مشفق اساتذہ کرام کی شکر گذار ہوں خصوصاً ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب صاحب، پروفیسر ہاشم صاحب، پروفیسر خورشید صاحب، پروفیسر قاضی جمال صاحب، ڈاکٹر مہتاب حیدر نقوی صاحب، ڈاکٹر راشد انور راشد صاحب، ڈاکٹر خالد سیف اللہ صاحب کا جن کی درس و تدریس کی بدولت بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔

مقالہ کی تکمیل میں عبدالعلیم قدوائی صاحب کی میں بہت ممنون و مشکور ہوں کہ انھوں نے مجھے مولانا کی بہت سی نایاب کتابیں دستیاب کرانے کے ساتھ ساتھ اپنی علمی مصروفیات کے باوجود اس مقالہ کا بغور مطالعہ کیا اور بعض مقامات پر اصلاح فرمائی اور مفید مشوروں سے نوازا۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے قدوائی صاحب کی سرپرستی حاصل رہی عبدالعلیم قدوائی صاحب مولانا ماجدؔ صاحب کے بھتیجے اور داماد ہیں اور انھوں نے مولانا کو بہت قریب سے دیکھا ہے اس لیے اس مقالہ میں ان کی رہنمائی میرے لیے بہت مفید ثابت ہوئی۔

سب سے پہلے میں اپنے مخلص و محسن دوست ڈاکٹر محمد فاروق خان کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جنھوں نے نہ صرف مواد کی فراہمی میں میری مدد فرمائی بلکہ مقالہ لکھنے میں بھی میری رہنمائی کی۔ اس کے بعد اپنے سینئر ڈاکٹر کمال الدین، ڈاکٹر ثاقب اور صبا پروین کی شکر گذار ہوں کہ انھوں نے مجھے مفید

مشورے دیے۔ اپنے ان دوستوں کا شکریہ ادا کرنا میرا اخلاقی فرض ہے جن کا علمی وفکری تعاون ہمیشہ میرے ساتھ رہا، رضوانہ تبسم، شازیہ، ابوالبشر، قرۃ العین، روبینہ رفیق، جمال الدین، محمد آصف۔ عزیزم محمد عمران خان اور محمد حنیف خان کی احسان مند ہوں جنھوں نے مواد کی فراہمی اور پروف ریڈنگ اور بائنڈنگ کے مشکل مرحلے میں میرا ساتھ دیا۔ اللہ رب العزت سے میں دعا گو ہوں کہ میرے ان تمام محسن وخیر خواہوں کو ہمیشہ اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ آمین!

☆☆☆☆☆☆☆

باب اوّل

عبدالماجد دریابادی کا سوانحی خاکہ

مولانا عبدالماجد دریابادی کی پیدائش ۱۶ مارچ ۱۸۹۲ء کو قصبہ دریاباد ضلع بارہ بنکی میں ہوئی۔ چونکہ 'تاریخ ادب اردو' میں ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے تاریخ ولادت یہ لکھا ہے "۱۸۹۳ء آپ کا سال ولادت ہے"۔ مالک رام صاحب نے 'تذکرہ معاصرین جلد چہارم' میں سنہ پیدائش ۱۸۹۲ء قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنے تحقیقی مقالہ 'عبدالماجد دریابادی احوال و آثار' میں ۱۶ مارچ ۱۸۹۲ء مطابق ۱۴ شعبان ۱۳۰۹ھ کو درست قرار دیا ہے۔ اپنی آپ بیتی میں مولانا نے خود اپنی تاریخ پیدائش اس طرح بیان کی ہے۔

> "۱۸۹۲ء میں والد ماجد ضلع لکھیم پور کھیری میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور والدہ ماجدہ دریاباد آئی ہوئیں تھیں۔ کہ میری پیدائش یہیں ہوئی۔ شب کا وقت تھا اور شعبان کی ۱۶ ویں۔ کہ میری پیدائش ہوئی بڑے ہوکر میں نے منشی رحمت اللہ رعد مرحوم کانپوری (بڑی جنتری والے) سے ٹھیک انگریزی تاریخ دریافت کی جواب آیا کہ ۱۶ شعبان ۱۳۱۰ھ کو مارچ ۱۸۹۲ء کی بھی ۱۶ ہی تھی واللہ اعلم۔ لیکن ایک روایت کان میں پڑی ہوئی ۱۵ مارچ کی بھی ہے۔"[۱]

اس طرح مولانا ماجد دریابادی کی تاریخ پیدائش کو ۱۶ مارچ ۱۸۹۲ء ہی صحیح ماننا چاہیے۔

عبدالماجد دریابادی کے خاندان کا تعلق لکھنو سے ملحق ضلع بارہ بنکی میں ایک تاریخی قصبہ دریاباد سے ہے، دریاباد کو اودھ کی سلطنت میں اہم مقام حاصل رہا۔ اس کے بعد انگریزی عہد حکومت کے ابتدائی زمانے میں دریاباد خود ضلع رہ چکا تھا۔ وہاں چکلہ دار (کلکٹر) رہتے تھے، اور کاروان سرائے، سرکاری عمارتیں وغیرہ موجود تھیں۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کی حیثیت کم ہونے لگی اور یہاں تک کہ اب تحصیل، تھانہ وغیرہ کا بھی خاتمہ ہوگیا اور ضلع بارہ بنکی کو قرار دے دیا گیا۔ عرصہ دراز سے دریاباد ایک معمولی و متوسط حیثیت کا ایک قصبہ ہوکر رہ گیا۔ لیکن حال ہی میں ترقی و خوشحالی کی ہوا چلی ہے اور سرکاری و پرائیویٹ کالج، اسکول و مدرسے، اسپتال، بلاک،

---

۱ آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۵۹

ڈاک خانہ، ٹاؤن ایریا کمیٹی، تار گھر، ٹیلی فون اور بجلی بھی اب قصبہ میں موجود ہے۔ یہاں پر تجارت میں جوتے کی صنعت اور ہتھ کرگھا کا کام ہوتا ہے۔ مٹھائیوں میں یہاں کے پیڑے، برفی اور ربڑی مشہور تھیں مگر اب وہ بات نہیں رہ گئی۔ یہاں کہ کل آبادی تقریباً ۲۵ ہزار ہے، جس میں نصف آبادی مسلمانوں اور بقیہ نصف غیر مسلموں کی ہے۔ مولانا کی پشتینی حویلی میں 'مدرسہ ندوۃ العلماء' کی ایک شاخ قائم کردی گئی ہے۔ جہاں سے طلبہ تعلیم حاصل کر کے ندوۃ العلماء لکھنو میں داخلہ لیتے ہیں۔ حفظ قرآن کا بھی معقول انتظام ہے۔ پختہ سڑک، ریلوے سروس اور بسوں کی وجہ سے قصبہ کلکتہ، لکھنو، فیض آباد وغیرہ سے بخوبی مربوط ہے۔

دریاباد ایک مردم خیز قصبہ ہے، جہاں کی مٹی سے بڑے بڑے باکمال علوم وفنون کے ماہرین نے جنم لیا ہے۔ اس قصبہ کی شہرت دور دراز علاقوں میں یہاں کے برگزیدہ اکابرین و مبلغین واعظوں اور غیر مسلم روساء کی بدولت ہے۔ لیکن بیسویں صدی میں اس قصبہ کی شہرت وعظمت کا سبب اس عبقری شخصیت کی مرہون منت ہے جس کو دنیا مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام سے جانتی ہے۔ قصبہ دریاباد کو شہرت اس ذات سے اتنی ہی ہوئی جتنی علی گڑھ کو سرسید احمد خان کی ذات سے۔

عبدالماجد دریابادی کی وفات پر اردو کے ممتاز ادیب پروفیسر رشید احمد صدیقی نے مرحوم کے بھتیجے اور داماد ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کے نام اپنے تعزیتی مکتوب میں بجا طور پر لکھا ہے۔

> ''یہ سطور لکھ رہا تھا تو محسوس ہوا کہ جیسے دریاباد تاریخی اعتبار سے جیسا کچھ ہو، اب مرحوم ہی کے نام سے وابستہ ہوگیا ہے۔ یہ امتیاز اس صدی میں اور ہمارے ہی دیار کے کسی اور کے حصے میں شاید ہی آیا ہو''۔[۱]

قصبہ دریاباد کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ شاہان شرقیہ جون پور کے عہد میں ایک مشہور بزرگ مخدوم شیخ محمد آبکش چشتی اپنے جدامجد قاضی عبدالکریم سرسنڈوی کے پاس پڑوس کے قصبہ محمود آباد میں آئے۔ وہاں سے شاہی عامل دریا خاں نے جاکر انھیں عزت کے ساتھ اس خطہ ویران میں لے آئے، اور حضرت مخدوم نے اس مقام کا نام دریا خاں کے نام سے موسوم کر کے دریاباد رکھ دیا۔ اس کی آبادی کی تاریخ تقریباً ۸۴۵ھ مطابق ۱۴۴۱ء سے شروع ہوتی ہے۔

عبدالماجد دریابادی کے خاندان کے مورث اعلیٰ قاضی معزالدین عرف قدوۃ الدین تھے۔ کہا جاتا

---

۱ صدق جدید: ۲۱ جنوری: ۱۹۷۷ء

ہے کہ قاضی قدوہ سلاطین دہلی کے عہد میں ملک روم سے ہندوستان آئے اور ان کو اجودھیا میں قاضی القضاۃ کا عہدہ دیا گیا اور وہ اسی سرزمین میں پیوند خاک ہوئے۔ بابری مسجد کے متصل ان کا مزار تھا۔ جس کو بابری مسجد کی شہادت کے زمانہ میں مسمار کر دیا گیا۔ مولانا اپنے خاندان کے مورث اعلی کے متعلق لکھتے ہیں۔

> ''خاندان کے مورث اعلی کا نام قاضی معزالدین عرف قدوۃ الدین تھا، ان کا زمانہ کہا جاتا ہے کہ دسویں صدی عیسوی کا تھا۔ اور محمود غزنوی کے ہم عصر تھے، بعد میں ان کا نام زبانوں پر محض قاضی قدوہ رہ گیا، مشہور ہے کہ سلطان محمود ہی کے زمانے میں کسی لشکر کے ساتھ ہندوستاں آئے اور قصبہ اجودھیا (ضلع فیض آباد) میں مقیم ہو گئے''[1]

قاضی صاحب کی ہندوستان کی آمد کی صحیح تاریخ کے تعین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کسی نے محمود غزنوی، کسی نے سلطان شہاب الدین غوری اور کسی نے خواجہ معین الدین چشتی کے عہد کو ان کی آمد کا زمانہ قرار دیا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ معاصر تذکروں میں ان کے حالات وغیرہ کا پتہ نہیں چلتا۔

قاضی قدوہ نسلاً اسرائیلی تھے۔ اس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ قدوائی خاندان کا تعلق بنی اسرائیل سے ہے، اور ان کا سلسلہ نسب لادی بن حضرت یعقوب سے ملتا ہے۔ ایک کمزور روایت یہ بھی مشہور ہے کہ قاضی قدوہ نسلا اسرائیلی نہیں تھے۔ بلکہ سادات میں سے تھے۔ لیکن چونکہ شادی اسرائیلوں کے شاہی خاندان میں ہوئی تھی اس لیے وہ خود بھی اسرائیلی مشہور ہو گئے۔

شاہان اودھ کے زمانہ میں لکھنو اور اس کے مضافات قصبہ بجنور کے شیخ زادے نسب میں کسی کو اپنے برابر کا نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن قدوائی خاندان کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہاں تک کہ ان سے قرابتیں کر کے انہیں بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا، یعنی اپنی لڑکیاں ان کے یہاں دینے اور ان کی لڑکیاں اپنے یہاں لانے لگے۔ اس طرح قدوائیوں کا خاندان اس دور کے اعلی خاندانوں مثلاً صدیقی، فاروقی، انصاری، علوی، عثمانی، وغیرہ میں شمار ہونے لگا۔ اس خاندان میں مشہور عالم، فاضل، مشاہیر، درویش، طبیب ادیب، شاعر، وغیرہ جیسی بڑی بڑی ہستیاں پیدا ہوئی ہیں۔ مسلمانوں کے دور حکومت میں قدوائی خاندان کے افراد بڑے بڑے عہدے پر فائز رہے۔ اسی طرح انگریزی حکومت میں بھی قدوائیوں کے علمی و منصبی

---

[1] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۲۴

اعزاز میں کوئی کمی نہ آئی۔ آزادی کے بعد شفیق الرحمٰن قدوائی (وزیر تعلیم صوبہ دہلی) رفیع احمد قدوائی (نامور وزیر مرکزی) اور محسنہ قدوائی نے قابل قدر عوامی خدمات انجام دیں۔ قدوائی خاندان نے ضلع بارہ بنکی میں سکونت اختیار کی اور کہا جاتا ہے کہ یہاں کے ۵۲ مقامات پر ان کا خاص غلبہ رہا، مثلاً مسولی، دریاباد، بڑا گاوں، گدیہ، جگور وغیرہ۔ تعلقہ داری زمین داری کے علاوہ سرکاری ملازمتوں اور طبابت، وکالت، علم وادب کے آزاد پیشوں میں قدوائیوں نے بڑا نام پیدا کیا۔

قاضی قدوہ کی نسل میں ان سے کوئی دس پشتوں کے بعد مشہور ہستی مخدوم شیخ محمد آبکش متوفی ۸۸۰ھ مطابق ۱۴۷۵ء کی ہوئی ہے۔ یہ جونپور کے شیخ ابوالفتح چشتی نظامی کے خلیفہ تھے، ان کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کے مرشد نے ان کے لیے مجاہدہ آبکشی کا تجویز کیا تھا یعنی پانی بھر بھر کر مسافروں کو پلائیں اور نمازیوں کو وضو کرایا کریں۔ اسی وجہ سے ان کا لقب (آبکش) پڑ گیا۔ ان کی اولاد پر مدت تک چشتیت کا رنگ غالب رہا، پھر خاندان کے ایک بزرگ بغداد سے قادریت کا تحفہ لائے اس کے بعد سے اس خاندان کا رجحان مسلک قادریت کے نام سے موسوم کیا جانے لگا۔

مولوی مظہر کریم صاحب جو مولانا ماجد دریابادی کے حقیقی دادا تھے، محمد آبکش کی گیارہویں پشت میں پیدا ہوئے ان کے چار بھائی تھے۔

(۱) مولوی حکیم نور کریم صاحب متوفی ۱۸۱۷ء

(۲) مولوی مفتی مظہر کریم صاحب متوفی ۱۸۷۳ء

(۳) مولوی حاجی مرتضیٰ کریم صاحب متوفی ۱۸۷۳ء

(۴) مولوی کرم کریم صاحب متوفی ۱۸۷۹ء

کسی بھی فن کار یا ادیب کی فنی صلاحیت کا اندازہ لگانے یا اس کے فن کی تشریح وتفہیم کے لیے ضروری ہے کہ اس کے عہد کی معلومات کے ساتھ ساتھ اس کے آباواجداد کے عادات واطوار، خصائل ومیلانات اور ترجیحات سے آگاہی حاصل کی جائے۔ کیونکہ نسلی اثرات ہر شخص پر کچھ نہ کچھ بہر حال اثر انداز ہوتے ہیں، اس لیے مولانا ماجد کی شخصیت اوران کے فن کو پوری طرح سمجھنے کے لیے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خاندان کے افراد کا تذکرہ کیا جائے۔

مولانا ماجد کے بڑے دادا مولوی حکیم نور کریم صاحب جو ان کے نانا بھی تھے۔ یہ اپنے عہد کے مشہور حکیم اور طبیب تھے۔ ان کا قیام زیادہ تر لکھنو میں رہا، اور لکھنو ہی میں انھوں نے کسب معاش کے لیے پہلے طبابت کا پیشہ اختیار کیا پھر اسے خیر باد کہہ کر سارا وقت طب کے طلبہ کی درس و تدریس میں صرف کرنے لگے۔ ان کے یہاں ملکی و غیر ملکی طلبا کی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔ اس کی بنا پر انھیں علمی حلقہ میں 'طبیب گر' کے نام سے موسوم کیا جانے لگا۔ طب کے علاوہ انھوں نے عربی و فارسی کی کچھ مستند کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا ان کی کتابیں مخزن الادویہ، مطلع العلوم، کیمیائے عناصری، شرح اسباب ہیں۔ حکیم صاحب اعلی درجہ کے خوشنویس اور ساتھ ہی زود نویس بھی تھے لغت، طب، تفسیر، حدیث، تاریخ وغیرہ کی بیسیوں کتابیں انھوں نے اپنے ہاتھ سے لکھ ڈالیں۔ ان کی رسائی اودھ کے شاہی دربار اور برطانوی رزیڈنٹ کے یہاں تھی مگر انھوں نے کبھی اس کا فائدہ نہیں اٹھایا، اور عدالت کے ایک معمولی ملازمت ججمنٹ رائٹر کے عہدہ پر فائز رہے۔ آپ کی دیانت داری اور مہمان نوازی مشہور تھی۔ عمر کے آخری سالوں میں بڑودہ میں طبی ملازمت کے لیے مدعو کیے گئے اور وہیں ان کی وفات ہوئی۔

مولانا ماجد صاحب کے حقیقی دادا مولوی مفتی مظہر کریم تھے۔ انھوں نے علم دین کی سند فرنگی محل سے حاصل کی۔ انگریزی حکومت نئی نئی قائم ہوئی تھی اور مظہر کریم صاحب شاہجہاں پور میں عدالت کلکٹری میں سر رشتہ دار مقرر ہو گئے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کا مشہور ہنگامہ انگریزوں کے خلاف برپا ہوا اسی ہنگامے میں انگریزوں نے مظہر کریم صاحب پر مقدمہ چلا کر یہ الزام عائد کیا کہ باغیوں کا جلسہ انھیں کے مکان پر ہوتا تھا اور یہ فتووں کے ذریعہ انھیں اکساتے تھے اور ان کی تائید بھی کرتے تھے۔ اسی الزام میں ان کو کالا پانی کی سزا سنائی گئی۔

ایک واقعہ یہ بھی مشہور ہے کہ انھوں نے ایک انگریز حاکم پر ترس کھا کر غدر کے زمانہ میں اپنے یہاں پناہ دی تھی۔ وہ انگریز ان کے یہاں سے بچ کر زندہ سلامت جا رہا تھا کہ اپنے لشکر تک پہنچنے سے پہلے ہی راستے میں قتل کر دیا گیا اس کے پاداش میں ان کو یہ سزا ملی۔ واقعہ جو بھی رہا ہو بہر حال مظہر کریم صاحب پر غدر کے ختم ہوتے ہی مقدمہ چلایا گیا اور اسپیشل کمشنر شاہجہاں پور کی عدالت سے انھیں ۹ سال کی سزا عبور دریائے شور (سزائے کالے پانی) کی ہوئی۔ وہاں پر ان کا تعلق متعدد عالم فاضل لوگوں کے ساتھ رہا مثلاً علامہ فضل حق خیر آبادی اور مفتی عنایت احمد کاکوری صاحب جس کے سبب علمی مشغلہ وہاں بھی جاری رہا۔

وہاں پر انھوں نے ایک انگریز کی فرمائش پر عربی کی مشہور لغت جغرافیہ 'مراصد الاطلاع' فی اسماء الامکنۃ والبقاع (صفی الدین عبدالمومن) کا ترجمہ اردو میں کر ڈالا۔ کچھ ترجمہ کے صلہ میں اور کچھ ان کی خوش چلنی، دیانت داری کی بنا پر ان کی اسیری کی مدت نو سال سے گھٹا کر سات سال کی کر دی گئی، اور مظہر کریم صاحب ۱۸۶۵ء میں وطن واپس آ گئے۔ انھوں نے اپنی عمر کا آخری حصہ دریاباد میں رہ کر عبادت اور فقہی فتاوی نویسی میں بسر کی۔ 'فتاوئے مظہریہ' ان کی ایک یادگار ضخیم غیر مطبوعہ کتاب ہے، جس کا ذکر مولانا ماجد صاحب نے اپنی سوانح میں کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ کتاب بدخط اور خط شکستہ میں لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب جامعہ ہمدرد کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ 'غایۃ المرام فی تحقیق المولود والقیام' نامی کتاب اور 'مناقب غوثیہ' کا بھی ذکر ملتا ہے۔ مذہبی وعلمی خدمات انجام دیتے ہوئے انھوں نے اس دار فانی کو الوداع کہا۔

مولانا ماجد کے سنجھلے دادا حافظ مرتضی کریم تھے۔ وہ بڑے باہمت، بلند حوصلہ، مذہبی فرائض کی ادائیگی میں آگے رہنے والے شخص تھے۔ اس کے علاوہ ایک اچھے خطاط، خوش نویس بھی تھے۔ سلطنت اودھ کے اسسٹنٹ ریذیڈنٹ کو وہ عربی فارسی پڑھاتے تھے۔ روایت ہے کہ وہ حج کے سفر پر روانہ ہوئے بمبئی پہنچے تو ان کے خدمت گار نے مال ومتاع کے لالچ میں آ کر انھیں زہر دے دیا، اور جو کچھ ہاتھ لگا اسے لے کر فرار ہو گیا۔ گرچہ ان کی جان بچ گئی لیکن اس غربت وقلاشی کے عالم میں بھی انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور وطن واپسی کے بجائے وہیں بمبئی میں معلّمی کا پیشہ اختیار کر لیا، اور دو تین برس میں زادِ سفر مہیا کر کے پھر حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ مذکورہ بالا واقعات سے ان کی مذہبی عقیدت مندی اور عالی ہمتی وبلند حوصلگی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مولانا ماجد کے اجداد میں چوتھے نمبر پر شیخ کرم کریم عرف چھیدا میاں تھے۔ وہ صوم وصلوۃ کے پابند ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے انسان دوست اور سکولر کردار کے حامل شخص تھے۔ مفلسوں وحاجت مندوں کی دادرسی بھی کرتے تھے۔ انگریزی عہد میں بھی حکام ان کی بڑی قدر ومنزلت کرتے تھے۔ وہ اپنے وطن میں ہی رہ کر خاندانی زمین داری وجاگیرداری کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ ان کو کشتی رانی اور سپہ گری سے بھی دلچسپی تھی اور ان کی شجاعت کے قصے بھی مشہور تھے۔

دریاباد کے علاوہ لکھنؤ بھی مولانا ماجد کا وطن ثانی کا درجہ رکھتا ہے۔ اس لیے کہ ان کے نانا نور کریم صاحب

نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ لکھنو ہی میں بسر کیا۔ جیسا کہ مولانا ماجد صاحب کی خودنوشت سے پتہ چلتا ہے۔

''دریاباد کے علاوہ ہم لوگوں کا تعلق شہر لکھنو سے بھی قدیمی چلا آرہا ہے۔ نانا صاحب کی تو عمر ہی لکھنو میں گذری وہیں پڑھا، وہیں پڑھایا۔ اور شہر میں صاحب اثر ورسوخ رہے۔ دادا صاحب بھی گویا نیم فرنگی محلی ہو گئے تھے۔ والدہ، خالائیں اور اکثر عزیزوں کی پیدائش بھی لکھنو میں ہوئی، فرنگی محل سے تعلق ورابطہ حد یگانگت تک پہنچا ہوا تھا۔ اطبائے جھنوائی ٹولہ سے بھی ربط وضبط رہا۔ اور سندیلہ، کاکوری، بانسہ، گدیہ وغیرہ کے شریفوں کی جونوآبادیاں لکھنو میں قائم ہوگئی تھیں ان کے میل جول سے ہماری پوری برادری لکھنو میں قائم ہوگئی تھی۔ اور لکھنو ہم لوگوں کے لیے اگر وطن نہیں، تو وطن ثانی ضرور بن گیا تھا۔''[۱]

والد ماجد

مولانا ماجد کے والد مولوی عبدالقادر کی پیدائش لکھنو میں ہوئی۔ انھوں نے اپنے وقت کی مشہور ومعروف دانشگاہ فرنگی محل سے تعلیم وتربیت حاصل کی۔ ان کے خاندان کا تعلق فرنگی محل سے ہمیشہ خوش گوار ہی رہا۔ اس لیے ان کے والد عبدالقادر نے اپنے زمانے کے مشہور عالم وفاضل اور پرطریقت استاد مولوی محمد نعیم فرنگی محلی سے عربی، فارسی کی بعض نصابی کتابوں کا درس لیا۔ عبدالقادر صاحب ان کے خاص اور عزیز شاگردوں میں سے تھے۔ مولانا ماجد خودنوشت میں لکھتے ہیں۔

''مولوی عبدالقادر، پیدائش ۱۸۴۸ء میں ہوئی غالباً لکھنو میں، تعلیم وتربیت یہیں پائی۔ وقت کے دارالعلم والعمل فرنگی محل میں۔ ایک استاد مشہور عالم وشیخ طریقت مولوی محمد نعیم فرنگی محلی تھے، ان کے یہ شاگرد بالاختصاص رہے۔ باقاعدہ عالم تو نہیں لیکن درس کی اکثر کتابیں پڑھ لی تھیں۔ اور عملاً عالم کے درجہ میں آہی چکے تھے۔ عربی وفارسی میں دست گاہ کے ساتھ ساتھ اردو کی بھی استعداد اچھی خاصی حاصل کر لی تھی۔''[۲]

۱۔ آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص ۳۰۔۳۱

۲۔ ایضاً: ص: ۳۲

عبدالماجد دریا بادی کے والد عبدالقادر صاحب اپنے زمانے کے مشہور عالم فاضل وفقیہہ اور پیر طریقت صوفی شمس العلماء مولوی ابوالحیاء محمد نعیم سے بیعت ہوئے تھے۔اس طریقہ سے وہ قادری سلسلہ تصوف سے وابستہ ہوگئے۔اس بات کی وضاحت 'معاصرین' میں مولانا ماجد نے اس طرح کی ہے۔

"شمس العلماء مولوی ابوالحیاء محمد نعیم اس شاخ کے روشن ستارے تھے۔علم خصوصاً فقہ اور تقوی واحتیاط میں اپنی نظیر آپ۔والد ماجد انھیں سے پڑھے، اور ان سے قادری سلسلے میں بیعت بھی ہوئے۔عربی کا نصاب نظامی اور اردو فارسی بھی لازمی طور پر پڑھی۔"[۱]

مروجہ علوم کی تحصیل کے ساتھ ساتھ عبدالقادر صاحب نے وکالت کا امتحان بھی پاس کیا تھا۔لیکن یہ پیشہ ان کے مزاج اور طبیعت کے خلاف تھا۔اس لیے انھوں نے اس پیشہ کو کسب معاش کا ذریعہ کبھی نہیں بنایا۔ بلکہ معلّمی وتدریسی پیشہ سے اپنے آپ کو وابستہ کیا، اور اپنے ہی ضلع بارہ بنکی میں ایک جھوٹے سے سرکاری اسکول میں فارسی کے استاد کی حیثیت سے کیا۔پھر ضلع ہردوئی پہنچ گئے وہاں ایک انگریز افسر کو نجی طور پر فارسی پڑھائی اس نے خوش ہوکر اپنی خصوصی سفارش سے انھیں عدالت فوجداری کی سررشتہ داری دلا دی۔اپنی لگن، محنت، اور ایمانداری کی بدولت جلد ہی ترقی کر کے تحصیل داری کے عہدے پر فائز ہوگئے۔ سندیلہ کی تحصیل داری کے فرائض کی ادائیگی بڑی خوش اسلوبی، ایمانداری اور جاں فشانی سے کرتے رہے۔حکومت اور رعایا دونوں ان کے کام سے خوش رہے۔قصبہ سندیلہ کی شہرت دور دراز علاقوں میں اس نیک نام تحصیل دار کی وجہ سے پھیل گئی تھی۔تحصیل دار کا عہدہ اس زمانے میں بڑے رعب، دبدبہ اور شان وشوکت کا مانا جاتا تھا،لیکن عبدالقادر صاحب کا حسن سلوک اور اخلاقی برتاؤ ایسا تھا کہ ہر چھوٹے بڑے سے وہ بڑی کشادہ جبینی سے ملتے تھے۔غصہ کرنا، ڈانٹنا ڈپٹنا، جھڑکنا تو جیسے جانتے ہی نہ تھے۔اسی لیے عوام ان کو اپنا مخلص وخیرخواہ تصور کرتی تھی۔ ہر طبقہ میں ہردل عزیزی اور مقبولیت سے مالا مال رہے۔تعصب کسی سے نہ رکھتے تھے لیکن انھوں نے مذہبی عقائد وامور پر کسی بھی قیمت پر کبھی سمجھوتا نہیں کیا۔تنگ نظری، منافرت سے اپنے دامن کو کبھی داغدار نہ ہونے دیا۔جلد ہی وہ ترقی کر کے ڈپٹی کلکٹر ہوگئے۔

مولانا ماجد صاحب کی پیدائش سے قبل ہی وہ ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر فائز ہو چکے تھے۔اس وقت یہ عہدہ

---

[۱] معاصرین: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص:۹

ہندوستانیوں کے لیے ترقی کی معراج سمجھا جاتا تھا۔ ان کو تنخواہ کا گریڈ چار سو روپیہ کا ملتا تھا۔ عبدالقادر صاحب نے ہردوئی، بارہ بنکی، لکھیم پور، گونڈا، بستی، گورکھپور، فیض آباد، سیتا پور، وغیرہ اضلاع میں ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دی۔ آخر میں سیتا پور ان کا تبادلہ ہوا اس وقت ان کی تنخواہ پانچ سو روپیہ ہو گئی تھی۔ خاندانی زمین داری سے بھی تقریباً سو روپیہ ملنے کی وجہ سے عبدالقادر صاحب کی کل آمدنی تقریباً چھ سو روپیہ ماہوار ہو جاتی تھی۔ اس زمانے میں شان و شوکت و امیرانہ زندگی بسر کرنے کے لیے یہ رقم معقول تھی۔

عبدالقادر صاحب اپنی آمدنی کا ایک معقول حصہ ضرورت مندوں محتاجوں، اور سائلوں پر فی سبیل اللہ خرچ کرتے تھے۔ اللہ نے ان کو دل کا بھی غنی بنایا تھا۔ فضول خرچی و اسراف سے انھوں نے اپنے آپ کو ہمیشہ بچائے رکھا۔ دوسرے معاملات کی طرح دولت میں بھی انھوں نے اعتدال و تناسب کا ہمیشہ خیال رکھا۔ موصوف نے خدمت خلق کو اپنا مذہب و مسلک بنا لیا تھا۔ خالق و مخلوق کی رضا کے لیے انھوں نے اپنے آپ کو وقف کر رکھا تھا۔ عبدالماجد صاحب نے 'آپ بیتی' میں اس کی وضاحت بڑے دلچسپ انداز سے کی ہے۔

> ''والد ماجد کے مزاج میں تمکنت نام کو بھی نہ تھی، وضع قطع، چال ڈھال، لباس اور بول چال کسی چیز سے پتہ نہ چلنے پاتا کہ یہ شہر کے حاکم اور ڈپٹی ہیں (اس وقت کے ڈپٹیوں کا رعب داب، اب کن لفظوں میں بیان ہو) پیدل چلے جا رہے ہیں، راستہ میں کسی چپراسی نے حضور سلام کہہ دیا، بس وہیں کھڑے ہو کر اس سے بات چیت شروع کر دی۔ اس کے گھر والوں کی خیریت پوچھ رہے ہیں، آج کسی کی سفارش کا خط لکھ رہے ہیں، کل کسی کے کام کے لیے خود چلے جا رہے ہیں، کتنوں کی مدد اپنی جیب سے کرتے رہتے۔ تنخواہ کا ایک معقول حصہ، یتیموں، بیواؤں اور غریب عزیزوں پر خرچ کرتے۔ جاڑوں میں بستی کے ناداروں کو رضائیاں بنوا دیتے۔ وطن جب آتے تو بستی کے بچوں کو تازی جلیبیاں تقسیم کرتے۔ گھر پر ایک میلا سا لگ جاتا۔ خاندان والوں کے لیے موسمی تحفے لکھنو سے ضرور لاتے، کبھی حلوہ سوہن، آم، خربوزہ، یا لیچی یا نارنگی۔ اکثر عزیزوں کی دعوت کرتے، سب کو دسترخوان پر بٹھا کر کھلاتے، گھر پر آئے ہوئے

کسی بھی سائل کو حتی الامکان محروم نہ واپس کرتے ،بعض سائل مستقل پھیرا ہر سال کرتے رہتے ۔آتے اور کئی کئی دن مہمان رہتے ۔ایک صاحب یاد ہیں ،اونٹ پر سوار ہو کر آتے ۔آنے والوں میں کبھی کبھی ہندو فقیر بھی ہوتے ،آتے اور اپنا حصہ لے کر جاتے ایک ہندو فقیر اچھی طرح یاد ہے، آتا اور یہ صدا لگاتا ''بڑھو، عبدالقادر بڑھو' نوکروں ،چاکروں کے قصور سے اکثر چشم پوشی کر جاتے ۔غصہ اگر آتا بھی تو دیر پا نہ ہوتا''۔[۱]

عبدالقادر صاحب کے روزمرہ کے معمولات یہ تھے کہ وہ علی الصباح بیدار ہوتے ،اور نماز فجر کے آخر وقت میں مولانا ماجد اور ان کے بڑے بھائی کو جگاتے اور یہ تینوں باجماعت نماز ادا کرتے ۔پھر اس کے بعد کلام پاک کی تلاوت کرتے ۔ترجمہ وتفسیر کے لیے شاہ ولی اللہ دہلوی کی فارسی تفسیر اور دوسری شاہ رفیع الدین کی اردو تفسیر ،جس پر حاشیہ تفسیر ابن عباس اور تفسیر جلالین دو دو تفسیریں تھیں پڑھتے تھے۔آخر میں مولوی نذیر احمد دہلوی کا ترجمہ پڑھنے لگے تھے۔تلاوت کلام پاک کے بعد پابندی سے ورزش کرتے تھے۔پھر دودھ کا ناشتہ کرتے اتنے میں ملنے ملانے والے لوگ آجاتے ،ڈاکیہ اخبارات لے کر آتا۔لکھنو سے شائع ہونے والا انگریزی اخبار 'ایڈوکیٹ' اور علامہ شبلی کی ادارت میں شائع ہونے والا اردو ماہ نامہ 'الندوہ' آتا اخبار بینی کرتے کرتے دس بج جاتے پھر کھانا کھاتے اور کچہری چلے جاتے ۔ظہر کی نماز وہیں ادا کرتے اور سہ پہر کو گھر آتے عصر کی نماز پڑھتے ہلکا پھلکا ناشتہ کرتے مغرب کی نماز پڑھتے اور وظیفہ پڑھتے اور رات کا کھانا عشاء کی نماز سے قبل ہی کھاتے تھے اور پھر نماز پڑھ کر دیر رات تک لکھنے پڑھنے میں مشغول رہتے ۔ملازمت سے سبکدوشی کے بعد اخبار ورسائل میں مذہبی قسم کے مضامین لکھا کرتے تھے۔ان کے مضامین لکھنو کے روز نامہ اودھ اخبار اور گورکھپور کے سہ روزہ ریاض الاخبار اور ہفتہ وار مشرق وغیرہ میں شائع ہوتے تھے۔مشرق کے جس پرچہ میں ان کی وفات کی خبر شائع ہوئی اسی شمارہ میں ان کا آخری مضمون بھی شائع ہوا تھا۔

۱۹۰۴ء میں شیخ عبدالقادر اپنے عہدہ سے بحسن خدمت سبکدوش ہو گئے اور اب انھیں ڈھائی سو روپیہ ماہانہ پنشن ملنے لگی تھی اور حسن اتفاق سے سیتا پور میونسپل بورڈ میں سکریٹری کے عہدے پر ان کا تقرر ہو گیا اور انھیں یہاں سے ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار ملنے لگا۔اس طرح مالی حالت ریٹائرمنٹ کے بعد بھی خوشگوار رہی ۔پھر

---

[۱] آپ بیتی :مولانا عبدالماجد دریابادی :ص:۳۶۔۳۷

۱۹۰۹ء میں اپنے ایک عزیز چودھری شفیق الزماں تعلقہ دار گڑھی بہلول کے اصرار پر ان کے علاقہ کی مینیجری کا عہدہ قبول کرلیا اور ان کا مستقل قیام لکھنو ہوگیا۔ تقریباً ایک ڈیڑھ سال تک وہ اس عہدے پر اپنی خدمات بحسن خوبی انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد تعلقہ دار صاحب اور ان کے مابین کچھ اختلافات پیدا ہوگئے جس کے سبب انھوں نے قطع تعلق بہتر سمجھا اور رئیس صاحب نے بھی ایک بڑی رقم حسب معاہدہ پیش کردی جس کی وجہ سے شیخ عبدالقادر کے لیے حج بیت اللہ کے اسباب اور زاد راہ مہیا ہوگیا۔ ۱۹۱۲ء میں عبدالقادر صاحب اپنی بیوی اور بیٹی کے ہم راہ حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوگئے۔ ممبئی تک اپنے والدین کو الوداع کہنے کے لیے مولانا بھی گئے جس کا اظہار انھوں نے خودنوشت میں اس طرح کیا ہے۔

> ''بمبئی تک یہ پیکر الحاد فرنگیت بھی ساتھ گیا۔ جہاز کی روانگی میں برابر دیر ہوتی چلی گئی، بالآخر مجھے واپس آنا پڑ گیا۔ پڑھائی کا جو ہرج ہو رہا تھا۔ رخصتی کے وقت والد مرحوم کی آنکھوں سے آنسو زار و قطار جاری تھے۔ بالکل خلاف معمول اور آہ! کہ عالم آب و گل میں یہ آخری رخصتی تھی۔ میں شقی القلب و نادان ان کی اس رقت قلب اور فطری بارش مہر کو حیرت سے دیکھتا اور بے محل سمجھتا رہا۔''[1]

حج کے فرائض کی ادئیگی کے بعد ۱۴ نومبر ۱۹۱۲ء کی رات میں عبدالقادر صاحب ایک موذی و مہلک مرض ہیضہ کے شکار ہوگئے، اور انھیں اونٹ پر ڈال کر منی سے مکہ معظمہ لایا گیا، یہاں پر ۱۶/نومبر ۱۹۱۲ء کو فجر کی اذان کے وقت یہ پاک مٹی حاجی 'لبیك اللھم لك لبیك' کہتا ہوا اپنے مالک حقیقی اور پروردگار کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ 'انا للہ وانا الیہ راجعون' نماز جنازہ صحن حرم میں بیت اللہ شریف کے سایہ میں ادا کی گئی، اور انھیں جنت المعلیٰ میں مشہور صحابی عبدالرحمٰنؓ بن ابی بکر کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

عبدالقادر صاحب کے انتقال کی خبر جب ہندوستان پہنچی تو یہاں کے مختلف اخبارات اور رسائل میں ان کے لیے تعزیتی مضامین وخبریں شائع کی گئیں۔ ان کے فرزند ارجمند مولانا عبدالماجد دریابادی نے بھی ایک تعزیتی مضمون ہفتہ وار مشرق (گورکھپور) میں لکھا۔ اکبر الہ آبادی نے مولوی عبدالقادر صاحب کی تعزیت میں مولانا عبدالماجد کی فرمائش پر یہ قطعہ ارشاد فرمایا تھا۔

پیشوائے قوم والا مرتبت شیخ عبدالقادر والا صفات

---

[1] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۳۹

آخرت ہی پر نظر رکھتے تھے وہ — سمجھتے تھے دنیائے دوں کو بے ثبات
جاہ ومنصب میں وہ گو ممتاز تھے — کرتے تھے یاد خدا دن ہو کہ رات
ان کے ذکر وشغل کا تھا یہ اثر — شغل ہی میں نکلی تاریخ وفات

والدہ ماجدہ

عبدالماجد دریابادی کی والدہ ماجدہ بی بی نصیر النساء ۱۸۵۳ء میں لکھنو میں پیدا ہوئیں۔ان کے والد حکیم نور کریم تھے۔ان کی کل آٹھ اولادیں تھیں۔پانچ لڑکیاں تین لڑکے۔ان میں نصیر النساء سب سے چھوٹی تھیں۔اس زمانے میں مسلم معاشرے میں لڑکیوں کی تعلیم معیوب سمجھی جاتی تھی۔اس لیے ان کے خاندان میں بھی تعلیم نسوں کی روایت یا اہمیت نہ تھی، اور نہ اس زمانے میں عورتوں کے تعلیمی ادارے موجود تھے۔اس لیے انھوں نے روایتی تعلیم حاصل نہیں کی۔بلکہ قرآن پاک ناظرہ پڑھ لیا تھا۔قرآن پاک اٹک اٹک کر ایک ایک لفظ نکال نکال کر پڑھ لیتی تھیں۔تلاوت عمر بھر روزانہ پابندی سے کرتی رہیں۔اردو میں مولوی اسماعیل صاحب کی پہلی دوسری کتاب سے آگے نہ بڑھ سکیں اور آخر عمر میں یہ بھی سب بھول چکی تھیں۔شکل صورت میں اپنے زمانے میں ممتاز تھیں اور ساتھ ہی خانہ داری کا سلیقہ، حسن اخلاق، گہری مذہبیت کی وجہ سے خاندان میں ہر دل عزیز تھیں۔بچپن میں ان کے والد کی مالی حالت بہت اچھی نہیں تھی۔مولانا ماجد کی والدہ جب اپنے بچپن کی تنگ دستی کے واقعات اپنے بچوں کے سامنے سناتی تھیں تو سب کے سب آب دیدہ وغمزدہ ہو جاتے تھے۔شادی کے بعد مالی حالت بہت بہتر ہوگئی تھی۔زندگی بڑی خوش حالی اور عزت کے ساتھ بسر ہوئی۔شوہر سے ان کے تعلقات بڑے خوش گوار تھے وہ گھر میں ملکہ بن کر رہیں اور راج کرتی رہیں۔اولاد بھی خوش طالعی سے سعید اور اوصاف حمیدہ والی ملی۔

بی بی نصیر النساء مزاج کی نیک، ہمدرد، باحیا، غریب پرور اور بڑی فیاض تھیں۔گھر میں جو کچھ ہوتا بلا دریغ تقسیم کر دیتیں، اس کی پرواہ کیے بغیر کہ خود ان کے بچوں کو بھی ان چیزوں کی ضرورت ہے۔یہاں تک کہ کبھی کبھی اپنے استعمال کی چیزیں بھی غریب پڑوسی یا عزیزوں کو دے دیتیں اور خود موٹے جھوٹے پر گذر کر لیتیں۔وہ ایک باعفت، پاکباز، صوم وصلوۃ کی پابند، ملنسار، خلیق قسم کی گھریلو مشرقی خاتون تھیں۔نماز روزہ کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ مرحومہ اذان کے وقت کا انتظار کرتی رہتیں۔پنجگانہ نماز کے علاوہ تہجد، چاشت،

اشراق، وغیرہ کی حتی المقدور پابندی کرتی تھیں۔ اپنی والدہ کی مذہبی صفات کا اظہار مولانا ماجد صاحب نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

''شوق عبادت میں اپنی نظیر آپ تھیں، عمر طویل پائی، اشراق وچاشت دونوں نمازوں کا کیا ذکر ہے۔ تہجد تک میرے علم میں ناغہ نہ ہونے پاتی اور ہمت کا کمال یہ تھا کہ شب کے آخر حصہ میں نماز وقت فجر سے گھنٹہ پون گھنٹہ قبل اٹھنے کے بجائے عین درمیان شب میں اٹھ بیٹھتیں اور وضو کر کے چار یا آٹھ رکعتیں ہی نہیں، پوری بارہ رکعتیں کھڑے ہو کر پڑھتیں اور پھر نماز فجر، اول وقت، منھ اندھیرے پڑھ ڈالتیں۔ یہی حال روزے کی پابندی کا تھا۔ عمر اور ضعف کو دیکھ کر ہم لوگ برابر یہ کہا کرتے کہ اب آپ پر روزہ فرض نہیں، ایک نہ سنتیں، اور رمضان کے روزے تو بڑی چیز ہیں، عاشورہ، محرم، عرفہ ذی الحجہ وغیرہ کے مسنون ومستحب روزے تک چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوتیں۔ حج وزیارت کی بھی بڑی مشتاق رہا کرتیں۔ حج بیت اللہ کی سعادت تو اللہ نے نصیب کرادی۔ زیارت مدینہ منورہ مقدر میں نہ تھی، شوہر کا انتقال معاً بعد فرائض حج ۱۴ر ذالحجہ کو ہو گیا اور بیوہ کو کوئی صورت سفر کی باقی نہ رہی بجز واپسی وطن کے۔ یہ حسرت آخر تک دل میں رہی اور یہ دلی حسرت زیارت وہ کام کر گئی جو شاید خود زیارت بھی نہ کر سکتی سفر حج اور نماز تہجد، دونوں کے تذکرے ایسے مزے لے لے کر بیان کرتیں کہ سننے والیوں کے دل میں وہی ولولہ وحوصلہ پیدا ہو جاتا۔''[۱]

۵۹ سال کی عمر میں بیوہ ہو گئیں اور چند سال پھر انھوں نے تنگی میں گذارے۔ اس لیے کہ ان کے بڑے بیٹے کی تنخواہ بہت قلیل تھی اور صاحب اولاد بھی تھے۔ دوسرے بیٹے یعنی عبدالماجد دریابادی بھی اس وقت بے روزگار تھے۔ لیکن بعد میں بڑے لڑکے مولوی عبدالمجید ترقی کر کے ڈپٹی کلکٹر ہو گئے اور خود عبدالماجد صاحب علم وادب کی دنیا میں نامور ہو گئے جس کی وجہ سے یہ صورت حال قائم نہ رہی۔ ان کا انتقال ۱۳ر اپریل ۱۹۴۱ء کو فیض آباد میں ہوا۔ وہاں سے ان کی نعش دریاباد لائی گئی اور یہیں پر ان کی تدفین خاندانی مسجد کے

۱۔ آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۴۴۔۴۵

قریب ہوئی۔ اپنی والدہ ماجدہ کے انتقال پُر ملال کے بابت مولانا ماجد دریابادی آپ بیتی میں لکھتے ہیں۔

''اپریل ۱۹۴۱ء میں جب بھائی صاحب فیض آباد میں ڈپٹی کلکٹر تھے، یہ انھیں کے پاس تھیں کہ بخار میں مبتلا ہوئیں اور ایک مختصر سی شدید علالت کے بعد ۱۳/اپریل (۱۵/ربیع الاول ۱۳۶۰ھ) یوم یک شنبہ کو اخیر وقت عصر میں، میری زبان سے سورۂ یسین سنتے سنتے رحلت فرما گئیں۔ عمر ۸۷، ۸۸ کی پائی، میت کو غسل کے بعد ہم لوگ لاری پر رکھ کر دفن کے لیے دریاباد لے آئے۔ اور یہیں اپنے حسب خواہش خاندانی مسجد کے عین پشت پر، قدیم گورستان میں جگہ پائی۔ اذان کی آواز کی جیسے عاشق تھیں، کہا کرتی تھیں کہ قبر ایسی جگہ بنے جہاں اذان کی آواز سنائی دے۔ اللہ نے مومنہ صالحہ کی آرزو پوری کردی۔ زندگی میں آخری کلمہ جو زبان سے ادا ہوسکا، اور وہ مجھ نالائق کو مخاطب کر کے تھا، یہ تھا کہ ''بھیا اب سورۂ یسین پڑھ دو۔''[۱]

بھائی بہن

عبدالماجد دریابادی کے بھائی بہن یوں تو پانچ تھے مگر ان میں سے صرف ایک بھائی اور ایک بہن باحیات رہے۔ مولانا عبدالماجد بھائی بہن میں سب سے چھوٹے تھے۔ بہن کا نام سکینہ تھا شکل وصورت میں ممتاز تھیں اور مزاج کی نیک، ہمدرد، عبادت گزار، فرماں بردار، وفا شعار خاتون تھیں۔ والدین کی خدمت واطاعت میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھتی تھیں۔ مروجہ روایت کے مطابق ان کی باضابطہ تعلیم نہیں ہو پائی تھی، پھر بھی اپنی لگن وذوق سے انھوں نے اردو ادب میں مہارت پیدا کر لی تھی۔ قرآن ترجمہ کے ساتھ پڑھنا روز کا معمول تھا اور مذہبی کتابیں مستقل پڑھتی رہتی تھیں۔ مختلف مذہبی کتب کے مطالعہ کی کثرت سے وہ نفسیاتی مریضہ ہوگئیں، جس کی بدولت ۱۴، ۱۵ سال کی عمر میں ان کی صحت بہت خراب ہوگئی تھی۔ ایک طبیب نے یہ مشورہ دیا کہ قیامت نامہ وغیرہ پڑھنے سے ان کے دل میں آخرت کا ہول بیٹھ گیا ہے اور اس لیے صرف مفید مذہبی کتابیں ان کو مطالعہ کے لیے دی جائیں اور مناسب علاج وغذا کا اہتمام کیا جائے۔ نماز روزہ کبھی ناغہ نہ کرتی تھیں اور پنج وقتہ فرض نماز کے علاوہ چاشت، اشراق، تہجد وغیرہ بھی پابندی سے پڑھتی تھیں اور رمضان

---

[۱] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۴۶۔۴۷

کے روزے پابندی سے رکھتی تھیں۔عبدالماجد دریابادی اپنی ہمشیرہ کے متعلق 'آپ بیتی' میں لکھتے ہیں۔

''اردو کی معمولی سی تعلیم پا کر بس بچپن ہی سے مذہبی کتابوں کے مطالعہ میں پڑ گئیں اور خوف آخرت دل میں ایسا بیٹھا کہ اپنے کو گویا عبادت ہی کے لیے وقف کر دیا۔کئی کئی پارے قرآن مجید کے مع اردو ترجمہ کے ان کی روزانہ تلاوت کا معمول۔پنج وقتہ طویل نمازوں کے علاوہ اشراق، چاشت، اور تہجد کی نمازیں داخل معمول۔کمزوری و ناطاقتی کی بنا پر روزے میں ذرا کچی تھیں، پھر بھی رمضان کا کوئی روزہ چھوٹنے نہ پاتا، حج و زیارت کی اس درجہ شائق کہ کہنا چاہیے کہ ۱۹۱۲ء میں انھیں کا اصرار اور تقاضا والد ماجد مرحوم کو حج کے لیے لے گیا۔زکوۃ کا حساب با قاعدہ رکھتیں اور یوں عام داد و دہش میں خدا معلوم کتنا دے نکلتیں۔شادی سے قبل ۱۴، ۱۵سال کے سن میں عام صحت بہت گر گئی تھی۔ایک طبیب حاذق نے نبض دیکھ کر والد ماجد مرحوم سے کہا کہ ہول آخرت ان کے دل میں بیٹھ گیا ہے۔قیامت نامہ وغیرہ پڑھنا ان سے چھڑایئے۔صرف بہشت نامہ وغیرہ پڑھتی رہیں۔''[1]

شادی چچازاد بھائی ڈاکٹر محمد سلیم سے ہوئی تھی۔شوہر کے ساتھ پردیس میں بہت کم رہتیں والدین کے ساتھ زیادہ رہتی تھیں اور ان کی خدمت میں ہمہ وقت مصروف رہتیں، لاولد تھیں۔عقیدت و محبت ان کو زندہ و مرحوم دونوں قسم کے بزرگوں سے تھی۔عمر کے آخری حصہ میں مولانا ماجد کی بدولت حضرت اشرف علی تھانوی سے خصوصی عقیدت رکھنے لگی تھیں۔ان کے شوہر ڈاکٹر محمد سلیم کا انتقال ۱۹۲۳ء میں مرض دق (T.B) کی وجہ سے ہوا۔اور بی بی سکینہ ۳۶۔۳۷ سال کی عمر میں بیوہ ہو گئیں۔بقیہ زندگی انھوں نے خدا کی عبادت اور خدمت خلق میں بسر کیا۔حج و زیارت کی بہت شائق تھیں والدین کے ساتھ حج بیت اللہ کی زیارت سے مشرف ہوئیں۔۲۲/اپریل ۱۹۴۵ء میں لکھنو میں ان کا انتقال ہوا اور عیش باغ (لکھنو) کے مشہور گورستان میں انھیں دفن کیا گیا۔

عبدالماجد دریابادی کے بڑے بھائی عبدالمجید تھے۔تعلیم و تربیت دستور کے مطابق اردو، فارسی، عربی کی گھر پر ہوئی۔عبدالمجید کو بچپن سے ضیق النفس (Asthma) کا مرض لاحق ہو گیا تھا۔جس کی وجہ

---

[1] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۴۸۔۴۹

سے ان کی تعلیم زیادہ نہ ہوسکی انٹرمیڈیٹ جواس زمانے میں (ایف .اے) کہلاتا تھا پاس کرنے کے بعد نائب تحصیل دار مقرر ہوگئے ،اور گونڈہ ،بستی ،پرتاب گڑھ، بہرائچ ،فیض آباد کے ضلعوں میں نوکری کرتے ہوئے آخر میں لکھنو کی ایڈیشنل سٹی مجسٹریٹ کے عہدے سے پنشن لے کر بحسن خوبی سبکدوش ہوئے۔اپنے بڑے بھائی کے بارے میں مولانا ماجد صاحب لکھتے ہیں۔

''نام عبدالمجید بچپن ہی سے ضیق النفس کے مریض کہا جاتا ہے کہ فلاں بزرگ خاندان دمے کے مریض کا کھایا ہوا تربوزہ کھالیا تھا،بس جب سے یہ مرض لاحق ہوگیا۔علاج شفیق باپ نے دنیا بھر کا کرڈالا۔سن کے ساتھ مرض بڑھتا ہی گیا۔دورہ پڑتا تو تکلیف دیکھنے والوں سے دیکھی نہ جاتی۔برسوں تک ایک مرض خناق کا بھی رہا۔وہ ضیق سے بڑھ کر جان لیوا۔خیر ادھیڑ سن میں تو خناق سے نجات ہوگئی تھی۔اس صحت کے ساتھ لکھتے پڑھتے بھلا کیا یہی غنیمت ہے کہ انٹرمیڈیٹ تک پڑھ گئے تھے، یہ ایف اے کا درجہ بھی اس وقت بی.اے سے کچھ ہی کم تھا۔ بہر حال نائب تحصیل داری میں نامزد ہوگئے۔اور والد مرحوم کے بعد ترقی کرتے کرتے ڈپٹی کلکٹری تک پہنچ گئے۔لکھنو کی سٹی مجسٹریٹی سے پنشن پائی۔''[۱]

عبدالمجید صاحب اپنے والد کی طرح اپنی نیک نامی ،خدمت خلق ،دیانت داری کی بنا پر جہاں بھی رہے ہر دل عزیز ،مقبول و نیک نام رہے۔ بیوی وفا شعار تھیں۔اولادیں پانچ تھیں چار لڑکے ایک لڑکی۔ بیوی ۱۹۵۱ء داغ مفارقت دے گئیں۔اس غم نے ان کو بہت متاثر کیا۔خدا کی عبادت میں انھوں نے اپنے آپ کو اور مشغول کرلیا۔نماز کے پابند تو وہ ہمیشہ سے تھے لیکن اس حادثہ کے بعد ان کا زیادہ تر وقت اذکار و ظائف میں گذرنے لگا۔عبدالماجد صاحب لکھتے ہیں۔

''رفیقہ حیات کی مفارقت سے بھائی صاحب کا مغموم و متاثر رہنا تو ظاہر ہی ہے لیکن ایک اچھا اثر یہ بھی پڑا کہ تلاوت قرآن روزانہ پابندی سے کرنے لگے، اور نماز کے تارک تو بحمداللہ پہلے بھی نہ تھے،اب زیادہ پابند ہوگئے۔پنشن لے کر وطن نہیں آئے لکھنو ہی کو وطن بنایا اور مسلمانوں کے مختلف رفاہی اور فلاحی کاموں

---

[۱] معاصرین: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۷۷

میں درس گاہوں یتیم خانوں وغیرہ کی اعزازی خدمتوں میں لگ گئے۔''[۱]

مولوی عبدالمجید صاحب کا مرض ضیق النفس میں ۲۰ دسمبر ۱۹۶۰ء کو لکھنو میں انتقال ہوا۔ اور عیش باغ کے مشہور گورستان میں دفن کیے گئے۔ اسی گورستان اور انجمن اصلاح المسلمین کے وہ مدتوں نیک نام سکریٹری رہے تھے۔ دونوں بھائیوں میں مثالی محبت تھی اور برادری، حلقہ احباب میں بطور مثال پیش کی جاتی تھی۔ حسن اتفاق سے مولوی عبدالمجید صاحب کے چاروں صاحب زادوں کی شادیاں مولانا ماجد صاحب کی لڑکیوں سے شرعی طور پر بڑی سادگی سے ہوئیں۔ اوران چار چار سمدھیانوں کے باوجود دونوں بھائیوں کی محبت اور تعلقات میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔

عزیز و اقارب

عبدالماجد دریابادی کے والد عبدالقادر صاحب اپنے والدین کی سب سے چھوٹی اولاد تھے اور مولانا ماجد بھی سب سے چھوٹے تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے دادا، نانا کسی کو نہیں دیکھا۔ صرف اپنی نانی کو ضعیف العمری میں عمر کے آخری ایام میں اس وقت دیکھا جب وہ نابینا اور معذور ہو چکی تھیں۔ ان کی بہوئیں، بیٹیاں، پوتیاں، نواسیاں سبھی ان کی تیمارداری میں لگی رہتی تھیں۔ اس زمانہ میں بزرگوں کی خدمت شریف گھرانوں میں باعث فخر سمجھا جاتا تھا۔ عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں۔

> ''میں نے اپنے اجداد میں سے کسی کا زمانہ نہیں پایا۔ میرے والد بھی خود ہی اپنے والدین کی سب سے چھوٹی اولاد تھے، اور میں ان کی سب سے چھوٹی اولاد۔ قدرۃً اپنے دادا، نانا میں سے کسی کو نہیں دیکھا۔ صرف اپنی نانی کا بالکل اخیر، اور معذوری کا زمانہ یاد ہے۔ پلنگ پر مستقل فریش تھیں، بینائی بھی جا چکی تھی۔ لڑکیاں، بہوئیں، پوتیاں، نواسیاں ہر وقت خدمت میں لگی رہتیں، یہی اس زمانہ میں شریف گھرانوں کا عام دستور تھا۔ یہ نہ تھا کہ بوڑھوں کی خبر کے لیے کوئی نرس یومیہ کرایہ پر بلائی جاتی۔ خدمت میں میری والدہ خاص طور پر پیش پیش رہتی تھیں۔''[۲]

مولانا ماجد نے اپنی عمر سے بڑے رشتہ داروں میں چچا، ماموں، خالہ، پھوپھی وغیرہ ہی کو دیکھا تھا۔

---

۱ آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۵۲

۲ ایضاً: ص: ۵۴

ان کے حقیقی چچا معمولی ملازمت کے بعد سبکدوش ہو چکے تھے۔ وہ اچھے خاصے پڑھے لکھے اور دین دار انسان تھے۔ چنانچہ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد گھریلو دوا علاج کے ساتھ ساتھ دعا تعویذ بھی کرتے تھے۔ وہ ایک اچھے خوش نویس بھی تھے۔ اخبار و رسائل بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ جبکہ اس وقت اخبارات و رسائل خال خال و کمیاب ہوتے تھے۔ مولانا کی شخصیت پر بھی ان کے کچھ مثبت اثرات مرتب ہوئے جس کا اعتراف انھوں نے 'آپ بیتی' میں اس طرح کیا ہے۔

''.....اخبار اس وقت ایک نادر چیز تھے، یہ کوئی نہ کوئی اخبار منگاتے رہتے۔ پانچ سال کے سن کی بساط ہی کیا۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ لغت فارسی کی ضخیم کتاب 'برہان قاطع' اور روزنامہ 'اودھ' اخبار کی جلدیں ان کے پاس تھیں، سحر خیز اور نماز کا پابند اتنے ہی سن میں انھوں نے مجھے بنا دیا تھا۔''[۱]

عبدالماجد دریابادی کی پانچ پھوپھیاں تھیں۔ دو کی شادی دریاباد ہی میں ہوئی۔ ماموں تین تھے چھوٹے ماموں کا شمار اس وقت کے نامور لوگوں میں ہوتا تھا۔ عربی کے جید عالم اور ماہر طبیب تھے۔ کیننگ کالج لکھنو میں فارسی کے استاد تھے۔ اور وہیں اپنا مطب بھی کرتے تھے۔ دریاباد سے انھیں خاصی محبت تھی اس لیے وہ ہر ہفتے دریاباد جایا کرتے تھے۔ عبدالماجد صاحب لکھتے ہیں۔

''.....ماموں تین تھے، چھوٹے ماموں کا شمار جوار کے مشاہیر میں تھا۔ عربی کے عالم و حاذق طبیب، کیننگ کالج میں فارسی کے استاد تھے اور لکھنو ہی میں مطب بھی کرتے رہے۔ ہر ہفتہ دریاباد آنے کے پابند۔ شرح سکندر نامہ کے مصنف۔''[۲]

مولانا ماجد کی چار خالائیں تھیں۔ سبھی مولانا کو بہت عزیز رکھتی تھیں۔ آخری خالہ کے انتقال کے وقت مولانا ماجد کی عمر ۳۶ سال تھی۔ اس کا ذکر مولانا ماجد نے 'آپ بیتی' میں اس طرح کیا ہے۔

''چار خالائیں تھیں، میں سب کا دلارا۔ آخری کا انتقال ۱۹۲۸ء میں ہوا، جب میں ۳۶ سال کا ہو گیا تھا۔ انھیں شفقت میں ماں سے کم نہ پایا۔''[۳]

مولانا ماجد کا خاندان بہت وسیع تھا۔ رشتے میں بھاوج، بہنیں، چچیاں، ممانیاں سبھی تھے۔ آپس میں ایک دوسرے سے رنجش، چپقلش، باہمی غم و غصہ کا ہونا لازمی تھا۔ جس سے ان کا خاندان بھی محفوظ نہ رہ سکا۔

---

[۱] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۵۴

[۲] ایضاً: ص: ۵۵ : [۳] ایضاً: ص: ۵۵

لیکن مولانا ماجد کے والدین نے ہمیشہ اتحاد و آپسی میل جول کا خیال رکھا۔ اگر دل میں کوئی کدورت، رنجش نہ ہوتو دور کے رشتے بھی قریبی معلوم ہونے لگتے ہیں، ورنہ اپنے عزیز بھی غیر نظر آتے ہیں۔ چونکہ مولانا ماجد کے والدین میں عاجزی وانکساری تھی اس لیے وہ خاندان میں ہر دل عزیز تھے اور سبھی کو عزیز رکھتے تھے۔ مولانا ماجد لکھتے ہیں۔

"خاندان بڑا تھا، رشتے ناتے کی بھاوجیں، بہنیں، چچیاں، ممانیاں، جیسی سب کی ہوتی ہیں، میری بھی تھیں اور آپس میں رنجشیں، چشمکیں، جنگیں بھی جاری تھیں۔ لیکن میرے والدین کی صلح سب سے تھی اور یہ اللہ کی ان خصوصی نعمتوں میں سے ہے، جو میرے ساتھ رہی۔ لڑائی جھگڑا الگ رہا، دور کے عزیز بھی بالکل قریب کے معلوم ہوتے رہے۔"[۱]

مولانا ماجد کے چچازاد بھائی دو تھے۔ بڑے کا نام عبدالحلیم اور تخلص آثر تھا۔ شعر و ادب کے دلدادہ تھے۔ انگریزی اور اردو میں مہارت کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی میں بھی صلاحیت رکھتے تھے۔ مولانا ماجد کی ابتدائی تعلیم میں عبدالحلیم کی سرپرستیوں و کاوشوں کا بڑا عمل دخل رہا ہے۔ مولانا خودنوشت میں موصوف سے اپنے کسب فیض کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

"..... دیوان حالی سب سے پہلے انھیں کے پاس دیکھنے میں آیا۔ پڑھے لکھے وقت کے معیار سے اچھے خاصے، یعنی درجہ انٹرمیڈیٹ تک انگریزی اور اردو دونوں میں صاحب استعداد، فارسی بلکہ عربی کی بھی شد بد سے واقف۔ میری ابتدائی تعلیم وتربیت میں بڑا دخل انھیں مرحوم کو تھا۔ اخبار سناتے، کتابیں دکھاتے، پڑھواتے، شررؔ کی 'فردوس بریں' اخباروں میں 'اودھ پنچ' 'اودھ اخبار' اور انگریزی کے 'آبزرور' (لاہور) اور 'پانیر' (الہ آباد) کے نام اور شکل سے میں انھیں کے ذریعہ واقف ہوا۔ سرسید، سید محمود، شبلی، حالی، نذیر احمد، ریاض وغیرہ کے نام انھیں کی زبان سے سنے۔ دین کی بھی بڑی غیرت وحمیت رکھتے تھے، شادی بانسہ میں ہوئی تھی۔ اخیر دسمبر ۱۹۰۳ء تھا وہیں عرس میں گئے ہوئے تھے، کہ یک بیک طاعون

---

[۱] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۵۵

میں مبتلا ہوئے اور دو تین دن کے اندر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ میں اس وقت کل دس، گیارہ سال کا تھا۔ اللہ بال بال مغفرت فرمائے، میرے سب سے پہلے محسن ومربی کہنا چاہیے کہ یہی تھے۔''[۱]

مولانا ماجد کے دوسرے چچا زاد بھائی محمد سلیم تھے۔ وہ مولانا کے بہنوئی بھی تھے۔ محمد سلیم سب اسسٹنٹ سرجن تھے۔ ۴۸، ۴۹ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ مولانا ماجد سے ان کا رشتہ حقیقی بھائی سا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ جو کچھ آمدنی ان کی ہوتی تھی اسے بلا دریغ چھوٹے بھائی بہنوں اور مولانا ماجد پر خرچ کر دیتے تھے۔ مولانا ان کے متعلق لکھتے ہیں۔

''.....عمر ان کی بے وفا ثابت ہوئی۔ ۴۸، ۴۹ کا سن ہوگا کہ دق میں مبتلا ہوئے اور کوئی پانچ مہینے کے بعد اگست ۱۹۲۳ء میں رہ گزائے آخرت ہو گئے۔ میرے والد مرحوم کے ہم راہ جا کر حج بھی کر آئے تھے، مزاج کے غصہ ور تھے، لیکن ہم لوگوں کے حق میں بالکل بھائی۔ اپنے کوئی اولاد نہ تھی، جو کچھ کماتے، سب ہم ہی لوگوں پر لگا دیتے اور میری تو ہر چھوٹی بڑی ضرورت کے کفیل تھے۔''[۲]

مولانا ماجد کے ایک خالہ زاد بھائی حکیم حاجی عبدالحسیب تھے۔ جو عمر میں ان سے تیرہ سال بڑے تھے۔ لیکن دونوں میں بڑی محبت اور خلوص تھا۔ عبدالحسیب صاحب اپنے زمانے کے ایک بہت مشہور طبیب حاذق تھے۔ بورڈ آف میڈیسن کے ممبر اور طبیہ کانفرنس یوپی کے صدر جیسے اہم عہدوں پر فائز رہ چکے تھے۔ حکومت سے ان کو شفاء الملک کا خطاب بھی ملا تھا مگر انھوں نے واپس کر دیا تھا۔ مولانا ماجد نے ان سے اپنی قلبی وابستگی کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

''.....سن میں مجھ سے ۱۳، ۱۴ سال بڑے تھے، لیکن شروع ہی سے بڑے بے تکلف رہے۔ شروع شروع میں اخبار یا کتاب جو منگانا پڑتی انھیں کے پیسے سے منگاتا، علم مجلس میں ماہر، اور بڑے بذلہ سنج۔ لکھنو کے عمائد میں شمار ہوتے رہے، اکتوبر ۱۹۵۰ء میں چند منٹ کی علالت میں دار فانی سے گذر گئے۔ جنازہ دریاباد لایا گیا۔ نماز یہاں دوبارہ ہوئی۔''[۳]

---

۱ آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۵۵۔۵۶

دوسرے خالہ زاد بھائی شیخ نعیم الزماں سندیلوی تھے۔ان کی باضابطہ تعلیم تو کوئی خاص نہیں ہوئی تھی۔ لیکن انھوں نے اپنے ذوق وشوق کی بدولت شعروادب،علم وحکمت،تصوف میں اتنی لیاقت بہم پہنچالی تھی کہ ان کا شمار پڑھے لکھوں کے زمرے میں ہونے لگا تھا۔مولانا 'آپ بیتی' میں ان کے متعلق لکھتے ہیں۔

".....تعلیم ضابطہ سے تو کچھ ایسی نہ تھی لیکن اپنی ذہانت اور کتب بینی سے بہت کچھ پڑھ گئے اور بہت کچھ کڑھ گئے تھے۔قوت گویائی میں اپنی نظیر آپ، تاریخ،جغرافیہ،اور تصوف میں خوب درک پیدا کرلیا تھا۔میں نے ایک زمانہ میں بہت کچھ ان سے سیکھا لکھنو میں ۱۹۴۴ء میں وفات پائی۔"[۱]

مولانا ماجد کی رضاعی ماں ایک ملازم کی بیوی تھیں۔مولانا ماجد کے پیدائش کے بعد ان کی والدہ بیمار ہوگئی تھیں جس کی وجہ سے رضاعت ان سے کرائی گئی۔مولانا ان کی خدمت حسب استطاعت کرتے رہے،اوران کا تذکرہ بھی اپنی سوانح میں محبت وعقیدت سے کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں۔

".....ایک غریب وگم نام ضعیفہ کی یاد تقاضہ کررہی ہے کہ میں قابل ذکر ہی نہ سمجھی گئی۔یہ میری انا یعنی مرضعہ تھیں۔سندیلہ کی رہنے والی،گھر کے ایک ملازم کی بیوی،والدہ زچہ خانہ میں بیمار ہوگئیں تھیں،اس لیے رضاعت ان سے کرائی گئی۔ جب خود صاحب اولاد ہوگیا اور مذہبی احساس شعور بھی از سرنو بیدار ہوا،تو احساس ہوا کہ بچاری میری کتنی بڑی محسنہ تھیں۔ہمارے ہاں سے میرے بچپن ہی میں رخصت ہوگئی تھیں۔اور بیوہ ہوئے بھی سالہا سال ہوچکے تھے،بہر حال اب جیسی تھوڑی بہت خدمت کی توفیق ہوئی،وہ ان کے گھر بیٹھے ان کی کرتا رہا۔اپنے ہاں قصداً نہیں بلایا کہ برتاؤ میں رکھ رکھاؤ نہ ہوسکے گا۔"[۲]

مولانا ماجد نے اپنی کھلائی (بوا) جنھوں نے ان کی بچپن میں پرورش وپرداخت کی تھی ان کا ذکر بھی اپنی رضاعی ماں کے فوراً بعد کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں۔

".....اچھی خاصی شریف پٹھان خاندان کی تھیں۔لیکن مفلسی بہر حال خود ایک جرم تھی۔ہمارے ہاں ملازمہ کی حیثیت سے عمر گذاردی۔اور کبھی کسی

---

[۱] آپ بیتی:مولانا عبدالماجد دریابادی:ص:۵۷

ادب تعظیم کے قابل نہ سمجھی گئیں۔ قبل اس کے کہ ان کا حق کچھ ہی سمجھ سکوں ۱۹۰۹ء
میں بڑی تکلیف دہ بیماری کے بعد دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ میرے اوپر اس
وقت مل اور اسپنسر اور ہکسلے کا بھوت سوار تھا۔ بوڑھی دائیوں، کھلائیوں کے کسی حق کا
تصور کہاں سے دماغ میں پیدا ہوتا۔''[۱]

بچپن اور تعلیم

مولانا ماجد کا بچپن خوش حالی وفارغ البالی میں بسر ہوا۔ گھر میں خادموں کی پوری فوج تھی۔ ہر ایک کام کے لیے نوکر تیار ملتے تھے۔ عیش وعشرت کی اس پرورش نے مولانا کے مزاج میں تحکم وانانیت کے اثرات پیدا کر دیے۔ خاندانی دستور ورواج کے مطابق بچے کی رسم بسم اللہ پانچویں سال میں کرائی جاتی تھی۔ بلکہ بالعموم اس عہد میں متوسط واعلی مسلم خانوادوں میں اس رسم کو باقاعدگی اور دھوم دھام سے ادا کرائی جاتی تھی۔ یہ دستور مسلمانوں کی اسلامی ذہنیت وثقافت سے ان کی وابستگی کی عکاسی کرتا ہے۔ جس کا اظہار مولانا ماجد نے 'آپ بیتی' میں اس طرح کیا ہے۔

''انیسویں صدی کے آخر، بلکہ بیسویں صدی کے بھی ربع اول تک دستور ہر پڑھے لکھے گھرانے میں تھا کہ بچہ ادھر پانچ سال کا ہوا کہ ادھر اسے عام پڑھائی شروع کرانے سے قبل ایک چھوٹے سے مجمع میں اسے بٹھا، اور قاعدہ بغدادی نامے ایک پرانی دھرانی کتاب اس کے ہاتھ میں دے، لفظ بسم اللہ پر اس کی ننھی سی انگلی رکھ، کسی متبرک شخص کی زبان سے، پوری بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اس سے دھروا دی جاتی تھی۔ مولوی صاحب ایک ایک ٹکڑا الگ الگ کہہ کر کہتے جاتے اور بچہ اسے دہراتا جاتا۔ اور تبرکاً ایک آدھ دعا اور بھی پڑھا دی جاتی۔ بسم اللہ کرانے والے کی خدمت میں حسب توفیق کچھ نذرانہ پیش کیا جاتا۔ حاضرین محفل کو شیرینی تقسیم کردی جاتی، اور سب لوگ والدین کو مبارک باد دیتے۔ بغیر بسم اللہ کی اس تقریب کے تعلیم شروع ہی نہ ہو سکتی۔ اس اسلامی تہذیب وثقافت کی ایک جھلک، جو اس کی بھی تاکید رکھتی ہے کہ ہر صبح

---

[۱] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۵۸

سونے سے اٹھنے والا کیا بچہ اور کیا بوڑھا، کلمہ ہی پڑھتا ہوا اٹھے۔''[۱]

عبدالماجد دریابادی کی رسم بسم اللہ خاندانی رسم ورواج کے مطابق ادا کی گئی۔ جب وہ چار سال کے ہوئے ان کے والدین نے بسم اللہ کی تقریب خاص اہتمام وتزک واحتشام کے ساتھ منائی۔ مولانا کی رسم بسم اللہ' مولوی حکیم محمد اطہرؔ کے ذریعہ ہوئی۔ اس بابرکت تقریب میں خاندان کے علاوہ دوست واحباب بھی شامل تھے۔ جب مولوی صاحب نے مولانا ماجد سے بسم اللہ کہلوانا چاہا تو وہ بالکل خاموش رہے۔ اس کے بعد گھر میں موجود تمام افراد نے اپنے طور پر ان سے بسم اللہ کہلوانے کی کوشش کی، مگر سبھی حضرات ناکام رہے۔ آخر میں ان کی بوا نے بہلا پھسلا کر ان کے منھ سے بسم اللہ کہلوائی۔ اس دلچسپ واقعہ سے یہ پہلو نکلتا ہے کہ مولانا بچپن سے سختی یا دباؤ کو پسند نہ کرتے تھے۔ یہ جزئیہ جوان کی شخصیت اور ان کے کردار میں آخر تک نمایاں رہا۔ مولانا نے اس واقعہ کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

''دستور برادری اور گھرانے میں پانچویں برس بسم اللہ خوانی کا طریقہ رائج تھا۔ اپنی عمر ابھی چوتھے ہی سال اور ۱۸۹۵ء تھا کہ بسم اللہ کرنا طے پا گئی۔ والد مرحوم لکھیم پور کھیری میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ ایک سہ پہر کو محفل آراستہ ہوئی اور وطن کے ایک خوش اوقات وخوش صفات عالم صاحب، جو بھائی صاحب کی اتالیقی پر معمور تھے۔ وہ زنانہ مکان کی صحن میں بسم اللہ کرانے بیٹھے مٹھائی کے خوان سامنے رکھے ہوئے اور عزیزوں، نوکروں چاکروں کا گروہ حلقہ جمائے ہوئے۔ مولوی صاحب بچارے نے پیار وشفقت کے لہجہ میں کہا کہ کہو بسم اللہ یہاں جواب میں قطعی خاموشی۔ اب اور لوگ بھی ان کے شریک کار ہوئے لیکن اس ضدی لڑکے کی زبان پر بہ دستور قفل لگا ہوا تھا۔ والد مرحوم کو آخر غصہ آیا۔ اور کب تک نہ آتا۔ سمجھانے بجھانے، چمکارنے کی حد ہو چکی تھی چھڑی ہاتھ میں لے انھوں نے جمانا شروع کر دی۔ لوگوں نے ہائیں ہائیں کر کے کسی طرح جان بچائی۔ چلمنوں کی آڑ سے والدہ ہمشیرہ بہ تکلیف دہ تماشہ دیکھتی رہیں اندر بلایا سمجھایا۔ آخر میں جو میری خلائی تھیں ان بچاری نے کہا واہ میرے بھیا کو کیا بسم اللہ کہنا آتا نہیں۔ میں نے کہا آتا کیوں

---

[۱] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۶۰۔۶۱

نہیں، بس میں ان کے ساتھ جا، مولوی صاحب کے کمرے کے باہر ہی سے انھیں
چلا کر سنا آیا۔ اداسی خوشی سے بدلی، چہروں پر ہنسی اور مسکراہٹ آئی۔ اسی کو کہتے
ہیں۔ ٹیڑھا لگا ہے قط قلم سر نوشت کو!''[۱]

مولانا ماجد کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی قرآن پاک ناظرہ، فارسی اور اسمٰعیل میرٹھی کی اردو ریڈر انھوں نے گھر پر ہی پڑھی مولانا لکھتے ہیں۔

''گھر پر قرآن مجید ناظرہ اور فارسی کی وہی تعلیم رہی جس کا اس وقت
شریف مسلمانون کے ہاں رواج تھا۔ اردو میں مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کی ریڈریں
اپنے رنگ میں بہترین کتابیں تھیں۔ فارسی میں گلستاں، بوستاں اور سکندر نامہ
پڑھا، اور امام غزالی کی فارسی کتاب کیمیائے سعادت بھی جو اپنے فن کی بہترین
کتاب ہے۔''[۲]

گھر پر فارسی، اردو اور اچھی خاصی انگریزی کی تعلیم کے بعد ان کا داخلہ اسکول میں کرایا گیا۔ مولانا ماجد صاحب لکھتے ہیں۔

''عمر کا نواں سال تھا اور ۱۹۰۱ء کہ رائے یہ ٹھہری کہ اب داخلہ اسکول میں
کرایا جائے قرآن مجید ختم ہو چکا تھا اور میں خاصہ چل نکلا تھا، فارسی میں شد بد آ گئی
تھی، اور انگریزی کی پرائمری نکل چکی تھی۔ طے یہ پایا کہ داخلہ انگریزی کے اَپر پرا
ئمری (اس وقت کے فورتھ کلاس یا چوتھے درجہ) میں کرایا جائے۔''[۳]

مولانا ماجد نے پرائمری سے لے کر دسویں تک کی تعلیم سیتا پور سے حاصل کی۔ مولانا کو لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ ان کے یہاں پڑھے لکھے لوگوں کی آمد و رفت ہمیشہ رہی اور ادبی و علمی صحبتوں و محفلوں نے ان کا ادبی و مذہبی شعور و ذوق کم عمری ہی سے بیدار کر دیا تھا۔ بچپن ہی سے کتب، اخبار و رسائل کے مطالعہ کے عادی ہو گئے۔ جس کی وجہ سے ان کی شخصیت پر مثبت اثرات مرتب ہوئے۔ مولانا ماجد لکھتے ہیں۔

''والد کے پاس پڑھے لکھے لوگ بھی آتے رہتے، فلاں شاعر، فلاں
ادیب، فلاں حکیم، فلاں ڈاکٹر، کوئی عالم، کوئی درویش۔ کوئی نہ کوئی آتا ہی رہتا۔

---

۱ غبار کارواں (مضمون) مولانا عبدالماجد دریابادی: فروغ اردو: (عبدالماجد دریابادی نمبر) اگست تا اکتوبر ۱۹۷۱ء لکھنو: ص: ۱۱-۱۲

۲ ایضا ص: ۱۲ : ۳ آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۹۰

ابھی ریاضؔ خیرآبادی (ریاض الاخبار) والے چلے آرہے ہیں، ابھی طپش دہلوی ثم لکھنوی (سابق ایڈیٹر اودھ اخبار) اور میں علمی، ادبی چرچوں اور مذہبی سیاسی بحثوں سے بے خبر نہ رہتا۔ بعض حکام بھی بڑے علمی وادبی مذاق کے آجاتے، اور ان سے رونق اور بڑھ جاتی۔ مثلاً سید افتخار بی۔اے کاکوروی ایک ڈپٹی کلکٹر، بڑے خوش مذاق، اور انگریزی اور اردو دونوں میں برق تھے۔ اور ایک منشی جوالا پرشاد برقؔ بھی، ڈسٹرکٹ وسیشن جج مترجم 'رومیو جولیٹ' اور ایک مدت تک سید محمود (پسر سرسید اور مشہور سابق جج ہائی کورٹ) پڑوس میں رہے۔ والد کی مرنجان مرنج طبیعت اکثر ہندوؤں کو بھی کھینچ لاتی۔ اور مسلمان رئیسوں کے علاوہ ہندو رئیسوں کے ہاں سے بھی دعوتوں، ضیافتوں اور تحفے تحائف کا سلسلہ بھی برقرار رہتا۔ چچا زاد بھائی مولوی عبدالحلیم آثر بڑے اخبار پے تھے اور کتابیں بھی خدا معلوم کہاں کہاں سے لے آتے، ان سے خوب مستفید ہوتا رہتا۔ اردو کا روزنامہ 'اودھ اخبار' اور ہفت روزہ 'ریاض الاخبار' (گورکھپور) ایک انگریزی سہ روزہ 'ایڈوکیٹ' (لکھنو) اور دو تین رسالے خود ہمارے ہاں آتے۔''[1]

خوش قسمتی سے مولانا ماجد کو علمی وادبی ماحول بچپن ہی سے مل گیا تھا اور انھیں بچپن ہی سے مطالعہ کا شوق جنون کی حد تک ہو گیا تھا۔ کتب بینی وحقائق کی جستجو ان کا پسندیدہ مشغلہ بن چکا تھا۔ ان کے والد صاحب چونکہ اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اس لیے عمائدین شہر کے روساء علماء فضلاء کی آمد ورفت ان کے گھر پر ہمیشہ ہوتی رہتی تھی۔ اس ماحول نے ان کی شخصیت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ مولانا ماجد صاحب نے اپنے بچپن کی علمی مشغولیات کا تذکرہ 'آپ بیتی' میں اس طرح کیا ہے۔

''..... پڑھنے، بلکہ پڑھ ڈالنے کا چسکا بچپن ہی سے پڑ گیا تھا۔ اسکولی زندگی میں یہ دھن اور بڑھی۔ ۴ بجے اسکول سے چلا آرہا ہوں۔ سہ پہر کا ناشتہ بلکہ کھانا انتظار کر رہا ہے، آتے ہی کھانے پر نہیں بلکہ آئے ہوئے اخبار پر گرتا ہوں، انھیں کھول کر پڑھنا شروع کر دیتا ہوں، جب کہیں کھانے کو ہاتھ لگاتا ہوں، کھاتا

---

[1] معاصرین: عبدالماجد دریابادی: ص: ۱۱۔۱۲

جاتا ہوں، اور ساتھ ساتھ آئی، ڈی، ٹی (لکھنو کا انگریزی روزنامہ) پڑھتا جاتا ہوں۔ ایک مثال ہوئی اسی پر قیاس کر کے دن رات کی پڑھائی کا کر لیجیے، اور پڑھائی بھی کیسی؟ اندھا دھند، نہ کافی روشنی کا دھیان، شام کا جھٹپٹا ہو یا صبح کا دھندلکا، آنکھوں پر زور دے دے کر بس پڑھے چلا جار ہا ہوں۔ اور نہ اس کی سدھ کہ پڑھتے وقت سیدھا بیٹھ تو جاؤں، اندھا دھند لیٹا ہوا ہوں یا چت پڑا، کہ کتاب آنکھوں کے سامنے اڑی ہوئی ہے، بتانے والا، ٹوکنے والا کون تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ آنکھوں کی بینائی اپنے ہاتھوں خراب کر ڈالی اور بالکل ہی نزدیک بیں ہو کر رہ گیا۔ گز دو گز فاصلہ کی چیزیں صاف نہ سوجھتیں۔ کلاس میں بلیک بورڈ پر جو کچھ لکھا جاتا اسے خاک نہ پڑھ پاتا۔ نویں درجہ میں پہنچا تو عینک لگانا ناگزیر ہو گئی۔"[۱]

مولانا ماجد دریابادی نے دسواں کلاس (میٹریکولیشن) سکنڈ ڈویژن سے پاس کرنے کے بعد جولائی ۱۹۰۸ء میں لکھنو کے کینگ کالج میں انٹر میڈیٹ میں داخلہ لے لیا۔ اس وقت لکھنو یونیورسٹی وجود میں نہیں آئی تھی۔ اس کا قیام ۱۹۲۰ء میں ہوا۔ کالج میں انگریز اساتذہ کی اکثریت تھی۔ اس لیے اس کے وقار و معیار کا بڑا شہرہ تھا۔ اس وقت یہ کالج الہ آباد یونیورسٹی سے ملحق تھا۔ اس کالج کے متعلق مولانا نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

"......جولائی ۱۹۰۸ء میں نام کینگ کالج لکھنو میں لکھ گیا۔ انٹر میڈیٹ کا چلا ہوا اور عام فہم نام ایف۔ اے (فرسٹ ایران آرٹ) تھا۔ لکھنو یونیورسٹی کا وجود اس وقت کہاں تھا، یہ تو کوئی ۱۲ سال بعد ۲۰ء میں قائم ہوئی۔ لکھنو کے سب کالج الہ آباد یونیورسٹی کے ماتحت تھے اور ایف اے کا امتحان تو دو سال کے کورس کے بعد، یونیورسٹی کا ہی ایک امتحان ہوتا تھا (انٹر میڈیٹ بورڈ کوئی الگ نہ تھا) کینگ کالج (جو بعد کو یونیورسٹی کالج بنا) اس وقت قیصر باغ کے جنوبی پہلو کے عین وسط میں تھا۔ شاندار عمارت وہی جس میں اب (۶۷ء میں) میوزک کالج قائم ہے۔ ہر استاد پروفیسر کہلاتا تھا۔ لکچرر، ریڈر وغیرہ کے امتیازات اس وقت نامعلوم تھے۔

۱۔ آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۱۰۵

پرنسپل کا انگریز ہونا تو خیر لازمی تھا۔ باقی اور بھی کئی استاد (تاریخ ،فلسفہ، معاشیات،ادب،انگریزی،فزکس وغیرہ کے)انگریز ہی ہوتے تھے۔''[۱]

کیننگ کالج میں داخلہ کے بعد عبدالماجد صاحب نے لکھنو میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔لکھنو میں انھیں زیادہ پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا کیونکہ ان کے بڑے بھائی عبدالمجید لکھنو میں پہلے سے ہی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔اور مولانا ماجد بھی انھیں کے ساتھ رہنے لگے۔لکھنو کے قیام کے بارے میں مولانا 'آپ بیتی' میں لکھتے ہیں۔

''سندیلہ کے ایک چھوٹے سے تعلقہ دار چودھری نصرت علی مرحوم تھے، بھائی صاحب کو انھیں نے اپنے مکان میں جگہ دے دی تھی ،قدرۃً میرے قیام کا انتظام بھی انھیں کے ساتھ ہوا، آکر دیکھا تو کمرہ نہ تھا اچھا خاصہ مستقل مکان تھا، چھوٹے بڑے تین کمرے ،برآمدہ، غسل خانہ، پاخانہ، باورچی خانہ، غرض طالب علمی کے معیار سے بہت اچھا مکان ،بغیر ایک پیسہ خرچ کیے ہوئے مل گیا۔''[۲]

مولانا ماجد کو کتابوں سے شغف تو پہلے سے ہی تھا۔بغیر سمجھے ہی کتابیں پڑھ ڈالنے کا مرض تھا۔ یہ مرض لکھنو میں آکر اور بڑھ گیا۔ یہاں ان کے ذوق کے مطابق کتابیں کافی تعداد میں موجود تھیں۔انھوں نے ان کتابوں سے پورا فائدہ اٹھایا۔موقع ملتے ہی کلاس سے لائبریری میں پہنچ جاتے تھے اور وہاں اپنے کورس کے علاوہ جو بھی کتابیں انگریزی ،اردو میں ملتی سبھی کو پڑھ ڈالتے ۔کتابوں کے ساتھ ساتھ مختلف اخبارات ورسائل سے بھی انھوں نے کسب فیض کیا۔کالج کی لائبریری کے علاوہ انھوں نے شہر میں جتنی لائبریریاں تھیں سب سے انھوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔اس کا ذکر مولانا نے 'آپ بیتی' میں اس طرح کیا ہے۔

''کتابوں کی ہوس جو شروع سے تھی ،وہ اب قیام لکھنو میں پوری ہوتی نظر آئی۔شہر میں قابل ذکر لائبریری ایک رفاہ عام لائبریری تھی ،سٹی اسٹیشن کے جنوب ومشرق میں جگت نرائن روڈ کے گھماؤ پر ،اور بلند باغ کے قریب۔اس کی شان دار عمارت اب بھی قائم ہے۔انگریزی کتابوں کا ذخیرہ اچھا خاصہ تھا،اور

۱؎ آپ بیتی :مولانا عبدالماجد دریابادی :ص:۱۱۲

۲؎ ایضا: ص:۱۱۳۔۱۱۴

انتظام بھی عمدہ تھا ہندو مسلمان شیر و شکر نظر آتے تھے، اور شام کے وقت کئی کئی
تازہ اخبار انگریزی اور اردو کے میز پر دکھائی دیتے تھے۔ ایک دوسری لائبریری
ورما لائبریری کے نام سے قائم تھی اور نظیر آباد اور بازار جھاؤ لال کے درمیان
ایک گلی کے اندر واقع تھی، شہر کے مشہور لیڈر بابو گنگا پرشاد ورما اسی عمارت میں
رہتے تھے، اور ان کے دونوں اخبار سہ روزہ 'ایڈوکیٹ' (انگریزی) اور
'ہندوستانی' (اردو) یہیں سے نکلتے تھے، یہی لائبریری اپنی ترقی یافتہ صورت
میں گنگا پرشاد میموریل لائبریری کے نام سے ایک عالی شان عمارت میں امین
الدولہ پارک کے جنوبی رخ پر قائم ہے۔ .....تیسری لائبریری ایک معمولی
سی، میوزیم (عجائب گھر) کی عمارت لال بارہ دری کے متصل تھی۔ یہی آگے چل
کر اور بہت بڑھ کر پبلک لائبریری بنی۔ ان تینوں سے جی بھر کر کام لیا..... چوتھی
اور سب سے بڑی لائبریری خود اپنے کالج کی تھی اس سے فائدہ اتنا اٹھایا کہ کالج
چھوڑنے کے کچھ عرصہ بعد، جب ایک بار سرٹیفکٹ لینے کی ضرورت اپنے پرنسپل
صاحب سے ہوئی، تو انھوں نے سرٹیفکٹ میں یہ لکھا کہ اس طالب علم سے زیادہ
میرے علم میں کسی دوسرے نے لائبریری سے کام نہیں لیا ہے۔''[1]

مولانا ماجد نے جون ۱۹۱۰ء میں انٹرمیڈیٹ سکنڈ ڈویژن سے پاس کرلیا، اور بی۔اے کا طالب علم ہو جانے سے انھیں بڑی خوشی ہوئی۔ جس کا اظہار انھوں نے 'آپ بیتی' میں کیا ہے۔

''انٹرمیڈیٹ کا امتحان اپریل ۱۰ء میں ہوا، مئی جون کی بڑی چھٹیوں میں
حسب معمول سیتا پور آیا۔ اور یہیں تھا کہ نتیجہ آگیا، کامیاب رہا، اور سکنڈ ڈویژن
ملا، منطق اور جنرل انگلش میں نمبر یقیناً اول درجہ کے آئے ہوں گے اور عربی اور
اسپشل انگلش میں دوسرے درجہ کے، اور تاریخ انگلستان کے خشک مضمون میں
مرکھپ کے نمبر تیسرے درجہ کے آگئے ہوں گے، اور یوں کسی طرح دوسرے درجہ
میں نکل آیا..... بی۔اے ہو جانے میں اب دیر ہی کتنی ہے؟ بی۔اے کی اہمیت اس

---

[1] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۱۱۶۔۱۱۷

درجہ دل میں بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کا طالب علم ہونا بھی فخر کے لیے کافی تھا۔ اور اتنا تو
واقعہ ہے کہ جو وقعت اس وقت بی۔اے کی تھی، وہ آج پی ایچ ڈی کو بھی حاصل نہیں،
خوب یاد ہے کہ کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں سہ پہر کے وقت سڑک پر ٹہلتا جاتا تھا، اور دل
ہی دل میں اپنے کو مبارک باد دیتا جاتا تھا۔''[1]

مولانا ماجد نے جولائی میں کیننگ کالج میں بی۔اے میں داخلہ لیا۔ بی۔اے میں انھوں نے ان مضامین کا انتخاب کیا۔ انگلش ٹکسٹ، جنرل انگلش، فلسفہ اور عربی مولانا اپنے بی۔اے کے مضامین کے انتخاب کے متعلق لکھتے ہیں۔

''جولائی میں لکھنو آکر بی۔اے کے پہلے سال، یا اس وقت کی بولی میں
کالج کے تھرڈ ایر میں داخل ہوگیا۔ اب مضمون یہ چار تھے، انگلش ٹکسٹ، جنرل
انگلش، فلسفہ و عربی، ان میں سے دو آخری مضمون اختیاری تھے، اور پہلے دو
لازمی۔ فلسفہ سے شوق بہت بڑھا ہوا تھا، اور اس کی تین شاخیں درس میں تھیں،
الہیات (میٹا فزکس) اور اخلاقیات (ایتھکس) اور نفسیات (سائیکالوجی) ان
تینوں میں نفسیات سے ذوق خصوصی تھا۔ اور منطق کے بعد (جو ایف اے پر ختم
ہوگئی تھی) اب یہی مضمون سب سے زیادہ رغبت و پسند کا تھا۔''[2]

جب بی۔اے فائنل کے امتحان کا زمانہ قریب آیا تو مولانا کو احساس ہوا کہ میری عربی کمزور ہے۔ چنانچہ اس کمزوری کو دور کرنے کے لیے انھوں نے یہ ترکیب نکالی کہ اپنے دوست (مولوی عبدالباری صاحب) سے عربی پڑھی اور خود ان کو انگریزی پڑھائی۔ اس واقعہ کا ذکر علامہ اقبال نے اپنے مضمون ''مولانا عبدالماجد دریابادی'' میں کیا ہے۔

''بی۔اے کے امتحان کا زمانہ آیا تو مولانا کی عربی کمزور تھی، مولانا نے
عربی کی کمزوری کو رفع کرنے کے لیے یہ ترکیب کی کہ انھوں نے مولانا عبدالباری
ندوی کو ہموار کیا، جو ندوہ میں پڑھ رہے تھے اور میٹرک کے امتحان کی فکر میں
تھے، دونوں نے ایک دوسرے سے مبادلہ اس طرح کیا کہ مولانا ماجد عربی کا سبق

---

[1] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۱۲۵

[2] ایضا: ص: ۱۲۶

ان سے لیتے اور انگریزی کا سبق مولانا عبدالباری کو دیتے، یوں ایک دوسرے کی کامیابی کی راہیں ہموار کیں، اس طرح مولانا ماجد نے ۱۹۱۲ء میں بی.اے میں سکنڈ ڈویژن کامیابی حاصل کی۔''[۱]

مولانا ماجد دریابادی بی.اے کرنے کے بعد فلسفہ سے ایم.اے کرنا چاہتے تھے۔لیکن لکھنو میں اس وقت اس مضمون سے ایم.اے کرنے کی سہولت نہ تھی اس لیے مولانا نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔وہ 'آپ بیتی' میں لکھتے ہیں۔

''.....اب فکر آگے پڑھنے کی ہوئی اور ایم اے فلسفہ میں کرنے کی۔لکھنو میں اس کا کوئی انتظام نہ تھا۔صوبہ بھر میں اس وقت ایم اے میں فلاسفی صرف دو جگہ تھی۔ بنارس کے کوئنس کالج میں اور علی گڑھ میں۔ بنارس میں پڑھانے والے نامور تھے۔اور بنارس قریب بھی تھا۔لیکن دوسری سہولتیں قیام وغیرہ کی علی گڑھ ہی میں معلوم ہوئیں۔اور آخری رائے وہیں کی قائم کی۔''[۲]

ایم.اے کے زمانے میں مولانا ماجد موسم سرما کی تعطیلات میں گھر گئے ہوئے تھے۔اسی دوران ان پر ایک ناگہانی آفت آن پڑی۔ان کے والد محترم کا دوران حج انتقال ہوگیا۔اس عظیم سانحہ کے سبب مولانا کو تعلیمی سلسلے کو جاری رکھنے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔علی گڑھ واپس آکر انھوں نے راجہ محمود آباد کی خدمت میں ایک تفصیلی مراسلہ ارسال کیا اور مالی تعاون کی درخواست کی۔جس کا تذکرہ انھوں نے 'آپ بیتی' میں تفصیل سے کیا ہے۔

'' دسمبر کے اخیر عشرے میں، بڑے دن کی چھٹیوں میں لکھنو آیا ہوا تھا کہ مکہ معظّمہ سے والد ماجد کے انتقال کی اطلاع دفعتہً ملی۔ڈاک اس وقت حجاز سے یہاں ایک مہینے میں آتی تھی، یک بیک یہ خبر ملنے سے جو کچھ گذری ہی، یہاں کہنے کی بات یہ ہے کہ میری مالی حالت اسی وقت سقیم ہوگئی۔پنشن کی آمدنی بند ہی ہوگئی۔اب فکر یہ کھڑی کہ میری پڑھائی کیوں کر جاری رہ سکے گی۔ بھائی صاحب کی اول تو تنخواہ ہی کیا، اور پھر ان کی نائب تحصیل داری بھی مستقل

---

[۱] اقبال اور علمائے پاک وہند: اعجاز الحق قدوسی: ص:۴۱۳

[۲] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص:۱۴۰۔۱۴۱

نہیں، آج قائم مقامی مل گئی، اور کل پھر خالی۔ سارا سہارا والد مرحوم کی ہی آمدنی کا تھا۔ خیر شروع جنوری میں علی گڑھ آ گیا اور یہاں سے ایک موثر اور مفصل خط راجہ صاحب محمود آباد کو لکھا۔ والد مرحوم جب حج کو جا رہے تھے تو میرا ہاتھ ان ہی کے ہاتھ میں دے گئے تھے، راجہ نے اپنی شرافت کا پورا ثبوت دیا، بھائی صاحب لکھنو میں جب ان سے ملنے گئے تو میری پڑھائی کا ماہانہ خرچ دریافت کیا، انھوں نے کہا کہ ۴۰ روپیہ ماہوار اور ۱۲ مہینے کے لیے، گویا کل ۴۸۰ بولے کہ نہیں ماہانہ بجائے ۴۰ کے ۵۰ رکھو اور مدت ۱۲ مہینے کے ۱۶، کل ۸۰۰ اور اس کے بعد یہ رقم میرے نام لکھنو کے ایک بینک میں جمع کرا دی۔‘‘[1]

مولانا ماجد کا داخلہ علی گڑھ میں ایم. اے فلسفہ میں ہو گیا تھا مگر ان کا دل علی گڑھ میں نہ لگا۔ بہر حال کسی طرح سے ایک سال گذرا اور سال اول کا امتحان مارچ ۱۹۱۳ء میں ہوا۔ علی گڑھ اس وقت الہ آباد یونیورسٹی کے ماتحت تھا، اور مولانا ماجد کو امتحان دینے الہ آباد جانا پڑا۔ مولانا ماجد الہ آباد میں مولانا شبلی کے بھائی جنید صاحب ایڈوکیٹ کے یہاں مقیم رہے۔ فلسفہ کا مضمون اور اس کا نصاب مولانا کے ذوق کے مطابق نہ تھا اور نہ کسی ماہر وشفیق استاد کی سر پرستی حاصل ہو پائی تھی۔ اس کے علاوہ بھی کئی اسباب تھے۔ جس کی وجہ سے مولانا ماجد سال اول کے امتحان میں کامیاب نہ ہو پائے۔ اس کا ذکر انھوں نے ’آپ بیتی‘ میں اس طرح کیا ہے۔

’’خیر امتحان دینے کو تو دے آیا مگر کامیابی میں خاصہ شبہ رہا۔ اور اس کے کئی کئی سبب تھے، ایک تو یہی کہ کورس میرے مذاق کا نہ تھا میں عادی برطانیہ کے تجربی Empiricist فلاسفر ہوم مل، اسپنسر وغیرہ کا۔ اور کورس میں کتابیں جرمنی کے معنوی Idealist فلاسفہ کانٹ، ہیگل، وغیرہ کی۔ دوسرے یہ کہ استاد صاحب مجھ نافہم کے معیار سے کچھ یوں ہی سے نکلے۔ تیسرے ایک پرچہ کی کتاب SigwartosLogic سرے سے بازار میں دستیاب ہی نہیں ہوئی تھی، چوتھے یہ کہ میں نے اس اندھیر کی شکایت میں ایک مراسلہ ’لیڈر‘ (الہ آباد) میں چھپوا دیا تھا، یہ بھی وقت کے ماحول کے لحاظ سے ایک جرم تھا۔ بہر حال اسباب جو بھی

---

[1] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۱۴۵۔۱۴۶

ہوں، یا محض میری نالائقی ہی سمجھی جائے، نتیجہ جب آیا تو میں فیل تھا۔''[۱]

مولانا ماجد ایم. اے کی تعلیم مکمل کرنے کی غرض سے دہلی گئے اور سینٹ اسٹیفن کالج میں پادری اینڈریوز صاحب سے ملاقات کے بعد داخلہ بھی ہوگیا، مگر اسی سال ایک بڑا حادثہ یہ وقوع پذیر ہوا کہ مولانا کے والد صاحب نے جس بینک میں روپیہ جمع کر رکھا تھا اس بینک کا دیوالیہ نکل گیا۔ جس کی وجہ سے مولانا کی پریشانیوں میں مزید اضافہ ہوگیا، اور اسی لیے وہ اپنے ذوق کے مطابق مروجہ اعلیٰ تعلیم کے حصول سے محروم رہ گئے۔ مولانا لکھتے ہیں۔

''علی گڑھ اب دوبارہ جانے کو جی بالکل نہ چاہا۔ آخر میں رائے دلی کی قرار پائی۔ مسیحیوں کا سینٹ اسٹیفن کالج خاصی تعلیمی شہرت رکھتا تھا۔ پرنسپل اور استاد فلسفہ دونوں نیک نام تھے اور بڑی بات یہ کہ مشہور انگریز پادری اینڈریوز ای ایس ریٹائر ہوکر یہیں رہ رہے تھے۔ اگست ۱۳ء میں پہنچا اور یہ پہلی بار تھا کہ طالب علم نے سفر بغیر خدمت گار کو جلو میں لیے کیا اور ہوسٹل میں قیام کیا۔ کمرہ اپنی مرضی کے مطابق ملا۔ اینڈریوز صاحب کی خدمت میں حاضری دے کر جی خوش ہوا، اور اپنے استاد مسٹر شارپ سے بھی اچھا اثر قبول کیا۔ پڑھائی شروع ہوئی، اور کلاس میں حاضری دینے لگا، لیکن ابھی چند ہی روز ہوئے تھے کہ پیوپلز بینک PeoplesBank کے دیوالہ نکل جانے کی خبر آ گئی ہائیں اب کیا ہوگا، والد مرحوم تھوڑی بہت جمع پونجی چھوڑ گئے تھے سب اسی بینک میں تھی، سو وہ یوں ٹھکانے لگ گئی۔ طبیعت ڈانو ڈول ہوئی کہ اب تو دہلی میں قیام کرنے اور پڑھائی جاری رکھنے کا دروازہ ہی بند ہوگیا۔''[۲]

مولانا نے اپنے اساتذہ کرام جن سے انھوں نے کسب فیض کیا تھا۔ بچپن سے لے کر گریجویشن تک کے اساتذہ کا ذکر خیر مولانا نے بڑی عقیدت واحترام سے کیا ہے۔ اپنے اساتذہ سے متعلق مولانا کے تاثرات وخیالات کی آگاہی کے لیے 'آپ بیتی' سے یہ اقتباس نقل کیے جا رہے ہیں۔

''آج جب اس عہد کا جائزہ حافظہ کی عینک سے لے رہا ہوں، تو استادوں

---

[۱] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۱۴۹۔۱۵۰

[۲] ایضاً: ص: ۱۵۱

کے ہجوم میں گنتی کی چند صورتیں بڑی ممتاز و منور نظر آ رہی ہیں، مسلمانوں ہی کی نہیں، بعض غیر مسلموں کی بھی۔ان کے عقائد و اعمال ان کے ساتھ، بہر حال میرے سابقہ میں تو وہ شریف ہی ثابت ہوئے۔ان کے نام ان اوراق میں چھوڑ جانا اپنے لیے مایۂ سعادت سمجھتا ہوں۔

(۱) مولوی حلیم محمد علی اطہر، جنھوں نے بسم اللہ کرائی۔

(۲،۳) اسکول کے استاد عربی، مولوی سید محمد ذکی لکھنوی، اور ان سے بھی بڑھ کر مولوی عظمت اللہ فرنگی محلی۔

(۴،۵) ماسٹر دولت رام بی۔اے، اور ہیڈ ماسٹر بابو گھمنڈی لال بی۔اے۔

(۶،۷،۸) کیننگ کالج کے استادان انگریزی پروفیسر اف ٹی رائے، سی جے براؤن اور دونوں سے کہیں بڑھ کر استاد انگریزی و فلسفہ اور بعد کو پرنسپل ایم، بی، کیمرن۔

اللہ ان سب محسنوں کو ان کے لائق جزائے خیر دے۔خیال دوڑاتا ہوں تو پاتا ہوں کہ نہ کسی استاد کا حق شاگردی ادا ہوا، اور نہ کسی رفیق درس کا حق رفاقت۔''[۱]

مولانا ماجد صاحب اپنے تعلیمی دور میں کالج سے باہر ان مشہور و مقبول شخصیات جن سے وہ مستفید ہوئے ان کا ذکر 'آپ بیتی' میں کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں۔

''کالج سے باہر بھی بہت سے بزرگوں، کرم فرماؤں سے تعلقات کی بنیاد اسی کالجی دور میں پڑی، اور ان میں سے بعض کی شفقت و دستگیری عمر بھر کام آئی۔ سب کے نام درج کرنے کہاں ممکن ہیں۔ہاں کوئی ۲۰ نام جو اہم ترین ہیں، اور اس وقت یاد بھی پڑ گئے درج ذیل ہیں۔

(۱) مولانا شبلی، کہنا چاہیے کہ میری تحریری، تصنیفی زندگی کی جان مولانا شبلی ہی تھے، عقیدت مند اسکول ہی کے زمانے سے ان کی کتابیں اور مضامین پڑھ کر ہو

۱؎ آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۱۵۴۔۱۵۵

چکا تھا۔ کالج کے زمانے میں ان کے ہاں حاضری کثرت سے دیتا رہا۔ اور اخیر میں تو ان کے ہاں کے حاضر باشوں میں ہو گیا تھا۔ جو علمی و ادبی فیض ان کی صحبت سے حاصل رہا، اس کا اب اندازہ کرنا ہی مشکل ہے۔ نومبر ۱۴ء میں وفات پائی، اور اس سے کوئی ایک سال قبل لکھنؤ چھوڑ دیا تھا۔

(۲) مولانا ابو الکلام آزاد۔ تعارف ان سے مولانا شبلی ہی کے ساتھ ہوا اور جب تک مولانا شبلی لکھنؤ میں رہے، یہ انھیں کے ہاں آ کر مقیم ہوتے رہے، باوجود بعض تحریری بے لطفیوں کے ان سے نیاز بڑھتا ہی رہا۔

(۳) مولوی عبد الحلیم شرؔ مشہور ناول نگار، ادیب و مورخ، بہت دن کٹرہ بزن بیگ خان میں رہے تھے، وہاں تک رسائی تو بہت کم ہی ہو پاتی تھی، البتہ اور مختلف تقریبوں میں ملاقات اکثر ہو جاتی۔

(۴) مرزا محمد ہادیؔ مرزاؔ اور رسواؔ، عالم و شاعر و ناول نگار۔

(۵) پنڈت بشن نرائن درؔ صدر کانگریس ۱۹۱۱ء انگریزی کے ادیب و مفکر، اردو کے شاعر و ناقد۔

(۶) بابو گنگا پرشاد ورما، اپنے زمانے کے بااثر و نامور کانگریسی لیڈر۔

(۷) پنڈت برج نرائن چکبست، شاعر و ناقد۔

(۸) حامد علی خاں، بیرسٹر، ادیب و شاعر۔

(۹) مولانا سید سلیمان ندوی، رفتہ رفتہ عزیزوں کے حکم میں داخل ہو گئے۔ علمی اعتبار سے میرے مکرم و محترم۔

(۱۰) راجہ اور بعد کو مہاراجہ سر علی محمد خاں، والئی محمود آباد، میرے مالی محسن، والد مرحوم کے مخلص و معتقد۔

(۱۱) مہدی حسن (صاحبِ ''افادات مہدی'') ادیب و انشا پرداز، میرے خصوصی مخلص۔

(۱۲) حاجی ظفر الملک، ایڈیٹر الناظر۔

(۱۳) مولانا شاہ عبدالباری فرنگی محلی، ممتاز علماء میں تھے۔

(۱۴) حضرت اکبرالہ آبادی، نامور شاعر ومفکر۔

(۱۵) مولوی عبدالسلام ندوی صاحبِ شعرالہند۔

(۱۶) مولوی مسعود علی ندوی۔ منیجر دارالمصنفین اعظم گڑھ۔

(۱۷) جوان مرگ شیخ ولایت علی قدوائی بمبوق۔

(۱۸) چودھری محمد علی ردولی۔ ظریف وادیب، صاحب طرز انشا پرداز۔

(۱۹) مولوی عزیز مرزا، پنشنر ہوم سکریٹری دولت آصفیہ، سکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ۔

(۲۰) مولوی سید محفوظ علی بدایونی۔ ادیب وظریف۔''[۱]

دورالحاد

مولانا ماجد ایک ایسے خانوادہ کے چشم و چراغ تھے۔ جس میں مذہبی احکام وارکان فرائض اور واجبات ہر شخص پر عائد تھیں۔ مذہبی ذکر و مزاج تمام افراد کے ذہن ودماغ میں رچا بسا تھا۔ خود ان کی تربیت پختہ دینی ماحول اور مذہبی معاشرے میں ہوئی مولانا کی بڑی بہن اور ماں تہجد گذار تھیں۔ آپ کے دادا اپنے زمانے کے بہت بڑے مفتی اور مشہور فقیہ تھے، اور آپ کے نانا بھی علمی ودینی اعتبار سے بہت ممتاز شخص تھے۔ والدین بھی پابند شرع اور دین دار تھے۔ اس ماحول میں ان کی ذہنی تربیت ہوئی، اس لیے بارہ تیرہ سال کی عمر سے وہ مذہبی عنوانات مناظرہ پر مضامین لکھنے لگے تھے، اور دینی علوم کی اچھی خاصی معلومات مولانا کو ہوگئی تھی۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ''ساتویں آٹھویں درجہ میں جب پہنچا، ۱۲، ۱۳ سال کی عمر میں تو گویا پورا ملا تھا، بلکہ کتابیں پڑھ پڑھ کر اور ان کے مضمون چرا چرا کر، خود بھی اچھے خاصے مضمون، آریوں، مسیحیوں، اور نیچریوں کے جواب میں لکھنے لگا تھا۔''[۲]

میٹرک کے بعد مولانا ماجد لکھنو آگئے اور ۱۹۰۸ء میں کیننگ کالج میں داخلہ لے لیا۔ مولانا کو بچپن

---

[۱] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۱۳۶۔ ۱۳۷۔ ۱۳۸

[۲] ایضا: ص: ۲۳۳

ہی سے پڑھنے لکھنے کا شوق تھا، اور یہ شوق لکھنوآ کر اور شدت اختیار کر گیا۔ انھیں یہاں آزادی کے ساتھ پڑھنے کا موقع ملا، اور یہاں ہر قسم کی کتابیں بھی دستیاب تھیں۔ مطالعہ کتب کا شوق دودھاری تلوار کی طرح ہوتا ہے اگر اس کا استعمال مہارت وچابکدستی سے نہ کیا جائے تو خود صاحب تلوار ہی زخمی ہو جاتا ہے۔ اسی طریقہ سے کتابوں کا بھی معاملہ ہے۔ اگر ان کا مطالعہ قبل از وقت اور کم عمر ہی میں بغیر کسی سرپرست یا رہنما کے کیا جائے تو مطالعہ کرنے والے کے بہک جانے کا احتمال رہتا ہے۔ اور ایسا ہی کچھ مولانا ماجد کے ساتھ پیش آیا۔ مولانا نے 'آپ بیتی' میں اس واقعہ کا بیان تفصیل سے کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''.....جولائی ۱۹۰۸ء میں کیننگ کالج میں داخل ہو گیا، لکھنوآنا کچھ اور پہلے ہو گیا تھا اور یہاں ایک عزیز کے پاس ایک انگریزی کتاب محض اتفاق سے دیکھنے میں آگئی، اچھی خاصی ضخیم، ہر چیز کے پڑھنے اور پڑھ ڈالنے کا مرض تو شروع ہی سے تھا، کتاب کا کیڑا بنا ہوا تھا، بے تکان اس کتاب کو بھی پڑھنا شروع کر دیا، لیکن اب کیا بتایا جائے، جوں جوں آگے بڑھتا گیا، گویا ایک نیا عالم عقلیات کا کھلتا گیا! اور عقائد واخلاق کی پوری پرانی دنیا جیسے زیروزبر ہوتی چلی گئی! کتاب مذہب پر نہ تھی، نہ بہ ظاہر اس کا کوئی تعلق ابطال اسلام یا ابطال مذاہب سے تھا۔ اصول معاشرت وآداب پر تھی، نام تھا Elements Of Social Science اور مصنف کا نام اس ایڈیشن میں غائب تھا، بجائے نام صرف اس کی طبی ڈگری ام، ڈی درج تھی، بعد کے ایڈیشنوں پر نام ڈاکٹر ڈریسڈیل Dyresdale نکلا اور بعد کو یہ بھی کھلا کہ وہ اپنے وقت کا ایک کٹر ملحد تھا، کتاب کیا تھی، ایک بارود بچھی ہوئی سرنگ تھی۔ حملہ کا اصل ہدف وہ اخلاقی بندشیں تھیں، جنھیں مذہب کی دنیا اب تک بہ طور علوم متعارفہ کے پکڑے ہوئے ہے اور ان پر اپنے احکام کی بنیاد رکھے ہوئے ہے۔ مثلاً عفت وعصمت، کتاب کا اصل حملہ انھیں بنیادی، اخلاقی قدروں پر تھا، اس کا کہنا تھا کہ یہ جنسی خواہش تو جسم کا ایک طبعی مطالبہ ہے، اسے مٹاتے رہنا، اور اس کے لیے باضابطہ عقد

کا منتظر رہنا، نہ صرف ایک فعل عبث ہے، بلکہ صحت کے لیے اور جنسی قوتوں کی قدرتی بالیدگی کے لیے سخت مضر ہے، اس لیے ایسی قیدوں پابندیوں کو توڑ ڈالو، اور مذہب واخلاق کے گڑھے ہوئے ضابطہ زندگی کو اپنے پیروں سے روند ڈالو، صرف یہ ایک مضمون بیان ہوا، اسی طرح کتاب کی زد آکر ہر ایسی قدر پر پڑتی تھی جو مذہب اور اخلاق کو ہمیشہ عزیز رہے ہیں۔ مالتھس کا مسئلہ ضبط تولید ومنع حمل سب سے پہلے اسی کتاب میں پڑھنے میں آیا، انداز بیان بلا کا زوردار اور خطیبانہ تھا سولہویں سال کا ایک طفل ناداں اس سیلاب عظیم میں اپنے ایمان واخلاق کی ننھی منی سی کشتی کو کیسے صحیح وسالم رکھ پاتا! خصوصا جب کہ کتاب کی دعوت ودعایت عین نفس کے مطابق ہو۔''[۱]

مولانا ماجد کو ایک کے بعد دیگرے الحاد پرست مصنفین کی کتابیں دستیاب ہوتی گئیں، اور ان کے ذہن ودماغ سے عظمت اسلام کے نقوش مٹنے لگے، اور کفر والحاد کی فکر مستحکم ہونے لگی۔ اپنے دور الحاد کا ذکر 'آپ بیتی' میں مولانا نے بڑے ندامت واحساس پشیمانی کے انداز میں کیا ہے، اور اس بیان کو اپنے قاری کے لیے عبرت آمیز بنانے کی کوشش کی ہے۔

''شک وارتیاب کی یہ تخم ریزی ہو چکی تھی، کہ عین اسی زمانہ میں لکھنو کی لائبریری میں ایک ضخیم کتاب کئی جلدوں میں InternationalLibrary OfFamousLiterature کے نام سے دکھائی دی، یہ کتاب بھی مذہبیات کی نہیں ادب ومحاضرہ کی ہے، ساری دنیا کے ادبیات کے بہترین انتخاب کو اس میں جمع کر دیا گیا ہے، اس کی ایک جلد میں ذکر قرآن اور اسلام کا ہے، ذکر خیر نہ سہی لیکن بہر حال کوئی ہجو ومنقبت خصوصی بھی نہیں، لیکن اسی جلد میں ایک پورے صفحہ کا فوٹو بھی ''بانی اسلام'' کا درج، قد آدم، اور نیچے مستند حوالہ درج کہ فلاں قلمی تصویر کا یہ عکس ہے گویا ہر طرح صحیح ومعتبر، اور ظالم نے شبیہ مبارک ایک عرب کے جسم پر عبا، سر پر عمامہ، اور چہرہ مہرہ پر بجائے کسی قسم کی نرمی

---

[۱] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۲۳۴۔۲۳۵

کے، تیوروں پر خشونت کے بل پڑے ہوئے، ہاتھ میں کمان، شانہ پر ترکش، کمر میں تلوار، نعوذ باللہ گویا تمام تر ایک ہیبت ناک وجلاد قسم کے بدوی سردار قبیلہ کی! ..... لیجیے، برسوں کی محنت اور تیاری کا قلعہ بات کی بات میں ڈھ گیا، اور بغیر کسی آریہ سماجی، مسیحی یا کسی اور دشمن اسلام سے بحث ومناظرہ میں مغلوب ہوئے، ذات رسالتؐ سے اعتقاد، بہ حیثیت رسول کیا معنی بہ حیثیت ایک بزرگ یا اعلی انسان کے بھی، دیکھتے دیکھتے دل سے مٹ گیا! اسلام وایمان کی دولت عظیم بات کہتے، ارتداد کے خس وخاشاک میں تبدیل ہوگئی۔ ہر مسلمان کے لیے کتاب کا یہ حصہ بڑے غور وفکر، عبرت وبصیرت سے پڑھنے کے قابل ہے، دین کے آغوش میں پلا ہوا، بڑھا ہوا، لڑکا بلکہ نوجوان، شیطان کے پہلے ہی دوسرے حملے میں یوں چت ہوگیا۔ گمراہی کے کتنے دروازے ہیں، اور شیطان کی آمد کے لیے کتنے راستے کھلے ہوئے ہیں!''[۱]

دور الحاد میں مولانا ماجد ملحد اور نیم ملحد مفکرین ومصنفین کی کتابوں کو تلاش تلاش کر پڑھتے تھے، مل، ہوم، اسپنسر جیسے مشہور فلسفیوں کی کتابیں انھوں نے بڑے شوق سے پڑھیں۔ ان کتابوں نے مولانا کے الحادی فکر کو جلا بخشی مگر جن کتابوں نے مولانا کو کفر والحاد کے سمندر میں غرق کیا۔ وہ مذہبی نوعیت کی نہ تھیں۔ بلکہ ان کا تعلق مختلف علوم وفنون سے تھا۔ عقلیت فکر الحاد وارتداد کا مولانا کے ذہن پر اتنا شدید غلبہ ہوا کہ خود کو مسلم کے بجائے ریشنلسٹ ظاہر کرنے میں فخر محسوس کرنے لگے تھے۔ 'آپ بیتی' سے چند اقتباسات نقل کیے جارہے ہیں۔

''ملحد ونیم ملحد فلسفیوں کی انگریزی میں کمی نہیں، ڈھونڈ ڈھونڈ کر، اور چھانٹ چھانٹ کر ان لوگوں کو خوب پڑھا مل کا تو نمبر اول تھا، اور دل ودماغ اس وقت تشکیکی اور ارتیابی نظریات سے متاثر بہت ہی تھا۔ ہیوم اور اسپنسر کو بھی چاٹ ڈالا، کچھ ایسے بھی تھے جو اصلا تو سائنسٹ تھے، مگر شمار ملحد فلسفیوں کے باہر، ٹھیٹھ ملحدوں کو بھی خوب نوازا۔ مثلا برطانیہ کا چارلس بریڈلا، جرمن کا بوشنر، امریکہ کا انگر

---

[۱] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۲۳۶۔۲۳۷

سول۔ظاہر ہے کہ ان سب کے مطالعہ سے اپنی تشکیک کو غذا پہنچتی رہی، لیکن اسلام اور ایمان سے برگشتہ کرنے اور صاف وصریح ارتداد کی طرف لانے میں ملحدوں اور نیم ملحدوں کی تحریریں ہرگز اس درجہ موثر نہیں ہوئیں، جتنی وہ فنی کتابیں ثابت ہوئیں جو نفسیات کے موضوع پر اہل فن کے قلم سے نکلی ہوئی تھیں بظاہر مذہب سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتی تھیں، نہ نفیاً نہ اثباتاً اصلی زہر انھیں بہ ظاہر بے ضرر کتابوں کے اندر کھلا ہوا ملا۔مثلاً ایک شخص گذرا ڈاکٹر ماڈسلی(Maudesley)اس کی دو موٹی موٹی کتابیں اس زمانہ میں خوب شہرت پائے ہوئے تھیں۔

ایکMentalPhysiology (عضویات دماغی)

دوسریMentalPathalogy (مرضیات دماغی)

اس دوسری کتاب میں اختلال دماغی اور امراض نفسیاتی کو بیان کرتے کرتے یک بیک وہ بد بخت مثال میں وحی محمدی کو لے آیا۔اور اسم مبارک کی صراحت کے ساتھ ظالم لکھ گیا کہ مصروع شخص کے لیے یہ بالکل ممکن ہے کہ وہ اپنا کوئی بڑا کارنامہ دنیا کے لیے چھوڑ جائے۔ایمان کی بنیادیں کھوکھلی تو پہلے ہی ہو چکی تھیں اب ان کم بخت ''ماہرین فن'' کی زبان سے اس قسم کی تحقیقات عالیہ سن کر رہا سہا ایمان بھی رخصت ہوگیا ،اور الحاد وارتداد کی منزل تکمیل کو پہنچ گئی!.....رفتہ رفتہ اب اسلام کے نام سے بھی شرم آنے لگی۔اور انٹرمیڈیٹ کے سالانہ امتحان کا جب وقت آیا تو امتحانی فارم کے خانے مذہب میں بجائے مسلم کے درج صرف ''ریشنلسٹ'' کیا''[۱]

مولانا ماجد کے ذہن ودماغ پر عقل پرستی وریشنلزم کا اتنا غلبہ ہوگیا تھا، کہ وہ مذہبی عقائد پر مبنی کتابوں کی تنقید کرنے لگے تھے۔چنانچہ انھوں نے مولانا شبلی کی معرکتہ الآرا تصنیف 'الکلام' کی تنقید کر ڈالی، جو رسالہ 'الناظر' میں قسط وار شائع ہوئی۔مولانا کی اسی الحادی فکر کی مرہون منت دو کتابیں بھی ہیں 'فلسفہ جذبات' اور 'فلسفہ اجتماع'۔خود مولانا ماجد اپنے دور الحاد وضلالت پر اظہار ندامت کرتے ہوئے اس

---

[۱] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص:۲۳۹-۲۴۰-۲۴۱

پر اظہار افسوس کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

''.....رفتہ رفتہ ذات رسالتؐ سے ایک طرح کا بغض وعناد پیدا ہوگیا۔ لکھنو سے ایک ماہ نامہ الناظر نامی نکلنا شروع ہوا تھا، اس میں ایک لمبا چوڑا مضمون کئی قسطوں میں فرضی نام سے، مولانا شبلی کی کتاب الکلام کے رد میں یا تنقید میں لکھ ڈالا۔ مضمون تھا حقیقت میں مذہب اور مذہب اسلام کے ابطال میں۔ لیکن اس پر پردہ پڑا ہوا تھا مولانا شبلی کی کتاب کی تنقید کا، اس لیے ایڈیٹر صاحب نے جو مولانا سے خفا تھے اسے بلا تامل شائع کر دیا۔

سن شعور پر پہنچ کر پہلی بار باضابطہ کتاب 'فلسفہ جذبات' قلم سے ۱۹۱۳ء میں نکلی۔ سن کا اس وقت ۲۱واں سال تھا۔ کتاب انجمن ترقی اردو نے لکھوائی اور اسی نے چھاپی، صحیح نام 'نفسیات جذبات' ہونا چاہیے تھا مگر نفسیات کی اصطلاح اس وقت نامانوس تھی۔ اب اس کوتاہیوں پر ہنسی تو کم آتی ہے، غصہ زیادہ آتا ہے۔ دوسری کتاب، ہر اعتبار سے لغو، 'فلسفہ اجتماع' لکھ ڈالی جس کا ایک ایک صفحہ الحاد سے داغدار، اس کی اشاعت وفروخت مدت دراز ہوئے بند کرا چکا ہوں۔''[۱]

مولانا ماجد نے بہ ظاہر تو الحاد کا لبادہ اپنے جسم پر ڈال رکھا تھا۔ مگر دل اب بھی اسلام کی عظمت وتقدس کا قائل تھا۔ دلوں کی دھڑکنوں سے صدائے لا الہ الا اللہ آ رہی تھی۔ اسی وجہ سے جب بھی کوئی اسلام دشمن اسلام کی مخالفت میں لب کشائی کرتا تھا۔ تو مولانا اس کا دندان شکن جواب دینے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ اس کا اندازہ ان کی تحریروں سے لگایا جا سکتا ہے۔

''اکتوبر ۱۹۱۱ء کا ذکر ہے، ایک بڑی مسیحی کانفرنس میں شرکت کے لیے مشہور معاند اسلام پادری زویمر (Zuemer) بھی بحرین سے آئے، ان کی شہرت عداوت اسلام کی، ان سے قبل یہاں پہنچ چکی تھی۔ میں بی اے کا طالب علم تھا، اور عقیدۃً تمام تر منکر اسلام۔ اپنے ایک دوست مولوی عبدالباری ندوی کے ساتھ لے جھٹ ان سے ملنے پہنچا۔ پادری صاحب یوں اخلاق سے پیش آئے

---

۱ عبدالماجد دریابادی (مضمون) مولانا عبدالماجد دریابادی: نقوش: (آپ بیتی نمبر) جون ۱۹۵۶ء: ص: ۱۰۷۴-۱۰۷۲

لیکن حسب عادت چوٹیں اسلام پر کرنا شروع کر دیں۔اب یقین کیجیے، کہ جوابات
جس طرح ندوی صاحب نے عربی میں دینا شروع کیے، اسی طرح میں نے
انگریزی میں۔اور پادری صاحب پر یہ کسی طرح کھلنے نہ پایا کہ میں تو خود ہی اسلام
سے برگشتہ ومرتد ہوں۔"[۱]

مولانا ماجد کی پرورش وتربیت مذہبی ماحول میں ہونے کے باوجود وہ تقریباً نو دس سالوں تک عقل پرستوں اور تشکیک پسندوں کے فریب کا شکار رہے، اور ارتداد والحاد وتشکیک سے دو چار رہے۔لیکن کاغذ کی کشتی ساحل تک کہاں پہنچتی ہے، اور نہ کاغذ کے پھولوں میں فطری خوشبو پیدا ہو سکتی ہے۔ چنانچہ مولانا نے جس جوش وجذبے کے ماتحت شاہ راہ اسلام کو خیر باد کہا تھا۔اس سے بھی زیادہ مستحکم جذبے وشوق اور حوصلے کے ساتھ صراط مستقیم پر واپس آ گئے۔چند اقتباسات 'آپ بیتی' سے نقل کیے جا رہے ہیں، تاکہ مولانا کی اسلام کی طرف مراجعت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکے۔

"اگست ۱۹۱۸ء کہ میں حیدر آباد سے لکھنو واپس آ گیا۔اور اپنے اسی شوق
وتفحص کے طفیل مطالعہ مذہبی یا نیم مذہبی قسم کے فلسفیوں کا شروع کیا۔یورپ کے
شوپنہائیر وغیرہ سے جلدی جلدی گذرتا ہوا، پہلا نمبر چین کے حکیم کنفوشِ
(Confucious) کا آیا۔اس حکیم کی تعلیم اور جیسی بھی ہو، شوپنہائیر ہی کی طرح
بہر حال خالص مادہ پرستانہ نہ تھی۔اخلاقی عنصر اس حد تک غالب تھا کہ اس کے
ڈانڈے روحانیت سے جا ملے تھے۔اور عالم غیب سے کچھ نہ کچھ لگاؤ اسے حاصل
تھا۔کہنا چاہیے کہ یہ پہلا مطالعہ تھا جو خالص مادی وعنصری نقطہ نظر سے ہٹ کر کسی
حکیم وفلسفی کا کیا۔ذوق تجسس نے قدم اور آگے بڑھایا۔اور اس منزل میں بڑی مدد
ایک پرانے کالجی ساتھی ڈاکٹر محمد حفیظ سید سے ملی۔اور بدھ مت اور جین مذہب اور
تھیاسوفی کی طرف رہنمائی ہوتی چلی گئی۔حکیم مطلق کی طرف سے ہدایت وتربیت
کے مناسب حال سامان، ہر منزل بلکہ ہر قدم پر ہوتے رہتے ہیں۔
.....ڈیڑھ دو سال (۱۹ء ۲۰ء) کے اس مسلسل مطالعہ کا حاصل یہ نکلا

۱۔ آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۲۴۲۔۲۴۳

کہ فرنگی اور مادی فلسفہ کا جو بت دل میں بیٹھا ہوا تھا، وہ شکست ہو گیا، اور ذہن کو یہ صاف نظر آنے لگا کہ اسرار کائنات سے متعلق آخری توجیہ اور قطعی تعبیر ان فرنگی مادئین کی نہیں بلکہ دنیا میں ایک سے ایک اعلی و دل نشیں توجیہیں اور تعبیریں اور بھی موجود ہیں۔ اور روحانیت کی دنیا سرتا سر وہم وجہل اور قابل مضحکہ وتحقیر نہیں، بلکہ حقیقی اور ٹھوس دنیا ہے، عزت وتوقیر کی مستحق عمق اور تحقیق وتدقیق کے اعتبار سے گوتم بدھ اور سری کرشن کی تعلیمات ہرگز کسی مل، کسی اسپنسر سے کم نہیں، بلکہ کہیں بڑھی ہوئی ہیں۔ اور حکمائے فرنگ ان کے مقابلہ میں بہت پست و سطحی نظر آنے لگے!.... دل اب عقیدہ پر آ گیا کہ مادیت کے علاوہ، اور اس سے کہیں ماوراو مافوق ایک دوسرا عالم روحانیت کا بھی ہے۔'' [۱]

مختلف مذاہب کی کتابیں پڑھنے کے بعد مولانا ماجد کو شبلی نعمانی کی کتاب 'سیرۃ النبی' کے مطالعہ کا موقع ملا۔ اس کو پڑھنے کے بعد مولانا ماجد کے ذہن ودل میں سرور کائنات کی عظمت وتقدس کے نقوش پوری طرح سے سرایت کر چکے تھے۔ وہ تصویر جو حضور پاکؐ کی عقل پرستوں کی کتابوں کے مطالعہ کے بعد ان کے ذہن میں بنی ہوئی تھی وہ ختم ہو گئی۔ اس کا ذکر انھوں نے 'آپ بیتی' میں کیا ہے۔

''..... مولانا شبلی کی 'سیرۃ النبی' کی جلد اول پریس سے باہر آ گئی، کتاب شبلی کے قلم سے تھی۔ موضوع کچھ بھی سہی، کیسے نہ اس کو شوق کے ہاتھوں سے کھولتا اور اشتیاق کی آنکھوں سے پڑھتا، کھولی اور جب تک اول سے آخر تک پڑھ نہ لی دم نہ لیا، دل کا اصلی چور تو یہیں تھا۔ اور نفس شوم کو سب سے بڑی ٹھوکر جو لگی تھی وہ اسی سیرۃ اقدس ہی کے متعلق تو تھی۔ مستشرقین و محققین فرنگ کے حملوں کا اصل ہدف تو ذات رسالت ہی تھی، خصوصاً بہ سلسلۂ غزوات ومحاربات، ظالموں نے بھی تو طرح طرح سے دل میں بٹھا دیا تھا کہ ذات مبارک نعوذ باللہ بالکل ایک ظالم فاتح کی تھی۔ شبلی نے (اللہ ان کی تربت ٹھنڈی رکھے) اصل دوا اسی درد کی کی، مرہم اسی زخم پر رکھا۔ اور کتاب جب بند کی تو چشم تصور کے سامنے رسول

---

[۱] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۲۴۵۔ ۲۴۶۔ ۲۴۷

عربیؒ کی تصویر ایک بڑے مصلح ملک وقوم اور ایک رحم دل وفیاض حاکم کی تھی ،جس کو اگر جدال وقتال سے کام لینا پڑا تھا تو پھر بالکل آخر درجہ میں ۔''[۱]

مولانا ماجد کو بحر ضلالت والحاد سے باہر نکالنے میں جن شخصیات نے سرگرم حصہ لیا ان کا تذکرہ مولانا نے بڑے احترام وجذبہ شوق سے اس طرح کیا ہے۔

''(۱) ایک الہ آباد کے نامور ظریف شاعر حضرت اکبرؒ، بحث ومناظرہ کی انھوں نے کبھی چھاؤں بھی نہیں پڑنے دی ،اور نہ کبھی پند وموعظت ہی کی طرح ڈالی۔بس موقع بہ موقع اپنے میٹھے انداز میں کوئی بات چپکے سے ایسی کہہ گذرتے ، جو دل میں اتر جاتی اور ذہن کو جیسے ٹھوکے دے دیتے کہ قبول حق کی گنجائش کچھ تو بہر حال پیدا ہو کر رہتی ۔ایک روز بولے کہ'' کیوں صاحب ،آپ نے تو کالج میں عربی لی تھی ،پھر اب بھی اس سے کچھ مناسبت قائم ہے؟علم وزبان کوئی بھی ہو، بہر حال اس کی قدر کرنی ہی چاہیے'' میں نے کہا'' اب اس کے لکھنے پڑھنے کا وقت کہاں ملتا ہے'' بولے کہ ''نہیں کچھ ایسا مشکل تو نہیں ،قرآن کی بے مثل ادبیت کے تو اہل یورپ بھی قائل ہیں ،اور سنا ہے کہ جرمن یونیورسٹیوں میں قرآن کے آخری پندرہ پارے عربی ادب کے کورس میں داخل ہیں ،آپ عقائد نہیں ،زبان ہی کے اعتبار سے قرآن سے ربط قائم رکھیے اور جتنے منٹ بھی روزانہ نکال سکتے ہوں اسے پڑھ لیا کریں ، جتنے حصے آپ کی سمجھ میں نہ آئیں ،انھیں چھوڑتے جایئے ،اور یہ سمجھ لیجیے کہ وہ آپ کے لیے نہیں آخر کہیں تو کچھ فقرے آپ کو پسند آ ہی جائیں گے ،بس انھیں فقروں کو دو چار بار پڑھ لیا کیجیے ،اور آپ کے لیے کوئی قید باوضو ہونے کی نہیں ۔'' یہ ایک نمونہ تھا ان کی تبلیغ کا۔

(۲) دوسری ہستی وقت کے نامور رہنمائے ملک وملت مولانا محمد علیؒ کی تھی ، بڑی زوردار شخصیت ان کی تھی ،اور میرے تو گویا محبوب ہی تھے ،کبھی خط میں ،اور کبھی زبانی ، جہاں ذرا بھی موقع پاتے ،ابل پڑتے اور جوش وخروش کے

---

[۱] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۲۴۸

ساتھ، کبھی ہنستے ہوئے، کبھی گرجتے ہوئے اور کبھی آنسو بہاتے ہوئے تبلیغ کر ڈالتے، ان کی عالی دماغی، ذہانت، علم، اخلاص کا پوری طرح قائل تھا اس لیے کبھی بھی کوئی گرانی دونوں کی تبلیغ سے نہ ہوئی اور دونوں حق نصح (خیر خواہی) ادا کر کے پورا اجر سمیٹتے رہے۔ ان دو بھاری شخصیتوں کے بعد ایک تیسرا نام اور سن لیجیے، یہ اپنے ایک ساتھی مولوی عبدالباری ندوی تھے، اور آج جولائی ۱۹۶۷ء کے مولانا شاہ عبدالباری خلیفہ حضرت تھانویؒ۔ دھیما دھیما ان کا اچھا ہی اثر پڑتا رہا۔ اور لیجیے چوتھا نام ایک غیر مسلم کا تو رہا ہی جاتا ہے، یہ بنارس کے فاضل فلسفی اور درویش بابو بھگوان داس تھے، مادیت کے تاریک گڑھے سے نکالنے اور روحانیت کی روشنی میں لے آنے میں خاصہ دخل ان کو بھی ہے، ان کی تحریروں سے استفادہ کے علاوہ ملاقات کا موقع بھی ان سے ملتا رہتا۔''[1]

۱۹۲۰ء سے قبل مولانا ماجد مختلف مذہبی موضوعات مثلاً سیرت، تصوف، تفسیر، حدیث وغیرہ کے مطالعہ سے کافی حد تک اسلام کی طرف مائل ہو چکے تھے۔ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں مولانا نے حیدرآباد کا سفر کیا اور اپنے ایک عزیز ناظر یار جنگ جج کے ذاتی کتب خانے میں نظر محمد علی لاہوری جن کا تعلق احمدی جماعت سے تھا ان کی انگریزی تفسیر پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اس تفسیر کے مطالعہ نے مولانا کے دل میں ایمان کا وہ نور پیدا کر دیا جس کی روشنی نے الحاد کی تمام تاریکیوں کو ختم کر دیا۔ مولانا نے اس واقعہ کا تذکرہ 'آپ بیتی' میں کیا ہے۔

''اکتوبر ۲۰ء میں سفر دکن میں ایک عزیز ناظر یار جنگ جج کے ہاں اورنگ آباد میں قیام کا اتفاق ہوا۔ اور ان کے انگریزی کتب خانہ میں نظر محمد علی لاہوری احمدی (عرف عام میں قادیانی) کے انگریزی ترجمہ وتفسیر قرآن مجید پر پڑ گئی۔ بے تاب ہو کر الماری سے نکالا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ جوں جوں پڑھتا گیا الحمدللہ ایمان بڑھتا گیا۔۔۔۔ انگریزی قرآن کو جب ختم کر کے دل کو ٹٹولا تو اپنے کو مسلمان ہی پایا۔ اور اب اپنے ضمیر کو دھوکا دیے بغیر، کلمہ شہادت بلا تامل پڑھ چکا

---

[1] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۲۴۹۔۲۵۰۔۲۵۱

تھا۔....بہر حال اپنے ذاتی تجربہ کو کیا کروں، میرے کفر وارتداد کے تابوت پر تو
آخری کیل اسی نے ٹھونکی۔ جس اسلام سے دبے پاؤں، چپکے چپکے باہر نکل گیا تھا،
اللہ کی کریمی کہ اسی اسلام میں اسی طرح آہستہ آہستہ پھر داخل ہو گیا۔ اور جس طرح
اخراج وارتداد کا وقت بہ قید یوم وتاریخ متعین کرنا دشوار رہا، اسی طرح بازگشت کا
بھی دن تاریخ متعین کرنا آسان نہیں۔ لیکن بہر حال اب اکتوبر ۲۰ء میں مکمل ہو چکی
تھی۔ ضلالت مطالعہ کے راستہ سے پائی، ہدایت بھی بحمد اللہ اس کی راہ سے نصیب
ہوئی، اکبر کے مصرعہ:

دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

کی تصدیق آپ بیتی سے پوری طرح ہو کر رہی، زندہ شخصیتوں کو دخل
خاص ان انقلابوں میں کم ہی رہا۔"[1]

اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مولانا ماجد کے الحاد کی اڑتی پڑتی خبر ان کے والد مرحوم کو بھی مل گئی تھی جس سے وہ بڑے رنجیدہ اور متفکر ہوئے اور اپنی والی کوشش ان کی اصلاح کے لیے کرتے رہے۔ چنانچہ حج کے لیے جب تشریف لے گئے تو خانہ کعبہ کا غلاف پکڑ کر ان کے راہ راست پر آنے کی سچے دل سے دعا کی جس کو اللہ تعالیٰ نے قبول کیا۔

ملازمت

مالی دشواریوں اور والد محترم کے انتقال کی وجہ سے مولانا کو اب فکر معاش دامن گیر ہوئی۔ چنانچہ انھوں نے حصول ملازمت کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔ انھوں نے مختلف ملازمتوں مثلاً اسسٹنٹ پروفیسر، پوسٹ آفس اور ریلوے وغیرہ میں افسر گریڈ کے لیے کوشش کی مگر کامیابی نہیں ملی، البتہ تھوڑا بہت معاوضہ اردو رسالوں میں مضمون نگاری اور ترجموں سے ملتا رہا۔ ان کو سب سے پہلی ملازمت علی گڑھ ایجوکیشنل کانفرنس میں صاحب زادہ آفتاب احمد خاں نے بطور لٹریری اسسٹنٹ رکھا مگر ان کا جی نہ لگا نئی نئی شادی ہوئی تھی اس لیے نوکری چھوڑ کر چلے آئے۔ دوسری ملازمت حیدر آباد میں بحیثیت مترجم کے ہوئی یہاں سے بھی تھوڑی مدت کے بعد الگ ہو کر چلے آئے۔ خود مختاری، آزادی اور پابندیوں وضابطوں سے

---

[1] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۲۵۴۔۲۵۵

بیزاری اس میں بڑا دخل ان کے جذبہ کا تھا۔ایک باضمیر اور آزاد شخص کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ کسی کی محکومیت اور ایک قسم کی ذہنی غلامی قبول کرے۔حالات کی مجبوری یا نا مساعد حالات سے سمجھوتا کرنا دوسری بات ہے۔اس لیے مولانا نے بھی اپنے آپ سے سمجھوتا کر کے عمر عزیز کے چند ماہ وسال ملازمت کی نظر کر دیے۔لیکن بہت جلد ان تمام جھمیلوں اور بندشوں سے آزاد ہو کر علمی،ادبی، تصنیفی کاموں میں ہمہ تن گوش ہو کر مصروف ہو گئے،اور اپنی ایک الگ دنیا خلق کر لی۔اس کا ذکر انھوں نے 'آپ بیتی' میں تفصیل سے کیا ہے۔چند اقتباسات نقل کیے جا رہے ہیں

''.....پہلا خیال کالج کی اسسٹنٹ پروفیسری کی جانب گیا۔میری فلسفیت کی شہرت خواہ مخواہ ہو گئی تھی اور پرنسپل ڈاکٹر کیمرن بھی مجھ سے خوش تھا،حسن ظن یہ قائم ہوا کہ جگہ مل جانا یقینی ہے،ملازمت چاہتا بھی ایسے ہی سکون وعافیت کی تھا،ورنہ یوں ۱۳ء میں گریجویٹ ہو جانے پر خاصہ امکان ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ کا پیدا ہو گیا تھا۔لیکن اس طرف رخ قصداً نہیں کیا تھا،اور اس خیال میں مگن تھا کہ کالج والی جگہ تو مل ہی جائے گی۔نوعمری میں کیسی کیسی خوش خیالیاں قائم رہتی ہیں،اور کیسا کیسا حسن ظن اپنے متعلق ہو جاتا ہے،خیر وہ جگہ نہ ملنا تھا،نہ ملی۔ ۱۳ء میں جب نسبت اپنے دل خواہ طے پا چکی،اور ذکر شادی کا چھڑ چکا تھا تو تلاش معاش اور زیادہ اہمیت سے شروع ہوئی۔پوسٹ آفس،ریلوے دونوں میں افسر گریڈ کے لیے کوششیں کیں اور شفارشیں بھی اونچی مل گئیں پھر بھی ناکامی ہی رہی۔

..... ۱۲ء و ۱۳ء میں کچھ خفیف سی آمدنی اردو کے ماہ ناموں 'ادیب' (الہ آباد) اور 'الناظر' (لکھنو) سے ہوتی رہی۔ایک روپیہ فی صفحہ کے حساب سے،لیکن سال میں اس کی میزان ہی کتنی؟ مولانا شبلی نے عارضی دستگیری کی،کہ سیرۃ النبی کے اسٹاف میں انگریزی ماخذوں سے مواد فراہم کرنے کے لیے،ڈیڑھ دو گھنٹہ روزانہ کام پر ۵۰ ماہوار پر رکھ لیا۔کام سے وہ بہت خوش تھے،کہ کسی ''مولوی صاحب'' نے علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال کو لکھ کر بھیجا کہ ''مولوی

شبلی تو ایک ملحد کی اعانت سے کتاب تیار کر رہے ہیں' میرا الحاد اس وقت کھلا ہوا تھا ،اور اس پر وہ تعلق بھی ختم ہو گیا۔'فلسفہ جذبات' کا پہلا ایڈیشن نکلا،اور اس پر غالباً ڈھائی سو کی رقم انجمن ترقی اردو نے دی،ایک اور صاحب کو ایک تعلیمی رسالہ لکھ کر دے دیا،اور انھوں نے سو کی رقم پیش کر دی۔بس اسی طرح لشتم پشتم کام چلتا رہا۔

۱۶ء آ گیا اور شروع جون میں شادی ہو گئی۔علی گڑھ کے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے میری انگریزی کتاب سے خوش ہو کر مجھے کانفرنس آفس میں بہ طور لٹریری اسسٹنٹ طلب کیا اور ۷۵ تنخواہ مکان مفت گویا ۲۰۰ اور صاحبزادہ صاحب کام سے خوش بھی رہے،لیکن اس کا کیا علاج کہ نئی اور محبوب بیوی کو چھوڑ کر گیا تھا،جی نہ لگا،چھوڑ کر چلا آیا۔

.....اگست ۱۷ء تھا کہ انھیں مولوی عبدالحق نے تار بھیج کر مجھے حیدرآباد بلا بھیجا عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہو رہی تھی،اور اس کا پیش خیمہ سررشتہ تالیف و ترجمہ کھل چکا تھا،مجھے اس میں مترجم فلسفہ و منطق کی جگہ ملی تھی ،مشاہرہ تین سو ماہوار (۶۷ء کے دو ڈھائی ہزار کے برابر) پہلی ستمبر ۱۷ء سے شروع جولائی ۱۸ء تک جم کر رہا۔دوست احباب،مخلصین کا مجمع اچھا خاصہ،محبوب بیوی ساتھ ،لیکن ملازمت بہر حال ملازمت تھی ،جی نہ لگا ،پہلی اگست ۱۸ء کو واپس آ گیا اور لکھنو سے استعفی لکھ کر بھیج دیا۔

.....فروری یا مارچ ۱۹ء تھا کہ ایک عرض داشت اپنے علمی وظیفہ کے لیے اعلی حضرت نظام کو سر امین جنگ صدر المہام پیش گاہ عالی کے توسط سے لکھ کر بھیجی ،شروع مئی میں تار پر طلبی ہوئی ،باریابی ہوئی ،بڑے کرم و اخلاق سے پیش آئے ،بالآخر تصنیفی پنشن سوا سو روپے ماہوار کی مقرر ہو گئی۔.... ۴۶ء تک یہی رقم جاری رہی ،ظاہر ہے کہ ۱۹ء کا مشاہرہ ۴۶ء میں کہاں تک کافی ہو سکتا تھا جب سر مرزا اسماعیل صدر اعظم ہو کر حیدرآباد آئے ،تو میرے مخلص دوست ہوش

بلگرامی (ہوش یار جنگ) نے انھیں توجہ دلائی، ان بچارے نے یہی نہیں کہ رقم بڑھا کر پورے ۲۰۰ کر دی بلکہ دو ہزار نقد بھی دلوایا۔

ستمبر ۴۸ء میں سلطنت آصفیہ کا قلع قمع ہوگیا، اور اس لپیٹ میں میری پنشن بھی آگئی، اکتوبر ۵۰ء میں حکم آیا کہ پنشن بند! دہلی سے مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیمات نے میری حمایت میں بڑا زور لگایا، اور بار بار اجراء پنشن کے لیے لکھا، کامیابی نہ ہوئی آخر میں دہلی جا کر پنڈت جواہر لال نہرو سے ملا، ان بچارے نے بھی میری حمایت کی، جب کہیں جا کر جون ۵۱ء میں پنشن دوبارہ کھلی، مگر ۲۰۰ سے گھٹ کر پھر اس سواسو پر آگئی! دو چار سال بعد میں نے اسے یوپی اسٹیٹ میں منتقل کرالیا اور اب یہیں لکھنو کے خزانہ سے ہر ماہ ملتی رہتی ہے۔

اگست ۶۶ء میں اس سرکاری آمدنی میں یوں اضافہ ہوا کہ سرکار ہند نے اس سال اعزازی سند فاضل عربی ArbicScholar کی دی، اس سند کے ساتھ ڈیڑھ ہزار کا عطیہ بھی سالانہ ملتا ہے (گویا سواسو ماہوار)۔ اگست ۶۹ء سے یہ رقم بڑھ کر ۳ ہزار سالانہ کی ہوگئی۔ ساتھ ہی یوپی سرکار نے مصنفین واہل فن کے امدادی فنڈ سے بھی ۶۵ء سے علمی پنشن پچاس روپیہ ماہوار ایک سال کے لیے مقرر کر دی اور توقع ہے کہ اس ماہ جولائی سے بڑھ کر ۵۰ کی رقم ایک سال کی اور ہو جائے۔ چنانچہ سو روپے کی ماہوار مجموعی رقم یہ ملنے لگی۔

..... پرچہ ماشاالله خاصہ چل رہا ہے، اور اب تو دو چار سال سے خرچ سب نکال کر کارکنوں کی تنخواہ دے کر بچت ماشاالله ۱۸۰ ماہوار کی ہو رہی ہے بلکہ اب کچھ دن سے بڑھ کر ۲۰۰ تک پہنچ گئی ہے۔ اور صدق کے ساتھ جو چھوٹی سی بک ایجنسی ہے اس کا بھی ماہوار اوسط یہی کوئی ۵۰ کا پڑ جاتا ہے۔ کتابوں کی رائلٹی بھی خاصی مل جاتی ہے۔ .... مارچ ۶۶ء میں یوپی گورنمنٹ کی ایک مالی کمیٹی نے پانچ ہزار کا انعام بہ حیثیت بہترین مصنف اردو عطا کیا''[1]

---

[1] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۳۱۰-۱۱-۱۲-۱۳-۱۴-۱۵

اس میں یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیے کہ والی مملکت آصفیہ عثمان علی خاں نے ان کی پنشن مقرر کر کے ان کو آزاد علمی زندگی گذارنے کا موقع دیا جس کے وہ ہمیشہ شکر گذار رہے۔ مختلف ذرائع اور تصنیف و تالیف کے معاوضہ اور رائلٹی کی وجہ سے مولانا کی مالی حالت اچھی ہوگئی تھی۔ چونکہ مولانا کفایت شعار تھے اور بے جا مصارف سے اجتناب کرتے تھے اسی وجہ سے یہ آمدنی آرام سے سادہ زندگی بسر کرنے کے لیے کافی تھی۔

اعزازات

مولانا کو اپنی علمی و ادبی کاوشوں کے لیے مختلف اعزازات سے نوازا گیا جس کی مختصر تفصیل درج ذیل ہے۔

ممبر رائل ایشیاٹک سوسائٹی (برطانیہ) ممبر ارسٹوٹیلین سوسائٹی (برطانیہ)

۱۹۲۵ء میں اعزازی 'ندوی' کا خطاب انجمن طلبہ قدیم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو نے دیا جس کو ارباب ندوہ نے برضاء و عزت سے قبول کیا اور اس کا ہمیشہ اعتراف کیا۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا کو ندوۃ العلماء سے بڑا گہرا ذہنی تعلق تھا۔ جس کو انھوں نے آخر تک بنایا۔ مجلس انتظامیہ کے اجلاس کی زیادہ تر صدارت وہی کرتے تھے۔

۱۹۶۲ء میں یو پی حکومت نے قابل قدر ادبی تصانیف کی بنا پر یو پی کے بہترین ادیب کا نقد انعام پانچ ہزار روپیہ کا عطا کیا۔

اگست ۱۹۶۶ء میں حکومت ہند نے عربی میں سند فضیلت کا صدر جمہوریہ ایوارڈ دیا جس کو صدر رادھا کرشنن نے اپریل ۱۹۶۷ء میں راشٹر پتی بھون میں دیا۔

۱۹۷۴ء میں ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی لکھنو نے ادبی اعزاز سے نوازا

۱۹۷۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جانب سے ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری صدر جمہوریہ فخر الدین علی احمد کے ہاتھوں دی گئی۔

یو پی اردو اکیڈمی کے بنیادی ممبر بنائے گئے نیز اردو کتب پر انعام دینے والی کمیٹی کے صدر بھی کئی سال تک رہے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی کورٹ کے ممبر بھی کئی سال تک رہے۔ نیز شعبہ دینیات و اسلامیات کی

کمیٹیوں کے ممبر اور ممتحن بھی رہے۔

پشاور، لاہور، بمبئی اور مدراس کی مختلف علمی و ادبی انجمنوں نے خصوصی خطبات و لکچر دینے کے لیے مدعو کیا جو کتابی شکل میں شائع ہو کر بہت مقبول ہوئے۔

شادی

خاندانی رواج کے مطابق مولانا ماجد کی نسبت کم عمری میں ایک قریبی عزیزہ سے طے پا گئی تھی۔ اس زمانے میں بالعموم لڑکے یا لڑکی سے اس کی پسند یا مرضی نہیں معلوم کی جاتی تھی۔ بلکہ خاندان کے بڑے بزرگ اپنی مرضی سے ان کا رشتہ کم سنی ہی میں طے کر دیا کرتے تھے۔ مولانا کی منسوبہ ان سے عمر میں تقریباً آٹھ سال چھوٹی تھیں قبول صورت، سلیقہ منداور گھریلو قسم کی لڑکی ہونے کے باوجود ان کو یہ رشتہ پسند نہ آیا، خاص کر اس وقت جب وہ فرنگیت اور مغربیت، تشکیک والحاد میں گرفتار تھے اس لیے والدہ ماجدہ کی ناخوشی کے باوجود انھوں نے اپنی پسند کی شادی کی۔ اس کے متعلق مولانا لکھتے ہیں۔

> ''اسکول کا دور ختم ہوا اور کالج میں آ گیا۔ سن بھی کوئی ۱۶، ۱۷ کا، اب کبھی کبھی شادی کا خیال آنے لگا، دل کو ٹٹولا تو کوئی کشش اس لڑکی کی بابت نہ پائی، وہ خوبصورت تھی، سلیقہ مند تھی، خوش اطوار تھی، لیکن بہر حال دیہات کے ماحول میں پرورش پا رہی تھی، اور بھولی بھالی تھی، علوم وفنون کی تعلّی اور شہر کی چلت پھرت سے کوسوں دور اور یہ مجھ فرنگیت زدہ اور سودہ ''ریشنلسٹ'' کی نگاہ میں سو جرموں کا ایک جرم، سو عیبوں کا ایک عیب تھا۔''[1]

ایک دن مولانا ماجد نے اپنے عزیز اور بے تکلف دوست سے اپنی ناپسندیدگی اور بے زاری کا اظہار کر دیا، اور یہ بات ان کی والدہ تک جا پہنچی نیک مزاج مشرقی خاتون کو پہلے اس بات پر یقین نہ آیا۔ آخر کار ان کو اس بات پر نہ صرف یقین کرنا پڑا بلکہ انھیں یہ بھی فکر دامن گیر ہوئی کہ کہیں ان کا بیٹا کوئی فرنگن یا کرستان کو نہ لے آئے۔

مولانا کے خاندان کا ایک شاخ باندہ شہر میں آباد تھا۔ انھیں میں ان کے حقیقی خالہ زاد بھائی شیخ محمد یوسف الزماں بھی تھے۔ جن کا شمار شہر کے معزز رئیسوں میں ہوتا تھا۔ ان کے بال بچے زیادہ تر لکھنو میں ہی

---

[1] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۱۵۸

رہتے تھے۔ ان کی چھوٹی بیٹی عفت النساء اپنی بڑی بہن عصمت النساء کی شادی میں کام کاج کرنے کی وجہ سے سخت بیمار ہوگئیں ٹانگوں میں شدید درد ہوگیا تھا۔ علاج و معالجے سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہورہا تھا۔ اسی زمانے میں مولانا کی شہرت بطور ہپناٹزم معالج کے ہوگئی تھی۔ شہرت سن کر مولانا کو اس لڑکی کے علاج کے لیے بلایا گیا۔ چنانچہ وہ ان کے یہاں بار بار گئے۔ ان کے عمل سے مریضہ تو شفایاب ہوگئیں مگر یہ خود دل کے مریض بن بیٹھے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

> ''نوجوان قبول صورت لڑکی کی مسکراہٹ اور اس پرمسرت آواز میں جادو کا اثر تھا! مریضہ کا چہرہ آناً فاناً معالج کی دل چسپی اور توجہ کا مرکز بن گیا! اب وہ میری مریضہ نہ تھی، اتنی ذرا سی دیر میں 'کچھ اور' بن گئی تھی، اور معالج اب خشک معالج نہ رہا خود علاج طلب مریض سا بن گیا۔ شکار کرنے کو آئے شکار ہو کر چلے۔''[۱]

مولانا ماجد کی والدہ کو جب اس رشتہ کی خبر ملی۔ ان کو تھوڑی تقویت ملی کہ ان کے بیٹے نے اپنے ہی خاندان کی لڑکی کا انتخاب کیا ہے۔

> ''والدہ بچاری کو بڑی فکر بلکہ تشویش رہتی تھی، کہ خدا معلوم میں انتخاب کس کا کروں، اور پسند کر کے کس کو لاؤں، اب جب یہاں کا نام انھوں نے سنا تو جیسے ان کی جان میں جان آگئی، بڑی تسکین انھیں ہوگئی بلکہ دل سے خوش ہوئیں کہ ہونے والی بہو ان کی حقیقی ہمشیر کی پوتی تھی۔''[۲]

چنانچہ ایک جون ۱۹۱۶ء کو مولانا ماجد کی شادی عفت النساء کے ہم راہ ہوگئی۔ ان کا سہرا اپنے زمانے کے مشہور شاعر 'مرزا محمد ہادی عزیز' نے لکھا تھا۔ جو بعد میں الناظر میں شائع ہوا۔ مولانا کی شادی کے مبارک موقع پر علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالحلیم شرر، ظفر الملک علوی ایڈیٹر الناظر وغیرہ جیسی اہم و عظیم شخصیتوں نے شرکت فرمائیں۔ مولانا لکھتے ہیں۔

> ''.....یکم جون کی شام کو ۱۰، ۱۲ بزرگوں، عزیزوں کی بارات ساتھ لیے لکھنو پہنچا، انتظامات سب بڑے بھائیوں کے ہاتھوں میں تھے، اور مصارف بھی

---

[۱] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۱۶۰۔۱۶۱

[۲] ایضا: ص: ۱۶۴

تقریباً سارے انھیں نے اٹھالیے، میرے پاس تھا ہی کیا، برائے نام کچھ تھوڑی بہت شرکت میں نے بھی کر لی۔ خیر بارات حسب توقع خوب دھوم دھام سے اتاری گئی۔ دوسرے روز جمعہ تھا، نو بجے صبح عقد مسعود میاں کا ہوا، ۹ بجے شب میں میرا، لکھنو کے بہت سے مہمان شریک ہوئے، راجہ صاحب محمود آباد، جسٹس کرامت حسین، آنریبل شیخ شاہد حسین قدوائی بیرسٹر، مولانا سید سلیمان ندوی وغیرہم۔ تقریب عالی شان تو خیر کسی معنی میں نہ تھی، لیکن ایسی بھی نہ تھی کہ بالکل سادہ کہی جائے، کھانے کی دعوت، عقد سے قبل خاصی زور دار رہی، پلاؤ کی فرمائش ہر طرف سے ہو رہی تھی، نکاح فرنگی محل کے مولوی محمد اسلم صاحب نے پڑھایا، میری لامذہبی کے پیش نظر بعض عزیزوں نے چاہا کہ ایجاب وقبول سے پہلے مجھ سے کلمہ شہادت پڑھوا کر تجدید ایمان کرالی جائے، بڑی خیر گذری کہ نکاح خوان نے اس کی ضرورت نہ سمجھی، ان کا فرمانا تھا کہ جب کسی نے اپنا نکاح مسلمانوں کے طریق پر پڑھوانا چاہا، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اسلام کا قائل ہے، اب خواہ مخواہ بدگمانی کر کے اس کی چھان بین کیوں کرائی جائے۔ اس طرح یہ بات ٹل گئی اور میں آزمائش سے بچ گیا۔"[1]

اکبر الہ آبادی نے (فروغ ماجد) کے مادہ سے مولانا کی شادی کی تاریخ نکالی ہے۔ سید سلیمان ندوی نے بھی اس مبارک موقع پر تین رباعیاں کہیں جس میں سے ایک کا ذکر مولانا ماجد نے اپنی' آپ بیتی' میں کیا ہے۔ وہ تینوں رباعیاں درج ذیل ہیں۔

لایا ہے پیام یہ خوشی کا قاصد ۔۔۔ نوشاہ بنے ہیں آج عبدالماجد
وہ روز سعید بھی خدالائے جلد ۔۔۔ بن جائیں وہ جب کسی کے والد

گر وحدت حق کا کلمہ گو ہونا ۔۔۔ معلوم ہو ہر بشر کو جو ہونا ہے
بندہ ہو خدا کے مثل ناممکن ہے ۔۔۔ وہ ایک ہے جب تو ہم کو دو ہونا ہے

---

[1] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۱۷۵-۱۷۶

منکر ہو نہ کوئی اپنی ہمتائی کا یہ کام کبھی نہیں ہے دانائی کا
اللہ نے اب غروران کا توڑا دعوی تھا مرے دوست کو یکتائی کا "[1]

مولانا ماجد کی ازدواجی زندگی تلخ وشیریں، نرم گرم ہونے کے باوجود خوش حالی وسکون سے بسر ہو رہی تھی۔لیکن ان کی ازدواجی زندگی انتشار وبے چینی کا شکار اس وقت ہوگئی، جب انھوں نے ایک بے سہارا وبیوہ خاتون سے ۱۹۳۰ء میں کار ثواب سمجھ کر عقد ثانی کرلیا۔لیکن چند ماہ کے بعد ہی طلاق کی نوبت آگئی۔ اپنے عقد ثانی کا تذکرہ مولانا نے 'آپ بیتی' میں تفصیل سے کیا ہے۔جس کی تلخیص پیش کی جارہی ہے۔

۱۹۲۶ء کے اوائل میں مولانا کے دوست عبدالرحمٰن ندوی کا عین جوانی میں انتقال ہوگیا۔انھوں نے ایک بیوہ اور ایک معصوم بچی چھوڑی۔بیوہ کی عمر اس وقت ۲۷ سال تھی۔مولانا ماجد کے بڑے بھائی عبدالمجید صاحب نے کئی بار خط لکھ کر ان سے یہ کہا کہ اس بیوہ کے عقد ثانی کی کوئی صورت نکالی جائے۔مولانا ماجد نے بہت کوشش کی تمام کوششوں کے باوجود بھی کوئی مناسب رشتہ نہ مل پایا۔تو ان کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ وہ بذات خود کیوں نہ نکاح کرلیں، اور اس طرح ایک سنت بھی زندہ ہوجائے گی، اور اس بیوہ کی مالی مشکلات بھی حل ہوجائے گی۔آخر کار انھوں نے بیوہ کے بھائی کو خط وکتابت کے ذریعہ اپنا مدعا پیش کیا، اور اسی درمیان انھوں نے اپنی رفیق حیات کی بھی رضامندی حاصل کرلی، اور نکاح اکتوبر ۱۹۳۰ء میں منعقد ہوا۔انسانی فطرت بطور خاص عورتوں کی خصلت وفطرت میں انتہائی تہہ داری وپیچیدگی ہوتی ہے، اور یہی خصوصیت اسے کوئی مستحکم فیصلہ لینے سے روکتی ہے۔مولانا ماجد کی پہلی بیوی نے یوں تو نکاح ثانی کی اجازت دے دی تھی مگر نکاح کے فوراً بعد سوتن کی آمد سے شدت غم کا شکار ہوگئیں، اور کئی امراض میں مبتلا ہوگئیں۔چند ہی ہفتوں میں غشی اور تشنج کے دورے بھی پڑنے لگے۔مولانا ماجد نے ان ذہنی اور جسمانی تکلیفوں کو اس طرح بیان کیا ہے۔

".....اور اب ان محبوب بیوی کو جنھیں اختلاج تو پہلے ہی سے تھا، باقاعدہ دورے غشی اور تشنج کے ہسٹیریا کے سے پڑنے لگے! ہر وقت غصہ میں بھری رہتیں، کھڑے سے گر پڑتی تھیں اور سخت سخت چوٹیں کھاتی تھیں۔میرے ہاتھوں کے جیسے طوطے اڑ گئے گویا: اسد اور لینے کے دینے پڑے!"[2]

---

[1] مکتوبات سلیمانی (جلد دوم): مرتب عبدالماجد دریابادی: ص ۵۵

[2] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۱۹۳

دوسری طرف صورت حال یہ تھی کہ ان کو اپنی دوسری بیوی کسی بھی اعتبار سے پسند نہ آئیں ۔مولانا کے انداز ومعیار سے بالکل مختلف نکلیں چند مہینے تو کسی طرح بسر ہو گئے ۔لیکن ان کی سسرال والے عزیز بلکہ پورے خاندان اور رشتہ داران سے سخت ناراض تھے ۔جس کی وجہ سے طلاق کی نوبت آ گئی جس کا بیان مولانا نے' آپ بیتی' میں کیا ہے ۔

''عقد اکتوبر ۱۹۳۰ء میں ہوا تھا ،طلاق کی نوبت غالباً ۱۹۳۱ء میں آ گئی، طلاق نامہ پا کر ان محترمہ پر جو اثر پڑا ، بالکل ظاہر ہے ،میرے پاس معذرت نامہ بڑے ملتجیانہ انداز میں لکھا ،میری ہمشیرہ سے بھی سفارش اٹھوائی ، مجھے خود بچاری پر بڑا ترس آتا رہا ،لیکن کرتا کیا ، یہ رشتہ قائم رکھتا تو مجھے خود بھی تکلیف ، انھیں بھی تکلیف ،پہلی بیوی کو تکلیف ،اتنوں کو تکلیف کا سامنا کرنا تھا ،اور علیحد گی کی صورت میں صرف انھیں کو تکلیف تھی قدرۃ اھون البلیات کو اختیار کیا ۔مہر کی رقم ہی کیا تھی ،فوراً ادا کر دی اور اس کے بعد بھی کچھ نہ کچھ ماہانہ خدمت کی توفیق عرصہ تک حاصل رہی ،آخر میرے ایک مخلص و بزرگ دوست کی بیوہ بھی تو تھیں ۔ بچاری نے زندگی ہی زیادہ نہ پائی ، بچی تو طلاق کے کچھ ہی دن بعد راہئ ملک و بقا ہوئی ،خود بھی دو چار سال سے زیادہ زندہ نہ رہ سکیں ، دنیا سے سخت تنگ و ناشاد ہو کر اپنے مولا سے جا ملیں ۔**رب اعفرلها وارحمها** ۔میں نے ان کے سارے قصوروں ،کوتاہیوں کو معاف کیا ،اور اسی معافی کی طمع اپنے قصوروں کے لیے ان سے بھی رکھتا ہوں ، بچاری کیا کیا امیدیں لے کر میرے گھر آئی تھیں اور کیا کیا حسرتیں لیے ہوئے رخصت ہوئیں ۔''[۱]

مولانا بطور صحافی ہمیشہ حق و صداقت کا ساتھ دیتے تھے ،اور نہ معلوم کتنوں کے چہروں سے نقاب کشائی کر چکے تھے ۔اسی وجہ سے ایک بڑا طبقہ مولانا سے ذاتی دشمنی رکھتا تھا ۔اس طلاق کے واقعہ نے ان کے حریفوں کو ان کے خلاف ایک اچھا موقع فراہم کر دیا ۔اس طلاق کو موضوع بنا کر مولانا ماجد کی شخصیت کو داغ دار کرنے کی ناکام کوشش کی گئیں ۔جس کا اظہار انھوں نے' آپ بیتی' میں کیا ہے ۔

---

۱ آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۱۹۴۔۱۹۵

''طلاق دینا تھا کہ معلوم ہوا، ملک بھر میں ایک زلزلہ آگیا! جن جن صاحبوں کو سچ (صدق کے نقش اول) سے کوئی بھی وجہ ملال تھی، ان کی بن آئی، سب نے خوب خوب قلم کی کارفرمائی دکھائی۔ ایک مستقل پمفلٹ 'عبدالماجد دریابادی بے نقاب' کے عنوان سے بڑی تعداد میں چھپ کر خوب تقسیم ہوا، اور خدا جانے کتنے اخباروں رسالوں نے اسی کے سہارے تیغ قلم کے جوہر مہینوں تک دکھائے! گویا میں کسی شخصی وذاتی ہی نہیں، بلکہ کسی بڑے قومی جرم کا مرتکب ہوا تھا، ہر قسم کی پبلک تفضیح ورسوائی کا سزاوار، اور ایک دہلوی کرم فرما تو یہ پوسٹر ملک بھر میں شائع کر کے رہے کہ میرے اوپر ہر جمعہ کے دن ہر مسجد کے منبر سے لعنت کی جائے۔ طبعی کبیدگی مجھے کیوں نہ ہوتی، لیکن بحمداللہ عقلاً خوش ہی ہوتا رہا۔ کہ ادائے حقوق میں کوتاہیاں خدا معلوم کتنی رہ گئی ہوں گی، اچھا ہوا کہ اس طوفان فضیحت سے کچھ تو کفارہ ان کا ہو جائے۔''[۱]

بہرحال انھوں نے مطلقہ بیوی کی اعانت کی کوشش کی مگر ان کے جلد انتقال کی وجہ سے یہ کوشش کامیاب نہیں رہی۔ لیکن منصف مزاج حلقوں نے اس ذاتی معاملہ میں مولانا کے خلاف مہم کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

اولاد

مولانا ماجد دریابادی کی شادی کے ایک سال بعد ان کے یہاں توام اولادیں ہوئیں۔ دونوں لڑکے تھے، ایک پیدا ہوتے ہی رخصت ہوگیا، دوسرا تیرہ ماہ تک زندہ رہا، ستمبر ۱۹۱۸ء میں اس کا بھی انتقال ہوگیا۔ اکبرالہ آبادی سے مولانا کو بڑی عقیدت تھی اس لیے انھیں کے نام پر دوسرے بچے کا نام اکبر رکھا۔

مولانا کے یہاں کئی اولادیں ہوئیں۔ مگر زندہ صرف چار صاحبزادیاں رہیں۔ چاروں کی شادی انھوں نے اپنے چاروں حقیقی بھتیجوں (مولوی عبدالمجید صاحب کے صاحبزادوں) سے کر دیں۔ جو ہر طرح سے کامیاب رہیں۔ اس وقت ان چاروں کا انتقال ہو چکا ہے۔

بڑی لڑکی کا نام رافت النساء ولادت اگست ۱۹۱۹ء میں لکھنو میں ہوئی۔ تعلیم رواج کے مطابق قرآن ناظرہ، اردو، عربی، فارسی وغیرہ کی ملی۔ ان کا عقد حکیم عبدالقوی دریابادی سے ہوا۔ ان کا انتقال

---

[۱] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۱۹۵-۱۹۶

۱۹۹۶ء میں لکھنو میں ہوا۔

منجھلی صاحبزادی کا نام حمیرہ خاتون ولادت مئی ۱۹۲۳ء میں لکھنو میں ہوئی۔ اردو تعلیم کا مطالعہ اچھا خاصہ، عربی، فارسی کے ساتھ ساتھ انگریزی سے بھی واقفیت رکھتی تھیں۔ یہ اپنے والد کی سب سے زیادہ مزاج شناش اور ہر طرح کے مشورے وانتظام میں مولانا ان کو شریک رکھتے تھے۔ ان کا عقد حبیب احمد قدوائی سے ہوا۔ اپریل ۲۰۰۵ء میں ان کی وفات ہوئی۔

سنجھلی زہیرا خاتون ولادت مارچ ۱۹۳۱ء میں دریاباد میں ہوئی۔ رنگ، روپ، شکل صورت میں سب بہنوں پر سبقت رکھتی تھیں۔ تعلیم عربی، فارسی، انگریزی۔ یہ بھی اپنے والد صاحب کی مزاج شناس تھیں۔ ان کا عقد محمد ہاشم قدوائی سے ہوا۔ جنوری ۲۰۰۵ء میں سفر آخرت پر روانہ ہوگئیں۔

سب سے چھوٹی بیٹی زاہدہ خاتون کی ولادت ۱۹۳۳ء میں دریاباد میں ہوئی۔ تعلیم سبھی بہنوں سے زیادہ ملی اور مولانا سے بہت نزدیک تھیں۔ لیکن ان کی صحت زیادہ اچھی نہ رہتی تھی۔ دبلی پتلی تھیں، اور مختلف بیماریوں کی مریض تھیں ان کا عقد عبدالعلیم قدوائی سے ہوا۔ ان کا انتقال بہنوں میں سب سے پہلے ۱۹۹۳ء میں ہوا۔

مولانا ماجد کی چاروں لڑکیاں اطاعت شعار، مذہبی، سلیقہ منداور پردے کی پابند۔ اور ہر ایک اپنے والد ماجد کا خیال بڑھ چڑھ کر رکھنے والی تھیں۔

سیاسی سرگرمیاں

مولانا ماجد کو سیاست سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ مولانا جب سن شعور کو پہنچے اس وقت انگریزی سامراج پوری طرح سے ہندوستان کی قسمت کا مالک بن چکا تھا۔ مسلمانوں کا بڑا طبقہ انگریزوں کا طرف دار اور حمایتی ہو گیا تھا۔ حسرت موہانی، محمد علی جوہر، شوکت علی، ابوالکلام آزاد، عبدالباری فرنگی محلی وغیرہ آزادی کی لڑائی میں جوش وخروش سے حصہ لیتے تھے۔ انھیں کے اثر سے وہ بھی فرنگیت اور فرنگی تسلط کے سخت مخالف ہو گئے تھے۔ اس زمانہ میں جو اخبار ورسائل نکلتے تھے انھیں وہ بڑی دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ مگر عملی سیاست میں حصہ لینے سے وہ ہمیشہ کتراتے رہے۔ اسی دور میں ابوالکلام آزاد کا 'الہلال' کلکتہ سے نکلتا تھا شروع میں اپنی فرنگیت کی بنا پر اس سے زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ اس وقت وہ ان کے علم وفضل کے بھی

خاص قائل نہ تھے۔ بعد میں یہ صورت حال بالکل بدل گئی تھی۔اسی طرح علی گڑھ سے 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' ہفتہ وار نکلتا تھا۔لیکن یہ بھی مولانا کی توجہ کا مرکز نہ بن سکا۔کیونکہ اس زمانہ میں وہاں کے طلبہ میں برطانوی سامراج کے خلاف نفرت وانتقام کے جذبات اور آزادی کا جوش پیدا ہو چکا تھا۔لیکن انھوں نے ان باتوں سے اپنا دامن بچائے رکھا۔صرف لکھنو میں منعقد ہونے والے جداگانہ انتخابات کے مطالباتی جلسوں اور کانفرنسوں میں ان کی شرکت محض تماشائی کی حیثیت سے ہوتی تھی۔

مولانا ماجد دریابادی کو اپنے معاصر سیاسی منظرنامے میں مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت اور ان کی صحافت میں بڑی کشش محسوس ہوتی تھی۔لیکن یہ کشش زیادہ تر ان کی ذات اور ان کے دونوں اخبار 'ہمدرد' اور 'کامریڈ' کے مطالعہ تک محدود رہی۔

مولانا کو عملی سیاست سے دلچسپی اس وقت پیدا ہوئی جب حکومت نے مسز اینی بیسنٹ جیسی آفاقی ومقبول شخصیت کو تحریک ہوم رول کے سلسلہ میں گرفتار ونظر بند کر دیا تھا۔مولانا ماجد کو بابائے قوم مہاتما گاندھی سے بھی خاصی عقیدت ہوگئی تھی۔لیکن انھوں نے اپنا سیاسی ومثالی رہنما اپنے محبوب اور عزیز دوست محمد علی جوہر کو منتخب کیا۔اس لیے جب تک محمد علی جوہر باحیات رہے مولانا بھی سیاست میں ان کا ساتھ دیتے رہے۔اور ان ہی کی وجہ سے اودھ خلافت کانفرنس کے صدر بھی ہوگئے اور اپنے اخبار 'سچ' میں سودیشی تحریک کی تائید اور انگریزی حکومت کے ظلم وستم کی مخالفت کرتے رہے۔

دسمبر ۱۹۲۵ء میں یوپی خلافت کمیٹی کے صدر بنائے گئے۔اس کے کچھ دنوں کے بعد مرکزی خلافت کے ممبر بھی بنائے گئے۔۱۹۲۷ء میں جب لکھنو میں خلافت کانفرنس کا جلسہ ہوا تو مولانا کو مجلس استقبالیہ کا صدر بنایا گیا۔اور مولانا نے جو خطبہ اس وقت پڑھا،اسے بڑی مقبولیت ملی۔مولانا محمد علی جوہر خطبہ سننے کے بعد ان کو گلے لگا کر پیشانی پر بوسہ لیا۔مولانا چار سال تک صوبائی خلافت کمیٹی کے صدر بھی رہے۔

''سیاست ملکی میں زیادہ کبھی نہیں پڑا۔البتہ جب سے کامریڈ نکلنا
شروع ہوا تو میں اس کا حرف حرف پڑھنے لگا۔ترکی سیاست اور عام اسلامی
سیاست سے دلچسپی ہونے لگی۔پھر جب ۱۷ء میں مسز بیسنٹ یک بیک نظر بند
ہوئیں تو ان کی ذات سے عقیدت کی بنا پر دل کو ایک دھچکا سا لگا ہوم رول اور

کانگریس کو اچھا سمجھنے لگا۔ پھر گاندھی جی کی تحریک ترک موالات اٹھی اور اس کا علم بردار عملی حد تک بن گیا۔ چنانچہ ماڈرن ریویو (کلکتہ) میں مضمون ستیہ گرہ اور اسلام پر لکھا اور پھر جب علی برادران گرفتار ہوکر کراچی کے مقدمہ میں سزایاب ہوئے تب سے تو تحریک خلافت کا بے داموں غلام بن گیا۔ مرکزی خلافت کمیٹی اور پھر اس کی ورکنگ کمیٹی کا ممبر بھی رہا اودھ خلافت کمیٹی کا صدر کئی سال تک رہا ۱۹۲۷ء میں لکھنو میں خلافت کانفرنس کا جو اجلاس ہوا اس کی مجلس استقبالیہ کا صدر تھا جو ایڈریس اس میں پڑھا۔ لوگوں نے اس کی بڑی ہمت افزائی کی۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں سے ہمدردی رہی لیکن وہی دور دور کی اور جب سے محمد علی کا انتقال ہوگیا۔ سیاست سے بالکل قطع تعلق کرلیا۔ گاندھی جی کی دوراندیشی، تدبیر اور اخلاص سب کا مداح زندگی بھر رہا اور ان کی بے وقت اور بے دردانہ موت ملک کے لیے ہی نہیں مسلمانوں کے لیے بھی ایک سانحہ ہے۔''[۱]

بیعت و ارادت

مولانا ماجد کا خاندان شروع ہی سے مذہبی اور تصوف کا دلدادہ تھا۔ کئی پشتوں تک وہ سلسلہ چشتیہ سے وابستہ رہا۔ پھر قادریت کا اثر بڑھتا گیا، اور مولانا ماجد بھی کچھ عرصہ تک رواجی وظاہری تصوف کے قائل رہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں۔

''اپنا خاندان علاوہ ایک صاحب علم خاندان ہونے کے ایک نیم صوفی خاندان بھی تھا، اور چند پشت قبل تک مشرب چشت رکھتا تھا، پھر رفتہ رفتہ قادریت غالب آ گئی۔ بچپن میں نمونے اس رواجی تصوف اور رسمی پیرزادگی کے اپنے خاندان میں اچھے خاصے دیکھنے میں آئے تھے، اور کم سنی ہی میں بزرگوں کے ملفوظات اور مناقب 'غوث اعظم' اور 'بڑی گیارہویں' قسم کی کتابیں خاصی پڑھ ڈالی تھیں، ''غوث اعظم'' سے عقیدت تو خیر، البتہ ان کے نام کی ہیبت اور ان سے دہشت دل میں بیٹھ گئی تھی، بلاوجہ ان کا نام تک لیتے ہوئے ڈرتا تھا۔''[۲]

---

[۱] غبار کارواں (مضمون) مولانا عبدالماجد دریابادی: فروغ اردو: (عبدالماجد دریابادی نمبر) اگست تا اکتوبر ۱۹۷۷ء لکھنو: ص: ۲۱-۲۲

[۲] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۲۶۵

مولانا ماجد جب کالج میں داخل ہوئے تو تصوف وتقوی تو دور کی بات ان کا اپنا مذہب اسلام بھی خطرے میں پڑا ہوا تھا۔ الحاد وتشکیک کے بعد اسلام میں مراجعت کے دوران انھیں بہت سی شخصیات نے متاثر کیا۔لیکن ان شخصیات میں کوئی ایسا نہ تھا، جس کے لیے ان کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوتا کہ اس کو اپنا پیرومرشد تسلیم کرلیں۔ مولانا محمد علی کی شخصیت میں انھیں پیروطریقت ومرشد کامل کا عکس نظر آتا تھا۔ اسی لیے متعدد باران کے دل میں خیال آیا کہ ان سے بیعت کرلیں، لیکن یہ خیال خیال ہی رہا۔ بعض دوستوں نے، مولانا حسین احمد دیوبندی سے بیعت لینے کا مشورہ دیا۔ مولانا حضرت اشرف علی تھانوی سے ملنے تھانہ بھون گئے۔ کچھ خیال ان سے بیعت کرنے کا بھی تھا۔ اس سلسلہ میں خط وکتابت بھی کر چکے تھے۔ مگر مولانا تھانوی نے اصرار کرکے حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے ان کو بیعت کرادیا۔ سیاسی اعتبار سے وہ مولانا حسین احمد دیوبندی سے متاثر تھے۔ چنانچہ آپ بیتی میں اس کا ذکر مولانا نے کیا ہے۔

''رفیق قدیم مولوی عبدالباری صاحب ندوی بھی اتفاق سے اسی زمانہ میں اسی تلاش مرشد کے چکر میں مبتلا تھے، جولائی ۲۸ء کا آغاز تھا کہ انھیں ساتھ لے، پہلے دیوبند پہنچا، اور انھیں نے درخواست بیعت کی مولانا حسین احمد صاحب سے کی، اس میں ایک بڑا دخل سیاسی ہم مزاجی کو حاصل تھا۔ اور ایک دن کی یکجائی کے بعد مولانا کی رائے سفر تھانہ بھون کی ہوئی۔ تینوں کا قافلہ آدھی رات کو خانقاہ تھانہ بھون پہنچا۔ سناٹے کا وقت۔ سب سوتا پڑا ہوا تھا۔ دل اس وقت بھی حضرت تھانوی کی بیعت سے لرز رہا تھا، اور اس وقت کے عقائد کے لحاظ سے یقین تھا کہ حضرت پر ساری کیفیت روشن ہوگی، گویا نعوذ باللہ حاضر وناظر ہیں! خیر بعد فجر پیشی ہوئی، اور اس کے بعد مولانا نے تخلیہ میں حضرت سے سفارش کی کہ وہی اپنی بیعت میں ہم دونوں کو لے لیں۔ حضرت اپنے اصول وضابط کے لحاظ سے بیعت کے معاملہ میں کسی سعی وسفارش کو کیسے قبول کرتے۔ اور مولانا کو جواب دیا کہ نہیں، ان لوگوں کے خیالات کی نوعیت کے لحاظ سے آپ ہی ان کے لیے موزوں ہیں۔ مولانا نے کچھ اور اصرار کیا اور ازراہ انکسار

اپنے کو اس منصب کا نا اہل بتایا۔ مگر حضرت کی مدلل گفتگو کے آگے کون پیش پا سکتا تھا۔ آخر ہم لوگ دیو بند واپس آئے، اور یہاں مولانا نے تخلیہ میں لے جا کر ہم دونوں کو بیعت کرلیا۔"[1]

لیکن بیعت وارادت کے سلسلہ میں مولانا شیخ یا مرشد کے اتباع کامل کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ برابر اپنی تحریروں اور نجی گفتگو میں کہا کرتے تھے کہ شیخ کو درجہ معصومیت پر پہنچا دینا زیادتی کی بات ہے۔ چنانچہ کچھ معاملات میں انھوں نے اپنے مرشد مولانا حسین احمد مدنی اور اپنے روحانی پیشوا مولانا اشرف علی تھانوی سے بھی مکمل اختلاف کیا۔

عادات واطوار اور معمولات

مولانا عبدالماجد دریابادی کی شخصیت میں ترتیب و تنظیم، پابندی اوقات، اعتدال و توازن کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ مولانا فکری اعتبار سے معروضی، سائنسی، مزاج کے حامل تھے۔ اسی وجہ سے فضولیات ولغویات میں انھوں نے اپنا قیمتی وقت ضائع نہ کیا۔ مولانا نے اپنے لیے ایک ٹائم ٹیبل بنالیا تھا، اور پوری زندگی اس پر سختی سے عمل کرتے رہے۔ وقت کی پابندی کا یہ عالم تھا، کہ عبادت وریاضت، علمی وادبی کاموں کی طرح کھانے پینے، لوگوں سے ملنے جلنے اور یہاں تک کہ زنانہ مکان میں جانے کا بھی وقت مقرر کر رکھا تھا۔ اس قدر منظّم اور وقت کے پابند انسان ہندوستان میں سازو نادر ہی ہوتے ہیں۔ اس معاملہ میں انھوں نے حضرت اشرف علی تھانوی کو اپنا مثالی رہنما بنایا تھا۔ عمر کے اخیر حصہ میں اعضاء وجوارح کے کمزور ہونے کے باوجود بھی مولانا اپنے معمولات پر عمل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ وہ اپنے معمولات میں، سفر ہو یا حضر ہمیشہ پابند رہے۔ مولانا کی مخصوص عادت یہ بھی تھی کہ کسی شخصیت سے ملنے سے پہلے اسے اطلاع ضرور کر دیا کرتے تھے۔

انضباط وقت ہی کا کرشمہ تھا کہ انھوں نے انگریزی اور اردو میں ترجمہ وتفسیر قرآن کا عظیم الشان کام کیا، اور ۵۰ سے زائد کتابیں لکھ ڈالیں۔ لاکھوں خطوط، پیام مضامین، تحریرئے، بہت سی جگہوں کا سفر کیا، اور اپنی اعتدال پسندی ومرنجان مرنج رویہ سے سب طبقوں میں ہر دلعزیز رہے، اور قابل احترام سمجھے گئے۔ گھڑی کی سوئیوں کی طرح ان کے کام کی رفتار بھی متعین رہتی تھی۔ وقت ضائع کرنے کو وہ جرم عظیم تصور

---

[1] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۲۶۹۔۲۷۰

کرتے تھے۔ چنانچہ وہ دوپہر کا کھانا وقت بچانے کے لیے نہیں کھاتے تھے۔ کہ علمی مشاغل میں خلل واقع نہ ہو، اس کی جگہ ہلکا ناشتہ کرتے تھے۔

مولانا کے مزاج میں غصہ تھا، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس غصہ میں کمی واعتدال پیدا ہوگیا تھا۔ خاص کر مولانا اشرف علی تھانوی کی حکیمانہ نصیحتوں اور تربیت سے اس پر قابو پا لیا تھا۔

> ''خلقۃً میں بڑا غصہ ور تھا اور اس وقت بجائے اس کے کہ کوئی مخلص ملامت یا نصیحت کرتا، الٹی اس کی داد ملتی تھی اور ذکر تحسین سے کیا جاتا، اب بھی غصہ ور ہوں تو اللہ کے فضل سے اور حضرت تھانوی کے فیض صحبت سے اس کی کیفیت اور کمیت دونوں میں بہت کمی آگئی ہے۔''[1]

مولانا ماجد صاحب غیبت اور چغلی سے اجتناب کرتے تھے۔ جن باتوں میں غیبت کا شائبہ ہو اس کو فوراً روک دیتے تھے۔ چاپلوسی اور خوشامد کو کبھی پسند نہ کرتے تھے۔ لذیذ اور عمدہ کھانوں کے شوقین تھے۔ ان کے مرغوب کھانوں میں مرغ، مچھلی، انڈا، گوشت، پلاؤ، بالائی و پنیر، وغیرہ شامل تھے۔ موسمی سبزیوں اور پھلوں کو بھی شوق سے کھاتے تھے۔ مٹھائی سے بھی رغبت تھی۔ اس لیے ان کے گھر میں لذیذ حلوے وغیرہ بنتے رہتے تھے، اور ان کی اہلیہ اور لڑکیاں بنانے میں خاصی دلچسپی لیتی تھیں۔ لیکن اس معاملہ میں وہ اسراف کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ اور زندگی کے ہر شعبہ میں اعتدال، توازن اور کفایت شعاری کو ملحوظ رکھتے تھے۔ ان کا قول اور عمل یہ تھا کہ زندگی آرام سے اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق کی ادئیگی کے ساتھ اپنی حد کے اندر رہ کر گذارنا چاہیے۔ اس لیے وہ عیش و تکلف کو ناپسند کرتے تھے۔

مولانا کو عمدہ اشعار پسند تھے۔ ایک زمانہ میں قوالی دلچسپی سے سنتے تھے۔ اچھی آواز اور ترنم کو سن کر کبھی کبھی ان پر وجد کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ چیزیں ختم ہوگئیں۔ شعر و ادب اور تنقید سے بڑی دلچسپی تھی۔ اور اس لحاظ سے ان کا شمار اپنے زمانہ کے معتبر نقادوں اور سخن سنجوں میں ہوتا تھا۔

سفر کرنے کا بہت شوق تھا۔ انتہائی مصروف و منظم زندگی گذارنے کے باوجود سفر کے لیے وقت نکال لیا کرتے تھے۔ انھوں نے بیرون ممالک کے تین سفر کیے۔ ایک بار حج بیت اللہ اور دوبار پاکستان، ملک کے مختلف سفر مثلاً دہلی، علی گڑھ، حیدرآباد، بھوپال، کلکتہ، بمبئی، اعظم گڑھ وغیرہ کا سفر مختلف

---

[1] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۳۵۱

ضرورتوں سے کیا۔ وہ سفر کومختلف تجربوں کی وجہ سے بہت مفید سمجھتے تھے۔

مولانا ماجد کی شخصیت میں اعتدال وتوازن تھا۔ وہ اپنے دوست کی کمیوں کو ناپسند اور دشمنوں کی خوبیوں کو پسند کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ وہ جن شخصیات کوعظمت وتقدس کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ ان کی کمزوریوں کو بھی کھلے دل سے کہنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ مثلاً مولانا اشرف علی تھانوی سے محبت وعقیدت کے باوجود ان کی تفسیر کے متعلق یہ رائے اس کی عمدہ مثال ہے۔

''حضرت تھانوی کی انتہائی عظمت کے باوجود میرا یہ عقیدہ نہیں کہ ان کی تفسیر کا ہر لفظ قرآن کے متعلق آخری لفظ ہے''[۱]

صاف گوئی اور جرات مولانا ماجد کا شعار تھا۔ وہ بلا کسی خوف وتردد کے جس بات کو درست جانتے تھے اسی کو درست کہتے تھے۔ ذاتی پسند وناپسند کی بنیاد پر فیصلے نہیں کیا کرتے تھے۔ مولانا کی شخصیت کا ایک اہم وصف یہ بھی ہے، کہ وہ تشنگان علوم کو کبھی محروم نہیں کرتے تھے۔ بے شمار تحقیقی کام کرنے والوں کو تشفی بخش جواب اپنی مصروفیت کے باوجود فراہم کر دیا کرتے تھے۔

مولانا مجلسی آدمی نہ تھے۔ پبلک اجتماعات، جلسے، جلوسوں سے گھبراتے اور گریز کرتے تھے۔ عام مجلسوں میں وہ مرقع وقار بنے رہتے تھے۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز نہ تھا کہ وہ مردم بیزار اور خشک مزاج انسان تھے۔ نجی صحبتوں اور محفلوں میں وہ کھل کر بات چیت کرتے، اور ان کی گفتگو میں رعایت لفظی، ضلع جگت وشستہ اور بے ضرر ظرافت کے نمونے خوب سننے میں آتے تھے۔ مولانا کے مذہبی مسلک عادات واطوار کے متعلق ان کے بھتیجے اور داماد عبدالعلیم قدوائی صاحب لکھتے ہیں۔

''مسلک کے اعتبار سے حنفی تھے اور رجحان دیوبندی خیالات کی طرف تھا، لیکن دوسرے مسلکوں کے ساتھ توسع اور رواداری برتتے تھے یہاں تک کہ جن فرقوں کو گمراہ سمجھا جاتا ہے مثلاً احمدی، قادیانی، شیعہ یا بوہرہ ان کی بعض خوبیوں اور قوت عمل کی داد دینے میں بخل نہ کرتے تھے اور اتحاد بین المسلمین کے دل سے خواہاں تھے۔ مخالفت صرف اصولی بنا پر کرتے، ذاتی وشخصی تعریض واستہزا سے متنفر رہتے تھے۔ ان کا عمل ما قال پر رہتا تھا نہ کہ من قال پر۔ ان کے

---

[۱] رقعات ماجدی: مرتبہ غلام احمد حیدر آبادی: ص ۳۵

دوست، مخلص اور عقیدت مند بہت تھے اور مخالف بھی اچھے خاصے تھے لیکن وہ تحزب یا عصبیت سے کوسوں دور رہتے تھے۔نجی محفلوں اور بے تکلف دوستوں اور عزیزوں میں خوب باتیں کرتے، بذلہ سنجی، بے ضرر ظرافت موقع کی مناسبت سے برجستہ اشعار مصرعوں کے استعمال میں انھیں ملکہ حاصل تھا۔...خودداری اور عزت نفس کا خیال، تواضع اور خاکساری میں ان کا درجہ بہت بڑھا ہوا تھا اور وہ اپنے اصولوں پر کسی قیمت کے لیے مفاہمت پر تیار نہیں ہوتے تھے۔"[۱]

مولانا اپنے سے چھوٹے لوگوں کی حوصلہ افزائی کرنے، اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارنے میں بڑی فراخ دلی کا ثبوت دیتے تھے۔مولانا کتابوں کے مطالعہ کے اتنے عادی ہو گئے تھے، کہ یہ عادت ایک طرح کا نشہ بن چکی تھی۔ وہ ہمہ وقت مطالعہ میں مصروف رہتے تھے، اور انھوں نے پوری زندگی علم کے جویا اور حریص بن کر گزاردی۔دشمنوں اور چھوٹوں سے بھی کچھ سیکھنے میں وہ کبھی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔وہ اپنے کو آخر تک طالب علم قرار دیتے رہے، اور جس سے ملتے اس سے کچھ نہ کچھ سیکھنے یا حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔

وضع داری، حلم، شرافت وغیرہ ان کی شخصیت کے اہم اوصاف ہیں۔وہ تعلقات بنانے اور نبھانے دونوں کا ہنر جانتے تھے۔مہمان نوازی بھی ان کے مزاج کا اہم حصہ تھی۔غرور وانانیت سے ان کی شخصیت پاک تھی۔ان کے مزاج میں چونکہ سنجیدگی اور متانت تھی اور وہ کسی کا رعب واثر قبول نہیں کرتے تھے، اسی لیے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ ان کے مزاج میں تکبر، انانیت ہے مگر یہ بات تمام تر غلط اور بے بنیاد ہے۔

وہ تحزب (پارٹی بندی) تعصب اور ہر قسم کے ابتذال و بازاریت کے سخت مخالف تھے اور انھوں نے ایک اچھے مسلمان، پکے ہندستانی اور اردو کے خادم کی حیثیت سے زندگی بسر کی اور اپنی محنت اور لگن سے دنیائے ادب میں ایک ممتاز و معتبر درجہ حاصل کیا۔

آخری علالت اور انتقال

وسط مارچ ۱۹۷۴ء میں عبدالماجد دریابادی پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ آخری عمر تک صحت یاب نہ ہو سکے۔علاج معالجہ سے تھوڑا بہت افاقہ ہوا، مگر اس بیماری نے ان کی صحت پر گہرا اثر چھوڑا یہاں تک کہ

۱؎ مولانا عبدالماجد دریابادی حیات وخدمات: عبدالعلیم قدوائی: ص: ۵۶-۶۰

انھیں لکھنے پڑھنے میں تکان محسوس ہونے لگی، اور یادداشت اور بصارت بھی متاثر ہوئی جس کی وجہ سے ان کی علمی وادبی مصروفیات رفتہ رفتہ ختم ہوگئی۔ پھر بھی وہ اپنے اخبار 'صدق جدید' کے لیے برابر کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ اس دور کی ان کی مختصر تحریریں اور خطوط بہت کم ہیں اور وہ بڑی مشکل سے پڑھے جاسکتے ہیں۔ ان کی آنکھیں فالج کے حملے سے متاثر ہوچکی تھیں خصوصاً دائیں آنکھ۔ جنوری ۱۹۷۶ء میں لکھنو میں اس کا آپریشن ہوا جو کامیاب رہا۔ وسط اکتوبر ۱۹۷۶ء میں لکھنو میں اپنی قیام گاہ 'خاتون منزل' میں رات کو کوٹھے پر سے گر پڑے جس کی وجہ سے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس حادثہ نے ان کی صحت پر اور برا اثر ڈالا۔ اسی روز سے وہ مستقل طور پر صاحب فراش ہوگئے، اور ان کی زندگی ایک کمرہ بلکہ ایک تختِ تک محدود رہ گئی۔ انتقال سے تقریباً ایک ہفتہ قبل دنیوی امور سے تعلق بالکل منقطع ہوگیا تھا۔ لکھنا پڑھنا بالکل چھوٹ گیا تھا۔ زیادہ تر غافل رہتے تھے۔ لیکن نمازوں کے وقت اکثر ہوشیار ہوجاتے تھے۔ اور ہاتھ کان تک اٹھا کر پھر نیچے لاکر نماز کی نیت باندھ لیتے۔ یہ کیفیت وفات سے کچھ قبل تک رہی۔ بالآخر ۶ جنوری ۱۹۷۷ء کو علی الصبح سوا چار بجے بمقام خاتون منزل لکھنو میں انتقال ہوگیا۔ نماز جنازہ ان کی وصیت کے مطابق ندوۃ العلماء میں مولانا ابوالحسن ندوی صاحب نے پڑھائی۔ اس کے بعد جنازہ دریاباد لے جایا گیا جہاں ان کے مکان کے متصل حضرت مخدوم آبکش کے مزار کے قریب تدفین ہوئی، ان کے فرمانے کے مطابق ان کی قبر پر یہ کتبہ "ایک کلمہ گو جو تائب ہوکر مرا" اور دو قرآنی آیات بھی لکھی گئی ہے۔ مولانا کی علالت اور انتقال کے متعلق عبدالعلیم قدوائی لکھتے ہیں۔

"۱۴ مارچ ۱۹۷۴ء جب ان کی عمر تقریباً ۸۲ برس کی ہوچکی تھی دریاباد میں فالج کا ہلکا حملہ ہوا جس کا پہلے ڈاکٹری علاج چلتا رہا پھر ہومیوپیتھی علاج سے مرض کی شدت میں تخفیف ہوئی، داہنے پیر کے نچلے حصہ پر اثر تھا نیز نسیان بڑھ گیا تھا پھر بھی دریاباد سے لکھنو کے سفر ہوتے رہے، ..... اکتوبر ۱۹۷۶ء میں مستقل قیام کے لیے لکھنو آئے اور وہیں گر جانے کی وجہ سے کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی، اس صدمہ نے ان کی صحت پر برا اثر ڈالا۔ ایک ہڈی کے ماہر نے فوراً ہی پلاسٹر چڑھا دیا مگر اس وقت سے وفات تک تقریباً تین ماہ تک مولانا کی زندگی

ایک کمرہ کے ایک چوبی تخت تک محدود ہو کر رہ گئی۔.....صدق جدید میں ضعف بصارت اور عام اضمحلال کی وجہ سے ۱۹۷۴ء میں لکھنا بہت کم ہو گیا تھا اور پرچہ کی ترتیب اور اشاعت کی ساری ذمہ داری برادر محترم حکیم عبدالقوی صاحب نے سنبھال لی تھی۔.....روزانہ عصر کے بعد ملنے والے آتے تھے اور ان سے مختصر بات چیت رہتی تھی۔لڑکیاں، بھتیجے اور دوسرے عزیز بھی برابر ان کے پاس آتے رہتے اور ان کی معذوری پر دلی رنج و افسوس کرتے۔آخر دسمبر ۱۹۷۶ء میں غالباً فالج کا نیا حملہ ہوا جس کی وجہ سے وہ زیادہ تر غافل رہنے لگے اور گفتگو بھی بہت کم کر پاتے تھے اور زیادہ تر سننے والوں کی سمجھ میں نہ آتے۔.....آخری الفاظ جو زبان سے نکلے وہ یا اللہ اور خدا حافظ تھے۔انتقال سے کئی روز قبل موجود بھتیجوں اور عزیزوں سے کہا کہ ہمارا جی چاہتا ہے کہ نماز جنازہ علی میاں پڑھائیں اور تدفین دریاباد میں ہو مگر اس کے لیے کوئی زحمت نہ اٹھانا، جہاں بھی اور جو بھی آسانی سے انتظام ہو سکے وہی کر لینا۔

جمعرات ۶ جنوری ۱۹۷۷ء کو سوا چار بجے صبح مولانا سفر آخرت پر روانہ ہو گئے ’**انا للہ وانا الیہ راجعون**‘ جس کے وہ مشتاق تھے اور صحت کی حالت میں بار بار ذکر فرمایا کرتے تھے۔غسل مولانا ہاشم فرنگی محلی اور دیگر اعزہ نے دیا۔...مولانا علی میاں صاحب مرحوم رائے بریلی میں تھے وہاں سے فوراً لکھنو آئے۔جنازہ ندوۃ العلماء لے جایا گیا جہاں کی مسجد کے سامنے بعد ظہر ایک عظیم مجمع میں نماز جنازہ ان کی وصیت کے مطابق مولانا علی میاں مرحوم نے پڑھائی، پھر جنازہ لاری میں دریاباد لے جایا گیا،.....جنازہ دریاباد مغرب کے وقت پہنچا، پورا قصبہ سوگوار نظر آرہا تھا، تمام دکانیں بند تھیں، مسلمانوں کے دوش بدوش غیر مسلم بھی آنسو بہا رہے تھے۔دوسری نماز جنازہ قصبہ کے مڈل اسکول میں بڑے مجمع میں دریاباد کے بزرگ حافظ غلام نبی صاحب نے پڑھائی۔قبر کی جگہ مکان سے متصل مخدوم

آبکش صاحب کی درگاہ میں واقع تھی۔ زبردست ہجوم کی وجہ سے درگاہ کی دیوار کو توڑ کر عشاء کے وقت تدفین عمل میں آئی۔

اس طرح ۸۵ سال کی عمر میں مفسر قرآن، خادم اسلام، صاحب طرز ادیب، انشاپرداز، باکمال صحافی اور مصلح کی نوسوتی زندگی ختم ہوئی۔ قبر کچی رکھی گئی، اوپر ٹین کا سائبان اور کتبہ پر حسب وصیت یہ عبارت لکھی گئی ''ایک کلمہ گو جو تائب ہو کر مرا'' نیز یہ دو آیات قرآنی بھی لکھی گئی ہیں۔

''وربک الغفور ذوالرحمة''، ''قل یاعبادی الذین اسرفوا علی انفسهم لا تقنطوا من رحمة الله ۵ ان الله یغفر الزنوب جمیعا انه هو الغفور الرحیم''[1]

مولانا ماجد دریابادی کے انتقال کے بعد ہندوپاک کے انگریزی اردو اخباروں اور رسالوں میں ان کے موت کی اطلاع، تعزیتی اداریے بہت دنوں تک شائع ہوتے رہے۔ کئی اخباروں رسالوں نے خاص نمبر نکالے۔ بہت سے دینی علمی اور ادبی اداروں میں تعزیتی جلسے بھی پیش کیے گئے۔ مثلاً مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ندوۃ العلماء لکھنو، دارالعلوم دیوبند، دارالمصنفین اعظم گڑھ، اردو اکیڈمی حیدرآباد، وغیرہ۔ بہت سے لوگوں نے تاریخ کہی۔ عبدالعلیم قدوائی صاحب نے مولانا کی وفات پر کہی گئی تاریخوں، مولانا کے ذاتی کتب، اوران کی وراثت کے متعلق اپنی کتاب 'مولانا عبدالماجد دریابادی حیات خدمات' میں تفصیل سے کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''سری نگر (کشمیر) کے ایک صاحب علم میر غلام نازکی نے آیہ قرآن '**ورفعنا لك ذكرك**' سے ہجری تاریخ وفات ۱۳۹۷ھ نکالی۔ دہلی یونیورسٹی کے استاد اردو مغیث الدین فرید نے قطعہ کہا

تاریخ رحلت بے ہنگام (۱۹۷۷ء)

مولانا کے ہم وطن اور خوش گو شاعر رہبر تابانی دریابادی نے اس شعر سے نکالی۔

---

[1] مولانا عبدالماجد دریابادی حیات وخدمات: عبدالعلیم قدوائی: ص: ۶۳۔۶۴۔۶۵

افسوس تہ خاک ہے آرام پذیر
وہ محرم لیلائے سخن نکتہ شناس (۱۹۷۷ء)

مولانا مرحوم کے ذاتی کتب خانے میں تقریبا بارہ تیرہ ہزار کتابیں اردو، انگریزی، عربی اور فارسی کی موجود تھیں جس میں بہت سی قیمتی اور نایاب کتابیں بھی تھیں چنانچہ اپنی زندگی ہی میں انھوں نے انگریزی کی کتابیں دارالعلوم ندوۃ العلماء کی شبلی لائبریری اور اردو فارسی عربی کی کتابیں مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی کو اپنی زندگی ہی میں دے دی تھیں تاکہ وہ محفوظ رہیں اور ان سے تحقیق واستفادہ ہوتا رہے۔....دریاباد میں جس مکان میں مولانا رہتے تھے اسے ان کے وارثوں نے آپس میں مشورہ کر کے ندوۃ العلماء کو دینی تعلیم خصوصا حفظ قرآن کے لیے مدرسہ معین الاسلام قائم کرنے کے لیے دے دیا ہے جو الحمدللہ بڑی کامیابی سے چل رہا ہے۔''[۱]

---

[۱] مولانا عبدالماجد دریابادی حیات وخدمات :عبدالعلیم قدوائی :ص:٦٦۔٦٧

باب۔دوم

عبدالماجد دریابادی اور تخلیقی ادب (بطور شاعر اور ڈرامہ نگار)

باب دوم

عبدالماجد دریابادی اور تخلیقی ادب

بطور شاعر اور ڈرامہ نگار

مولانا ماجد دریابادی کا تخلیقی ذہن بہت بالیدہ تھا۔ خدا نے ان کو بہت سی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ تمام علمی تصانیف کے ساتھ ساتھ انھوں نے شعر وسخن میں بھی اپنی تخلیقی صلاحیت کا جوہر دکھایا ہے۔ مولانا کا یہ شعری سفر مشقی دور تک ہی محدود رہا۔ گر چہ مولانا کو خوش نصیبی سے لسان العصر جناب اکبرالہ آبادی کی سرپرستی وشفقت حاصل تھی، پھر بھی انھوں نے اس کوچے میں اپنی زندگی کے قیمتی اوقات کو صرف نہیں کیا، بلکہ شعر و سخن کے اسرار ورموز سے آگاہی حاصل کرنے اور اکبرالہ آبادی جیسے مشہور زمانہ استاد سے اصلاح لینے کے باوجود بھی انھوں نے شعر وسخن کی راہوں کو الوداع کہا۔ مولانا ماجد کا جتنا بھی کلام ہے 'تغزل ماجدی' کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ اگر ان کا مطالعہ صدق دل اور غیر جانب داری سے اپنے ذہن میں یہ رکھتے ہوئے کیا جائے، کہ یہ ایک نوآموز اور مشقی دور سے گذرنے والے شاعر کا کلام ہے، تو مولانا ماجد کے کلام میں فکری اور فنی لوازمات اور شعری محاسن کی آمیزش کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔

مولانا کے یہ اشعار ان کی خداداد صلاحیت اور شعر وسخن سے ان کی دلچسپی کے ترجمان ہیں۔ مولانا کے کلام کو فنی نقطہ نظر سے تو ہم بہت اعلی وارفع نہیں کہہ سکتے، پھر بھی ان کے کلام کو کلی طور پر ہم نظر انداز بھی نہیں کر سکتے۔ ان اشعار کی سب سے بڑی اہمیت تو یہی ہے کہ ان کی بدولت ہمارا تعارف مولانا ماجد کے بجائے شاعر ماجد سے ہوتا ہے۔ مولانا ماجد چونکہ صاحب طرز انشا پرداز تھے، اس لیے بھی ان اشعار کی تاریخی نقطہ نظر سے بڑی اہمیت ہے، کہ ایک بڑے نثر نگار کے قلم سے نکلے ہوئے یہ اشعار ہماری ادبی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں۔

شاعری کی طرح مولانا ماجد نے صنف ڈرامہ میں بھی اپنی ایک اہم یادگار چھوڑی ہے۔ مولانا نے اپنے دور الحاد میں دوران سفر قلم برداشتہ ایک ڈرامہ بعنوان 'زود پشیماں' لکھ ڈالا۔ جس کی فنی وادبی اعتبار سے خاصی اہمیت ہے، گر چہ اس ڈرامے کو مفسر قرآن مولانا ماجد اپنے لیے باعث فخر نہ سمجھتے تھے، اور شاید اسی لیے

اس ڈرامہ کو اپنے قلمی نام ناظرؔ کے نام سے شائع کرایا۔ بعد میں بھی لوگوں کے اصرار کے باوجود اس کو اسٹیج کرانے یا دوبارہ شائع کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ یہ ڈرامہ ایک المیہ ڈرامہ ہے۔ موضوع اور مواد کے اعتبار سے بھی اس میں کوئی جدت نہیں ہے۔ معمولی ردوبدل کے بعد ڈرامہ اسٹیج کیے جانے کے لائق ہو سکتا ہے۔ 'زود پشیماں' کے علاوہ بھی مولانا نے 'بدسرشت' کے نام سے ایک نامکمل ڈرامہ لکھا تھا۔ یہ دونوں ڈرامے اب دستیاب نہیں ہیں۔ مذہب کی طرف واپسی کے بعد مولانا نے اس صَنف پر کبھی توجہ نہیں کی۔

عبدالماجد دریابادی بحیثیت شاعر

مولانا ماجد دریابادی کے وسیع اور متنوع نثری کارناموں کے مقابلہ میں ان کا شعری کارنامہ روایتی و معمولی سطح کا ہے۔ لیکن ان کے اس کارنامے کی اہمیت اس لیے زیادہ ہے، کہ یہ ایک صاحب طرز انشاپرداز کے نوک قلم سے نکلے ہوئے اشعار ہیں۔ مولانا ماجد کا شعری سرمایہ بہت مختصر ہے، لیکن ان کی یہ کاوش قابل التفات ہے۔ ان اشعار میں سادگی، شگفتگی اور لطیف جذبات کا اظہار بڑے موثر انداز میں کیا گیا ہے۔ مولانا ماجد کو بچپن سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ شعری ذوق اور شعر و سخن سے اپنی وابستگی کا اظہار مولانا نے اپنی سوانح میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ''شاعری کہیئے یا تک بندی اس کا تھوڑا بہت خبط بچپن ہی سے سر میں سمایا ہوا تھا، ٹوٹے پھوٹے شعر جو ادھر ادھر کہیں سن پاتا، یا کہیں پڑھ لیتا، بس اکثر ہی یاد ہو جاتے اور انھیں موقع بے موقع پڑھ کر سنایا کرتا! نو دس سال کا سن ہوگا کہ گھریلو تعلیم کے لیے جو مولوی صاحب رہتے تھے، انھوں نے ایک ننھے منے سے مشاعرہ کی طرح ڈالی ایک چپراسی کو پکڑ کر وحشتؔ بنا دیا، دوسرے سپاہی کو تخلص دہشتؔ عنایت کیا، اور کچھ تخلص میرا بھی رکھ دیا، خود ہی الٹی سیدھی نظمیں ہم سب کی طرف سے کہہ دیتے، اور ان تک بندیوں میں جو سب سے بہتر ہوتی، وہ مجھ سے پڑھوا دیتے، میں خوب کڑک کر اسے پڑھ دیتا۔''[1]

مولانا اپنے سن شعور ہی سے دیوان حالی کی سادگی و شیرینی سے متعارف ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ معاصر ادبی رسائل و جرائد سے بھی استفادہ کرتے رہے، اور اپنے شعری ذوق کو توانائی بخشتے رہے۔ ان کے

---

[1] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۳۱۸

مطالعہ میں ریاض الاخبار گلچیں، اردوئے معلیٰ وغیرہ تھے۔ مولانا ماجد میں تنقیدی فہم وبصیرت حسرت موہانی کے ادبی رسالہ اردوئے معلیٰ علی گڑھ کے مطالعہ سے پیدا ہوئی۔ اسی زمانے میں انھوں نے غالبؔ، امیر مینائیؔ، داغؔ وغیرہ کے کلام سے آگاہی حاصل کی، اور اپنے معاصر شعرا اقبالؔ، حسرتؔ وغیرہ سے بھی متعارف ہو گئے تھے۔ ان کا بچپن سیتاپور میں گذرا جہاں پر شیعوں کی آبادی بھی تھی، اور ان کے یہاں مذہبی محفلوں کا انعقاد بکثرت ہوتا تھا۔ مولانا کو ان محفلوں کی بدولت مراثی، سلام، نوح وغیرہ سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ مولانا کا شعری ذوق چونکہ بچپن ہی سے نکھرا ہوا تھا، اسی وجہ سے مراثی، سلام، غزل وغیرہ کے بہت سے اشعار ان کے ذہن نشیں ہو گئے تھے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ''.....کلام حالی سے تھوڑی بہت مناسبت اسی زمانے سے ہو گئی، ریاض الاخبار میں دو ایک سال بعد جو ردو قدح اس کلام کی شائع ہوئی وہ بھی پڑھتا رہا، گو اس سن میں سمجھا خاک نہیں۔ سن ذرا اور کھسکا تو گلچیں نامی ایک گلدستہ جو وسیم خیر آبادی نکالتے تھے وہ بھی پڑھنے لگا اور اسکول میں داخل ہونے کے بعد غالب، امیر، داغ کے نام سے خوب مانوس ہو گیا اور معاصرین میں اقبال و حسرت موہانی کے نام سے بھی کان خوب آشنا ہو گئے، حسرت کا ماہنامہ اردوئے معلیٰ علی گڑھ سے نکلنا شروع ہوا تھا، اسے بھی دیکھنے لگا۔ اسے پڑھ کر کچھ معنی تنقید کے سمجھ میں آنے لگے۔ یاد ہے کہ جس مضمون میں کسی شاعر کے کلام پر اعتراض ہوتا، وہ پڑھ کر بڑا خوش ہوتا۔ لڑکپن کا زمانہ سیتاپور میں گذرا، وہاں شیعہ آبادی کثرت سے تھی، ان کی مجلس سننے کا بار بار اتفاق ہوا، اس سے طبیعت مرثیہ گوئی کی طرف تو نہیں، البتہ اس سلسلہ کی دوسری چیزوں، سلام، رباعیوں، وغیرہ کی طرف مائل ہوئی اور کچھ نہ کچھ کوشش بھی بچکانہ معیار پر اس رنگ میں کہنے کی کر ڈالی۔ شعر تو کثرت سے یاد ہو گئے تھے اور بیت بازی کا رواج اس وقت عام تھا، جس طرف میں ہوتا، اکثر وہی فریق جیتتا۔''[1]

مولانا ماجد دریابادی نے جب لکھنؤ کالج میں داخلہ لیا۔ اس زمانہ میں لکھنؤ شہر سخن ہوا کرتا

---

[1] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۳۱۸۔۳۱۹

تھا۔ ہر عام وخاص کی زبان پر اشعار ہوتے تھے۔ شعری محفلیں، مشاعرے، ادبی محفلیں اور مناظروں کا عام چلن تھا۔ لکھنو کی پوری تہذیب شعروسخن، غزل ونغمہ سے عبارت تھی۔ دبستان لکھنو کی شعری عظمت کا اعتراف پورے ملک میں کیا جارہا تھا۔ اس خاص ادبی ماحول میں مولانا نے شرر اور چکبست کے تاریخی معرکوں کا بھی مشاہدہ کیا، اور دوسری تمام ادبی وشعری سرگرمیوں میں شریک رہے، اور انھوں نے خود بھی طبع آزمائی شروع کردی۔ چونکہ آپ کی طبیعت پہلے ہی سے موزوں طبع تھی اشعار کا اچھا خاصہ ذخیرہ آپ کے ذہن میں محفوظ تھا۔ اسی نومشقی دور میں ہی انھوں نے ایک صاحب کی ہجو کہہ ڈالی۔ چنانچہ اس کا ذکر 'آپ بیتی' میں اس طرح کیا ہے۔

''کالج میں پڑھنے جب لکھنو آیا، اور عمر اب سولہ سال کی تھی، تو قدرۃً یہ رنگ اب اور چمک گیا، اور شعری مناظروں سے بڑی دلچسپی ہوگئی (مثلا معرکہ 'چکبست وشرر' سے) کلاس میں ایک صاحب سے کچھ نوک جھونک ہوگئی، اور ان کی ہجو میں ایک پوری نظم کہہ ڈالی۔ وہی غلط در غلط قسم کی، اور لفظ ومعنی دونوں کا خون کرتی ہوئی ہلکی سی جھلک اس کی ملاحظہ ہو، پہلے شعر میں اصل نام کے بجائے صرف اس کا وزن درج ہورہا ہے:۔

ایک صاحب 'مفاعلن تھا نام ان کا
تھے وہ کالج میں بہت مشہور عام
جس طرف سے ان کا ہوتا تھا گزر
لوگ کرتے تھے ان کو جھک جھک کر سلام
کوئی کہتا (آگے کا مصرع یادنہیں پڑتا)
ہم کھلائیں گے تمھیں املی اور آم

آخر میں دکھایا یہ تھا کہ یہ صاحب دلال قسم کے ہیں، اور اسی لیے ان کی بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے۔''[1]

کالج کے زمانے میں ہی مولانا کو اکبر الہ آبادی کی صحبت نصیب ہوئی، اور علامہ شبلی نعمانی جیسی

---

[1] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۳۱۹۔۳۲۰

عبقری و عظیم شخصیت کے زیر سایہ ان کے شعری ذوق کو تقویت ملی۔ مولانا ماجد اگر اپنی توجہ شعر و سخن میں صرف کرتے تو فکر و فن کی بلندیوں پر یقیناً فائز ہوتے۔ اکبر الہ آبادی اور شبلی نعمانی کی شخصیت سے فیضیاب ہونے کا ذکر انھوں نے 'آپ بیتی' میں کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

''ذہن کو پہلے تو کلام اکبر نے اپنی طرف ملتفت کیا، اور پھر سال ڈیڑھ سال بعد رسائی مولانا شبلی کی مجلس میں ہوگئی، اور حاضری اس دربار میں پابندی سے ہونے لگی، اس صحبت نے بڑا کام کیا۔ مولانا کے اور کمالات جو تھے، وہ تو تھے ہی، میری نظر میں ان کا شاید سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ وہ شعر کے مبصر اعلی درجہ کے تھے، میں یہ کیا کرتا، کہ جو شعر ادھر ادھر سے کان میں پڑ جاتا، اسے کسی طرح مولانا کو ضرور سنا دیتا، انھوں نے اگر اسے پسند فرمالیا، تو بس بڑی سند ہاتھ آجاتی اور اگر انھوں نے داد نہ دی تو وہ میری نظر سے بھی گر جاتا۔ غرض جس طرح نثر نویسی میں میں نے مولانا کے مقالوں اور کتابوں سے جی بھر کر استفادہ کیا، اسی طرح سخن فہمی میں تھوڑی بہت جو تمیز حاصل ہوئی، وہ مصنف شعر العجم اور موازنہ انیس و دبیر کی حاشیہ نشینی سے۔ مولانا کی عادت کبھی اس موضوع پر طویل گفتگو کی نہ تھی کوئی شعر پڑھ کر بس اس کی مختصر سی تشریح کر دیتے اور یہی بالکل کافی ہو جاتی۔ سارا مغز ان چند لفظوں کے اندر آ جاتا۔ مولانا کی وفات نومبر ۱۴ء میں ہوئی اور اس سے چند مہینے بیشتر وہ لکھنو بھی آچکے تھے اور اس کے بعد ہی میری نیاز مندی حضرت اکبر الہ آبادی سے بڑھی، اور اس نے سخن فہمی کی اور آگے کی منزلیں میری بساط کے لائق طے کرا دیں، شبلی اگر شعر کے ظاہر کے مبصر تھے اور اس کے ادبی حسن و صناعت کے، اس کے آرٹ کو پرکھنے والے، تو اکبر اس کے معنی کے مصور تھے، اس کے جمال معنوی کے روشن گر، اکبر کی زبان سے ان کے شعر سن کر پہلی بار یہ بات سمجھ میں آئی کہ شعر معنوی حیثیت سے کتنا بلند و پر معرفت ہو سکتا ہے، ان دونوں باکمالوں کا فیض اگر نہ شامل

ہو جاتا تو اپنا مذاق شعری خدا معلوم کتنا پست و ناقص رہ جاتا۔'' [۱]

۱۹۱۴ء میں مولانا کی غزل گوئی کا شوق اس وقت بام عروج تک پہنچ گیا، جب انھیں اپنی منسوبہ سے پاک محبت ہوگئی تھی۔ اس وقت انھوں نے عشقیہ شاعری کی جو غزل کی خصوصیت ہے۔ ان کے اشعار میں عشق و محبت کے حقیقی جذبہ کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ان کے اشعار سہل ممتنع کی مثال ہیں۔ انھوں نے استادوں کی غزلوں پر غزلیں کہنی شروع کردیں۔ اردو شاعروں میں انھیں سبھی سے قلبی محبت تھی۔ لیکن غالب کے وہ خاص طور پر معتقد تھے۔ مولانا ماجد نے مومن، حسرت، شیفتہ، داغ، ریاض وغیرہ کی تقلید میں شعر کہنے کی کوشش کی۔ اس سلسلہ میں وہ فرماتے ہیں۔

''۱۴ء ہی تھا کہ خود بھی غزل گوئی شروع کردی۔ تازہ و جائز عشق اپنی منگیتر سے پیدا ہو چکا تھا۔ اس نے محبت کے شاعرانہ جذبات کو پیدا کر دیا، اور میں دیکھتے ہی دیکھتے غزلوں پر غزلیں کہنے لگا، یوں معتقد تو میں اردو کے سب شاعروں سے بڑھ کر غالبؔ کا تھا مگر حوصلہ ان کے رنگ میں کہنے کا کبھی نہ ہوا، کچھ گری پڑی کوشش تقلید کی اگر کی تو مومنؔ اور حسرتؔ موہانی، شیفتہؔ و داغؔ، ریاضؔ و عزیز کی کی، اور غزلیں جو کہیں وہ زیادہ تر انھیں دونوں کی زمینوں میں۔'' [۲]

مولانا ماجد کے تعلقات لکھنو میں کئی مشہور شعرا سے تھے۔ لیکن شرمیلی طبیعت کی وجہ سے انھوں نے اپنے اشعار کا تذکرہ کسی سے بھی نہ کیا۔ لیکن اکبر الہ آبادی سے انھیں دلی وابستگی تھی، اور کسی قدر بے تکلفی بھی، اسی وجہ سے انھوں نے اپنی شاعری کا تذکرہ ان سے کیا، اور اپنے اشعار کی اصلاح بھی ان سے کرائی۔ اس اعتبار سے اکبر الہ آبادی مولانا کے استاد کہے جاسکتے ہیں۔ مولانا نے اس کا ذکر 'آپ بیتی' میں کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

''تعلقات لکھنو اور جوار لکھنو کے بعض مشہور شاعروں سے اچھے خاصے تھے، مثلاً ریاضؔ، حسرتؔ، عزیزؔ و ثاقبؔ سے، لیکن اپنے طبعی شرمیلے پن کا یہ عالم تھا کہ ان لوگوں کے سامنے کوئی شعر کیا پڑھتا، ان پر کبھی ظاہر ہی نہ ہونے دیا

۱۔ آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۳۲۰۔۳۲۱

۲۔ ایضا: ص: ۳۲۱

کہ میں بھی الٹی سیدھی قافیہ پیمائی کر لیتا ہوں۔ ہاں آخر میں حضرت اکبر سے ہیا ؤکھل گیا تھا، ان کی خدمت میں کبھی اپنی کوئی غزل اصلاح کی غرض سے بھیج دیتا، اکثر تو حضرت بس حوصلہ افزائی ہی کے کلمے لکھ کر انھیں واپس کر دیا کرتے تھے، اور کبھی ایک آدھ لفظ بدل دیتے، ایک بار ایک بات بڑی نکتہ کی لکھ بھیجی سب کے کام آنے والی، فرمایا کہ ''غزل کہہ کر بس رکھ لیا کیجیے اور کچھ دن بعد اسے اٹھا کر دیکھیے، تو خود ہی اپنے کلام کی خامیاں نظر آ جائیں گی۔''[۱]

خود حضرت اکبر الہ آبادی کو مولانا ماجد سے بڑی انسیت تھی۔ اور ان کو یقین کامل تھا کہ مولانا دلجمعی سے شعر وسخن کی فکر میں لگ جائیں، تو ایک کامیاب شاعر ہو سکتے ہیں۔ اسی یقین کی بنا پر اکبر الہ آبادی نے اپنے خطوط میں مولانا ماجد کو شاعری کی طرف توجہ کرنے کے لیے اصرار کیا ہے۔ ۴ ستمبر ۱۹۱۳ء کے خط میں انھوں نے مولانا ماجد کو شاعری کے مذاق سے بہرہ ور ہونے کی بات کی ہے، اور کہا ہے کہ آپ کو میں شاعری سے بے بہرہ کیسے سمجھوں، وہ لکھتے ہیں۔

''میں آپ کو مذاق شعر سے کس طرح بے بہرہ سمجھوں غالب کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ بہت دل آویز ہے۔''[۲]

مولانا ماجد نے مذکورہ خط پر ان الفاظ میں حاشیہ لکھا ہے کہ۔

''انڈین پریس الہ آباد نے ایک مشہور ماہنامہ 'ادیب' کے نام سے نکالا تھا۔ میرا ایک مضمون اس میں غالب کے فلسفہ پر نکلا تھا۔''

حکیم عبدالقوی صاحب مرحوم جو مولانا کے بھتیجے اور داماد بھی تھے۔ انھوں نے 'انشائے ماجدی' کے نام سے مولانا کے مضامین کا مجموعہ شائع کیا ہے، اس میں مذکورہ مضمون شامل ہے۔ مولانا کا یہ مضمون تنقیدی وادبی نقطہ نظر سے لاثانی ہے۔ مضمون کے مطالعہ سے ان کی فلسفیانہ فکر، استدلالی انداز اور تنقیدی نقطہ نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

اکبر الہ آبادی اسی طرح خطوط کے ذریعہ مولانا کو شاعری کی طرف رغبت دلاتے رہے۔ آخر کار ان کی یہ کوشش کامیاب ہوئی اور مولانا ماجد نے ۱۹۱۴ء میں غزلیں کہنی شروع کر دیں، اور اپنی پہلی غزل

۱۔ آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۳۲۱

۲۔ خطوط مشاہیر (حصہ اول): مرتب مولانا عبدالماجد دریابادی: ص ۴۶

اکبرالہ آبادی کی خدمت میں بغرض اصلاح بھیجی۔جس کے جواب میں اکبرالہ آبادی نے لکھا۔

''عزیزی وحبیبی سلمہ تعالی! مجھ کو حیرت ہوئی کہ آپ ایسے شعر کہہ سکتے ہیں۔جو رنگ سخن ظاہر ہوتا ہے۔وہ بہت پختہ ہے۔کیا کہنا چاہیے،اور کیوں کر کہنا چاہیے۔اول میں کوئی جگہ اعتراض کی نہیں ہے۔بلکہ آپ کی تقلید مناسب ہے۔دوم میں البتہ کہیں کہیں کچھ اصلاح کی ضرورت ہے۔بہرکیف میں آپ کی غزل دیکھ کر بہت خوش ہوا۔یہ شعر تو ہر اعتبار سے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔

رہی ہر چند عقل صبر آموز
نہ گئیں بے قراریاں نہ گئیں

کیا خوب ہے۔آپ انشا اللہ بڑی باطنی ترقیاں حاصل کریں گے۔''[1]

مذکورہ خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ غزل کئی اشعار پر مشتمل تھی۔لیکن بدقسمتی سے یہ غزل شاید حکیم عبدالقوی صاحب کو دستیاب نہ ہوسکی۔اسی وجہ سے یہ غزل ''تغزل ماجدی'' میں شامل نہیں ہے،مولانا نے خود مذکورہ غزل کو اپنی پہلی غزل کہا ہے۔جس کا تذکرہ ''خطوط مشاہیر'' کے حاشیہ میں کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

''۱۴ء سے میرا دور غزل گوئی شروع ہوتا ہے۔شادی سے دو سال قبل شروع ہوا اور شادی کے ڈیڑھ دو سال بعد تک رہا۔پہلی غزل ''زاریاں نہ گئیں''،''یاریاں نہ گئیں'' کہ زمین میں تھی۔یہی غزل اصلاح کے لیے حضرت اکبرالہ آبادی کی خدمت میں روانہ کی ہے۔حالانکہ طبیعت پر رنگ حسرت موہانی کا غالب تھا۔''

مولانا نے اپنی دوسری غزل جو اکبرالہ آبادی کی خدمت میں بغرض اصلاح بھیجی تھی۔اس کے جواب میں انھوں لکھا۔

''عزیزی وحبیبی سلمہ اللہ تعالی! آپ کی غزل دیکھ کر کم تعجب ہوا اور زیادہ خوشی ہوئی۔تعجب اس بات کا کہ ابتدا ہی میں ایسے کھرے شعر آپ کہنے لگے۔تعجب میں کمی اس لیے کہ اچھی فطری سمجھ اور علم نے آپ کی طبیعت کو معنی کا

---

[1] خطوط مشاہیر (حصہ اول): مرتب مولانا عبدالماجد دریابادی: ص ۶۳۔۶۴

عمدہ سانچا بنا دیا ہے۔ نقص وزیادت کو دخل نہیں ۔خوشی اس بات کی کہ ان خیالات کو میں نے پسند کیا۔طریقہ اظہار بھی خوب ہے۔ شاعری، پالیٹکس، اخلاق، عملی فلسفہ سب کی جھلک ہے۔ رکاکت سے خالی۔

اہل وفا بھی۔الخ خوب ہے نہایت صحیح و بامعنی

غالب زبان وشوق۔الخ بہت ہی بلیغ ہے

یہ کیا ہوا۔الخ اس میں بھی معلوم سے زیادہ نامعلوم کی طرف کیا لطیف سعود ہے۔

حیراں ہوں۔الخ وجد آفریں شعر ہے

میرے دل کو بھی۔اس بھی میں کیا بلاغت ہے ۔ماشاء اللہ چشم بددور۔الغرض سب شعر کم وبیش اچھے ہیں ۔اب رہی زبان وطرز بیان۔اس میں کوئی نقص نہیں۔البتہ افزائش حسن کی گنجائش ہے۔طبیعت کا نشو نما خود اس کو پیدا کرلے گا، جب عالم معنی کے استغراق سے طبیعت آسودہ و بے فکر ہو کر حسن صورت کا مذاق پیدا کرے گی ۔تحریر میں ان اشارات سے زیادہ اس وقت میری قوت سے باہر ہے۔ بہر کیف آپ کو داد دیتا ہوں ۔ سبحان اللہ کہتا ہوں ۔ترقی عمر واطمینان کی دعا کرتا ہوں۔''[۱]

اس خط کے حاشیہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ یہ دوسری غزل تھی جو مولانا نے اکبر الہ آبادی کی خدمت میں بغرض اصلاح بھیجی تھی۔حاشیہ میں مولانا ماجد صاحب لکھتے ہیں۔

''یہ دوسری غزل ''تسخیر کر چلے''،''تدبیر کر چلے'' کی زمین میں کہہ کر حضرت اکبر کی خدمت میں اصلاح کے لیے پیش کی تھی۔''

مولانا کی یہ دوسری غزل نو مصرعوں پر مشتمل ہے، اور ''تغزل ماجدی'' میں موجود ہے۔اس کا مطلع ہے۔

جانبازیوں کو خبط سے تعبیر کر چلے
تم یہ تو خوب عشق کی توقیر کر چلے

---

[۱] خطوط مشاہیر (حصہ اول): مرتب مولانا عبدالماجد دریابادی: ص ۶۵-۶۶

لسان العصر اکبرالہ آبادی کی یہ دلی خواہش تھی کہ مولانا ماجد اپنا مشق سخن جاری رکھیں ۔ان کی آرزو تھی کہ وہ مستقبل میں بڑے شاعر بنیں ۔اسی وجہ سے ہمیشہ وہ ایک نومشق شاعر مولانا ماجد کے کلام کی دل کھول کر داد دیتے تھے ،اور پزیرائی کرتے تھے تاکہ ان میں حوصلہ اور اعتماد پیدا ہو۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے بعض اشعار یقیناً اس لائق ہیں کہ ان کی تحسین وتعریف کی جائے۔

۱۹۱۹ء میں مولانا نے اکبرالہ آبادی کی خدمت میں ایک غزل داغ کی زمین میں لکھ کر بھیجی۔اس غزل کی بھی اکبرالہ آبادی نے بڑی تعریف کی اور داغ کی غزل سے ان کی غزل کو بہتر بتایا ہے۔وہ خط ملاحظہ ہو۔

''آپ کی غزل داغ کی غزل سے ہر اعتبار سے بہتر ہے۔عشرت سلمہ نے بھی اس خیال سے اتفاق کیا بلکہ ایک شعر کی نسبت انھوں نے کہا کہ یہ نہایت اچھا ہے۔میں نے اور اشعار بھی منتخب کیے داغ کے رنگ میں اگر داغ سے آپ بڑھیں تو آپ کی عالمانہ اور اخلاقی متانت پر داغ آجائے لیکن اس غزل میں تو میری نگاہ میں داغ پھیکے رہے۔....آپ کی غزل اور داغ کی غزل پر انشااللہ مفصل ریویو کر کے آپ کو لکھوں گا یا آپ سے کہوں گا۔تاکہ وجہ ترجیح آپ کو معلوم ہو۔اور آپ تو خود سمجھے ہیں۔''[1]

مولانا نے اسی خط کے حاشیہ میں یہ بھی لکھا کہ انھوں نے ایک اور غزل داغ کی زمین میں کہہ کر اکبرالہ آبادی کی خدمت میں بھیجی تھی۔وہ لکھتے ہیں۔

''مدت کے بعد ایک غزل کہہ کر اصلاح کے لیے روانہ خدمت کی تھی۔یہ داغ کی مشہور زمین ۔

لطف مئے تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں''

مولانا نے تخلص ناظر اختیار کیا،اور اپنی شاعری کے متعلق انکساری سے یہ لکھا ہے کہ اکبرالہ آبادی نے ان کی شاعری کی تحسین وتعریف شفقت ومروت میں کی ہے۔حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مولانا کے مشقی

---

[1] خطوط مشاہیر (حصہ اول): مرتب مولانا عبدالماجد دریابادی:ص:۱۲۶۔۱۲۷

دور کے یہ اشعار بھی قابل توجہ ہیں جن میں فکروفن کے عناصر بخوبی پائے جاتے ہیں۔مولانا لکھتے ہیں۔

''تخلص ناظر اختیار کر لیا تھا، کئی غزلوں کے مقطع میں دیے آیا ہوں۔اب اس دور کے کلام کو کیا دہرایا جائے، اور پڑھنے والے کے ذوق سلیم کو دھچکا پہنچایا جائے۔نہ زبان، نہ تخیل، کوئی بات بھی تو موجود نہیں، یہ حضرت اکبر کی محض مروت تھی۔جوان سے حوصلہ افزائی کے کلمے کہلوا دیتی۔''[۱]

مرزا ہادی رسوا اعلیٰ درجہ کے نثر نگار ہونے کے علاوہ ایک صاحب دیوان شاعر بھی تھے۔لیکن افسوس اب ان کا دیوان دستیاب نہیں ہے۔مولانا ماجد نے رسوا کی زمین میں بھی ایک آدھ غزل کہی ہے۔ چنانچہ وہ 'آپ بیتی' میں فرماتے ہیں۔

''لکھنو کے بہترین غزل گو شاعر اس وقت مرزا محمد ہادی مرزا تھے، یوں بھی کم گو تھے، اور مشاعروں میں تو اور بھی کم جاتے، شہرت نصیب میں نہ آئی۔اپنی وفات (۱۹۳۳ء) پر مشہور ہوئے ہیں، تو شاعر کی حیثیت سے نہیں، محض ناول نگار کی حیثیت سے، ناول نویسی کو اس وقت کا ایک ثقہ طبقہ اپنے لیے باعث فخر نہیں، موجب ننگ سمجھتا، اور اس سے شرماتا۔مرزا صاحب بھی اسی طبقہ کے تھے ناول لکھتے تو چہرہ پر ''مرزا رسوا'' کی نقاب ڈال لیتے، قسمت کی ستم ظریفی کہ شہرت جو کچھ نصیب ہوئی، وہ اسی رسوائی کو ''مرزائی'' کو کسی نے پوچھا تک نہیں! بہرحال اپنے کو ان کی شاعری سے بھی خاصی عقیدت تھی، اور ایک آدھ غزل ان کی زمین میں کہہ ڈالی تھی اس پوچ گوئی کی یادگار کے طور پر دو ایک شعر آخر کے لکھے بھی دیتا ہوں، جو اتفاق سے حافظہ میں رہ گئے ہیں۔ورنہ کوئی بیاض وغیرہ اب کہاں۔ایک زمین تھی۔''خدا نے رکھا'' ''دوانے رکھا'' اس میں عرض کیا تھا۔

شوخیاں تیری نہ ظاہر ہوئیں خود تجھ پر بھی
تجھ کو دھوکے میں تری شرم وحیا نے رکھا

---

[۱] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۳۲۲

ایک اور زمین تھی ''محنت کیے ہوئے'' ''قدرت کیے ہوئے'' اس میں
عرض کیا تھا۔

پھر جی میں ہے کہ دیکھیے ہمت کا امتحاں
انجام کو حوالہ قسمت کیے ہوئے !''[1]

مولانا ماجد کے مذکورہ اشعار کے ''محنت کیے ہوئے'' سے متعلق ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب نے اپنی کتاب ''مولانا عبدالماجد دریابادی احوال وآثار'' میں لکھا ہے کہ یہ غزل مولانا نے غالبؔ کی زمین میں کہی ہے۔ جب کہ مولانا نے اس غزل کے بارے میں 'آپ بیتی' میں صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ ''محنت کیے ہوئے'' ''فرصت کیے ہوئے'' کی غزل میں نے رسواؔ کی زمین میں کہی ہے۔ لیکن ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب نے نہ جانے کن شواہد کی بنا پر ان اشعار کو غالبؔ کی زمین میں لکھا ہوا قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''.....غالب کی مشہور غزل مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
.....الخ میں قافیے کی تبدیلی کے ساتھ ماجد نے دو شعروں کے سوا باقی تمام شعر پھسپھسے ہی نکالے ہیں۔ البتہ لکھنوی روزمرہ نے کہیں کہیں شعروں کو سہارا دیا ہے جیسے مثلاً اس شعر میں۔

یہ شوق دید ہے کہ چلا میں عدو کے گھر
خود داری وغرور سے فرصت کیے ہوئے

اب ''فرصت کیے ہوئے'' نے شعر میں ایک طرحداری پیدا کر دی ہے
لیکن سوال یہ ہے کہ اس شعر کو غالبؔ کے اس شعر سے کیا نسبت ہے۔

پھر دل طواف کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

یا مثلاً اس شعر پر غالبؔ کے اسلوب کا فیضان تو ہے مگر تکلف ہی تکلف ہے۔

بے گانہ وار در پہ کسی کے چلا ہوں پھر

---

[1] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۳۲۲۔۳۲۳

سامان صد نہفتن ِ الفت کیے ہوئے

اس شعر کو غالب کے اس شعر سے کوئی نسبت ہے؟ ؎

پھر پرسش جراحت دل کو چلا ہے عشق

سامان صد ہزار نمکداں کیے ہوئے''[1]

بہر حال اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔ کہ جب غالبؔ کی زمین میں یہ اشعار ہیں ہی نہیں تو غالبؔ کے اشعار سے مولانا کے اشعار کا موازنہ بے معنی ہی نظر آتا ہے۔

مولانا کی غزل گوئی کا دور اصلاً تقریباً چار سالوں پر محیط ہے۔ یعنی ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک۔ ۱۹۱۶ء میں چونکہ مولانا کی شادی ہوگئی تھی، اس لیے کچھ عرصہ کے بعد دیگر مصروفیات اور خانگی مشغولیات کی وجہ سے مولانا نے شاعری کو تقریباً ترک ہی کر دیا تھا۔ مگر اسی زمانہ (۱۹۱۶ء) میں سید الاحرار محمد علی جوہر کی نظر بندی میں لکھے گئے زندانی اشعار کو دیکھ کر ان کے دل میں پھر تحریک پیدا ہوئی، اور انھوں نے ایک دو غزلیں کہہ ڈالیں۔ جو رسالہ معارف میں ۱۹۱۷ء میں شائع ہوئیں۔

''غزل گوئی کا یہ دور کوئی چار سال قائم رہا۔ یعنی ۱۹۱۸ء تک، گو اس کا زور شادی کے بعد ہی جون ۱۶ء میں ختم ہو گیا تھا..... ۱۶ء میں مولانا محمد علی جوہر کے خطوں سے معلوم ہوا کہ مولانا نے جھنڈواڑہ ہی میں (سی، پی، موجودہ ام، پی) نظر بند رہ کر شاعری اور غزل گوئی شروع کر دی ہے، چنانچہ یہ غزلیں پڑھ دل میں نئے سرے سے ایک امنگ پیدا ہوئی خود بھی ایک دو غزلیں کہہ ڈالیں۔ اور معارف (اعظم گڑھ) نے ۱۷ء میں وہ شائع بھی کر دیں۔''[2]

چار سال تک یعنی ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۲ء تک مولانا نے شعر و سخن کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ اس وقت تک وہ الحاد و تعقل پرستی سے نکل کر شاہ راہ اسلام پر آچکے تھے۔ اسی زمانے میں مولانا محمد علی جوہر جو جنگ آزادی کے ایک جانباز سپاہی اور خلافت کمیٹی کے علم بردار تھے، بیجاپور جیل سے نعتیہ اشعار لکھ کر مولانا ماجد کی خدمت میں بھیجے ان اشعار کو پڑھ کر مولانا ماجد کا شعری ذوق بیدار ہو گیا، اور انھوں نے اس مرتبہ عشق رسول میں ڈوب کر دل کی گہرائیوں سے نعت رسول رقم کرنی شروع کر دی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

---

[1] مولانا عبدالماجد دریابادی احوال و آثار: ڈاکٹر تحسین فراقی: ص: ۴۸۰

[2] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۳۲۳

’’شاعری یا تک بندی جیسی کچھ تھی، چار سال تک اس کا چشمہ خشک رہا، یہاں تک کہ ۲۲ءمارچ اپریل کا زمانہ آ گیا، اور اب میں الحاد کے چکر سے عرصہ ہوا نکل کر پختہ محمدی ہو چکا تھا کہ اتنے میں مولانا محمد علی کی غزلیں بیجا پور جیل سے کہی ہوئی دستیاب ہوگئیں (مولانا کی پہلی اسیری ۱۹ءمیں ختم ہو کر اب دوبارہ جیل کی زندگی شروع ہوگئی تھی) اور یہ نعتیہ کلام پڑھ، طبیعت بے چین ہوگئی، اور جذبہ شعرو شاعری از سر نو بھڑک اٹھا، البتہ یہ شاعری زلف و کاکل، لب و رخسار کی نہیں رہ گئی تھی، اب رنگ تمام تر نعت نبی کا غالب تھا پہلی غزل جوہر ہی کی زمین میں تھی، جوہر کا مطلع تھا۔

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں

اسی زمین پر غزل کہی تھی، اس کے دوشعر یہ تھے۔

پڑھ صل علی حق کے محبوب کی ہوں باتیں
رحمت کی گھٹائیں ہوں اور نور کی برساتیں
محشر میں اماں پائی صدقے میں درو دوں کے
دشواری میں کام آئیں بھیجی ہوئی سوغاتیں‘‘[1]

مولانا ماجد نے نعتیہ غزلیں چار کہی ہیں جو’’تغزل ماجدی‘‘ میں شائع ہو چکی ہیں۔

مولانا ماجد کی ایک نعتیہ غزل جو دس مصرعوں پر مشتمل ہے۔ بہت مقبول و مشہور ہوئی۔ قوالی کی محفلوں، عرس و نعت کی محفلوں میں اس غزل کو بڑی مقبولیت حاصل تھی۔ گاؤں دیہات میں بھی اس غزل کو مقبولیت حاصل تھی۔ آپ بیتی میں لکھتے ہیں۔

’’ایک دوسری غزل خوب چلی، یا یہ کہیے کہ قوالوں نے خوب چلائی محفلوں میں گا گا کر، اور کم سے کم دریاباد میں تو اب بھی ۴۵ سال گذر جانے پر، عرس کے موقعوں پر سنی ہی جاتی ہے۔ اور قوالوں کو روپیہ بھی دلوا جاتی ہے۔

---

[1] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۳۲۳۔۳۲۴

دو ایک شعر عرض ہیں۔

پڑھتا ہوا محشر میں جب صل علی آیا
رحمت کی گھٹا اٹھی ،اور ابر کرم چھایا
چرچے ہیں فرشتوں میں ،اور رشک ہے زاہد کو
اس شان سے جنت میں شیدائے نبی آیا''[۱]

مولانا ماجد نے اپنے نعتیہ کلام کا سلسلہ ۱۹۲۴ء تک قائم رکھا اس کے بعد دوسری تمام ذمہ داریوں اور صحافتی مشن نے انھیں اتنی فرصت نہ دی کہ وہ شعر وسخن کے گیسو کو سنواریں۔ چنانچہ آپ بیتی میں فرماتے ہیں۔

''.....یہ زور ۲۴ء تک قائم رہا، اس کے بعد سے شعر کہنا بند ہے نہ کوئی داعیہ وولولہ شعر کہنے کا پیدا ہوا، اور نہ کبھی یکسوئی کے ساتھ فکر سخن کی فرصت نصیب ہوئی۔ ہاں تفریح وتفنن کے طور پر مصرعوں کی حد تک شاعری اب بھی کر لیتا ہوں، اور اپنے ہی کسی نثری مضمون میں وہ مصرعے کھپ بھی جاتے ہیں۔''[۲]

یوں تو مولانا نے خود کو فکر شعر سخن سے آزاد کر لیا تھا، اور ہمہ وقت عظمت اسلام کی تبلیغ واشاعت میں مصروف رہتے تھے۔ پھر بھی ان کا شعری ذوق ہمیشہ قائم ودائم رہا۔ چونکہ ان کی طبیعت موزوں تھی۔ اس لیے اچھے اشعار خود بخود ذہن میں محفوظ ہوجاتے تھے۔ عمدہ اشعار پر مولانا دل کھول کر داد دیتے تھے۔ شاعروں اور شاعری سے دلچسپی کا اظہار انھوں نے 'آپ بیتی' میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''اچھے شعر سننے کا شوق بدستور قائم ہے، اور اس میں کسی رنگ کی قید نہیں معرفت کا ہو یا ٹھیٹھ مجاز کا، اس میں شعریت ہونا چاہیے بس اس سے لوٹ ہو جاتا ہوں۔ اور اگر شعر بہت ہی پسند آ گیا تو اکثر ایک ہی دفعہ میں یاد بھی ہو جاتا ہے (''ہو جاتا ہے'' نہیں ''ہو جاتا تھا'' اب تو آیات قرآنی تک میں حافظہ دغا دے جاتا ہے)۔ محبوب شاعروں کی تعداد اتنی بڑی ہے کہ سب کے نام لکھنے کی گنجائش ہی کہاں۔ مختصر یہ کہ فارسی میں سب کی 'سرتاج مثنوی' ہے، اس میں جو کشش ہے۔ اس کی آدھی بھی، اسی شاعر کی غزلیات یعنی 'کلیات شمس تبریز' میں

---

۱ آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۳۲۴

۲ ایضاً: ص: ۳۲۴۔۳۲۵

نہیں پاتا ہوں، 'رومی' کے بعد نمبر 'عطار' کا آتا ہے پھر 'خسرو' کا اور پھر 'جامی' کا اور 'سعدی' کا۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ میں نے ان کو پڑھا بس واجبی سا، 'حافظ' کا بھی قائل ہوں لیکن صرف ان کی شاعری کا۔ ان کے تصوف و معرفت کا نہیں۔ عرفی، صائب، عراقی کو اور بھی کم پڑھا ہے، البتہ جب کہیں ان کا کوئی شعر نقل دیکھ لیتا ہوں تو طبیعت پھڑک جاتی ہے۔ ہندوستان کے فارسی گویوں میں غالب، شبلی، اقبال، حمید فراہی، خواجہ عزیز، اور عزیز صفی پوری کا گرویدہ ہوں۔ اور اقبال کی مثنویوں، اور غزلوں میں تو جاذبیت بھی مولانا روم کے بعد ہی پاتا ہوں۔ رہے اردو شاعر تو اس میں اپنے پسند کے شاعروں کی فہرست مختصر ہی رکھوں جب بھی اچھی خاصی طویل ہو کر رہے، صرف گنتی کے چند نام لکھ کر چھوڑے دیتا ہوں۔ غالبؔ، حسرتؔ، حالیؔ، اکبرؔ، اقبالؔ، داغؔ، ریاضؔ، مجذوبؔ، عزیزؔ لکھنوی، جوشؔ ملیح آبادی اور ان دس کے کم سے کم دس گنے اور۔ یہ بھی عرض کردوں جس طرح مریض، بہت معمولی طبیبوں بلکہ نیم حکیموں کے ہاتھ سے شفا پاجاتے ہیں، یہ ضروری نہیں کہ ہر شعر کا کہنے والا بھی کوئی اعلی شاعر ہو بعض بہت معمولی شاعر بھی شعر بہت اچھا کہہ جاتے ہیں۔ انگریزی شاعری سے مطلق مَس نہیں، اور عربی کی اتنی استعداد نہیں کہ عربی شاعری کو کچھ بھی پڑھ سکوں۔''[۱]

مولانا ماجد دریابادی کی شاعری میں چاہے میرؔ کا تغزل غالبؔ کا فلسفہ نہ ہو مگر ان اشعار کی اہمیت کے لیے یہ کافی ہے کہ ایک صاحب طرز ادیب و انشاپرداز اور بے باک صحافیؔ کے مشّاق دور کی شعری کاوشیں ہیں، اور یہ اشعار ایک بے مثال نثر نگار کے شعری ذوق کا پتہ دیتے ہیں۔ ''تغزل ماجدی'' کے اشعار اِس لیے بھی ہم کو کم تر نظر آتے ہیں، کہ نثر نگار مولانا ماجد کا قد اتنا بڑا ہو گیا ہے، کہ اس کے سامنے شاعر ماجد بہت چھوٹے نظر آتے ہیں۔

مولانا کے مختصر مجموعہ کلام ''تغزل ماجدی سے ان کے اشعار کو نقل کیا جارہا ہے۔

☆☆☆

زینت حسن ہے خود اپنے پہ نازاں ہونا　　　　نازش زخم جگر رہن نمکداں ہونا

---

[۱] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۳۲۵۔۳۲۶

عاشقی کیا ہے بجز کش مکش عقل جنوں ۔۔۔ دل کو آفت میں پھنسا، آپ ہی حیراں ہونا
زندگی اصل میں ہے اک قفس طائر روح ۔۔۔ موت کیا ہے اسی زنداں سے گریزاں ہونا
نامرادی مری ہم زاد تھی، کیوں یارب ۔۔۔ میری قسمت میں لکھا صاحب ارماں ہونا
ہم شہیدان وفا موت کے خود ہیں مشتاق ۔۔۔ کفر اس شرع میں ہے طالب درماں ہونا
اے اجل آس ہے تیری ہی دم یاس والم ۔۔۔ تجھ سے زیبا نہیں انساں کو ہراساں ہونا
راز ہستی وہ گرہ ہے جو کبھی کھل نہ سکی ۔۔۔ فلسفی کے لیے آخر ہے پشیماں ہونا
اس جفا کار نے اب کی بھی تلافی تو کیا ۔۔۔ اب مقدر میں تو ہے قبر کا مہماں ہونا
میرا انجام ہے دنیا کو اک عبرت کا سبق ۔۔۔ دوستو تم نہ کبھی عشق میں غلطاں ہونا
سب کو ہونا ہے فنا حسن ہو یا عشق وفا ۔۔۔ اہل ہستی کبھی ہستی پہ نازاں ہونا
لذت درد کے منکر کو سنادو یہ شعر ۔۔۔ ناظرؔ آساں نہیں غالبؔ سا سخنداں ہونا
کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ۔۔۔ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

☆☆☆

آہ منت کش اثر نہ ہوئی ۔۔۔ شب غم کی کبھی سحر نہ ہوئی
نہ ہوئی ہم سے ترک خوئے وفا ۔۔۔ ہم نے چاہا کہ ہو مگر نہ ہوئی
غلط انداز کتنی ہے وہ نظر ۔۔۔ آج تک مرے حال پر نہ ہوئی
اس قدر محویت معاذاللہ ۔۔۔ ان کے آنے کی بھی خبر نہ ہوئی
راز الفت کسی پہ کھل نہ سکا ۔۔۔ وحشت شوق پردہ در نہ ہوئی
کس قدر ہے غیور میری دعا ۔۔۔ کبھی شرمندہ اثر نہ ہوئی
ہم گدایان عشق کو ناظر ۔۔۔ فکر الطاف اہل زر نہ ہوئی

☆☆☆

ان کے انداز میں الفت نہ وفا ہوتی ہے ۔۔۔ ہاں اگر ہوتی ہے کوئی تو جفا ہوتی ہے
پھر ہے بے تاب زباں عرض تمنا کے لیے ۔۔۔ دیکھیے دیکھیے پھر مجھ سے خطا ہوتی ہے

کچھ کھلنے نہیں دیتی کبھی عصمت تیری
شوخیوں پر بھی تری مہر حیا ہوتی ہے

مل ہی جاتی ہیں کبھی اپنی نگاہیں ان سے
وہ بھی جب ایسی ہی تقدیر رسا ہوتی ہے

لذت وصل کے منکر تو نہیں ہم لیکن
لذت کاہش ہجراس سے سوا ہوتی ہے

اس نے خود داری ناظرؔ کو مٹا کر چھوڑا
یہ محبت بھی عجب سخت بلا ہوتی ہے

☆☆☆

مدت ہوئی پاس نزاکت کیے ہوئے
آہ وفغاں سے شور قیامت کیے ہوئے

لو دیکھو آگیا نہ زباں پر کسی کا نام
مدت سے ہم تھے ضبط محبت کیے ہوئے

اگلا سا وہ سکوں ومتانت کہاں کہ اب
شوریدگی ہے بندہ وحشت کیے ہوئے

پھرتا ہے پھر نظر میں کسی کا خرام ناز
سامان منتہائے قیامت کیے ہوئے

یہ شوق دید ہے کہ چلا میں عدو کے گھر
خودداری وغرور سے فرصت کیے ہوئے

پھر دل میں ہے کہ دیکھیے جرات کا امتحاں
انجام کو حوالہ قسمت کیے ہوئے

وہ دل کی جلوہ گاہ سرور ونشاط تھا
اب غم ہے اس کو مدفن حسرت کیے ہوئے

اب دل میں ولولہ بھی نہیں کوئی ہے کہ ہوں
اندازہ زبونی قسمت کیے ہوئے

بے گانہ وار در پہ کسی کے چلا ہوں میں
سامان صد نہفتن الفت کیے ہوئے

ناظرؔ کے ہوش وعقل بھلا اب کہاں درست
ہے مست اس کو بادہ الفت کیے ہوئے

نعتیہ غزلوں سے چند اشعار نقل کیے جارہے ہیں

پڑھ صل علی حق کے محبوب کی ہو باتیں
رحمت کی گھٹائیں ہوں اور نور کی برساتیں
وعدے ہیں شفاعت کے تسکین کی ہیں باتیں
آقائے دوعالم ؐ کی دیکھو تو مداراتیں
غم خواری امت سے اک آن نہیں غافل
ظاہر میں تو ہے پردہ ،پردے میں ملاقاتیں

آہ اک شب تو با اثر ہوتی ہے
وہ تجلی حق ادھر ہوتی ہے
پائے اقدس پہ چشم تر ہوتی ہے
شب گذرتی یونہی سحر ہوتی ہے
کچھ تو ارمان دل نکل جاتا ہے
کچھ تسکین چشم تر ہوتی ہے

عبدالماجد دریابادی بحیثیت ڈرامہ نگار

مولانا عبدالماجد دریابادی کی تخلیقی صلاحیتوں کا ایک بین ثبوت ان کا ڈرامہ بھی ہے۔لیکن اس ڈرامہ کی مصنف کی نظر میں کوئی قدر و قیمت نہیں تھی ۔ پھر بھی ادبی نقطۂ نظر سے مولانا کا دوران سفر لکھا جانے والا یہ ڈرامہ فنی اعتبار سے ہماری ادبی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔مولانا کو بچپن ہی سے تھیٹر اور ڈراموں کا بڑا شوق تھا۔طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے ڈراموں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا،اوراپنے زمانے کے مشہور ڈرامہ نگار' آغا حشر کاشمیری' اپنی کمپنی کے ساتھ جب لکھنوآئے تو مولانا ماجد نے اس عظیم ڈرامہ نگار سے رفاقت وشناسائی کی راہیں ہموار کرلیں ۔مئی ۱۹۱۵ء میں مولانا نے ریل سے بمبئی کا سفر کیا تھا،اور دوران سفر ہی میں انھوں نے اپنا ڈرامہ' زود پشیماں' مکمل کیا تھا۔مولانا کی یہ سفری تخلیق لاکھوں کی حالت حضر سے بہتر ہے۔' آپ بیتی' میں وہ فرماتے ہیں

> ''۱۵ء کی پہلی سہ ماہی تھی ، کہ وقت کے مشہور ڈرامہ نگار آغا حشر مع اپنی تھیٹر کمپنی کے لکھنوآئے ۔سنیما کے بجائے اس وقت اصل زور تھیٹر ہی کا تھا۔ اور میں خود تھیٹر کا بڑا شوقین تھا،آغا صاحب سے مجھ سے اچھے خاصے پینگ بڑھ گئے ۔اور جب وہ چلے گئے اور مئی ۱۵ء میں ایک دوست کی فرمائش پر انھیں کے خرچ پر میرا بمبئی جانا ہوا،تو ریل پر طبیعت بڑی موزوں پائی اور ۲۴

گھنٹے کے اندر دوران سفر میں ایک پورا ڈرامہ تیار ہوگیا! بعد کو نظر ثانی و اضافہ کے بعد زود پشیماں کے نام سے شائع کر دیا۔ اپنا نام ظاہر کرنے کی ہمت نہ ہوئی، ''ناظر، بی، اے'' کے نام سے شائع کی، یہی اس وقت تخلص تھا، ڈرامے کے اندر غزلیں جو رکھیں ان میں یہی تخلص ڈالا، مولانا سید سلیمان ندوی، مولوی عبدالحلیم شرر، مرزا ہادی رسوا اور سجاد حیدر (یلدرم) سے دیباچے لکھوائے۔''[1]

'زود پشیماں' کے دیباچے میں سید سلیمان ندوی نے ڈرامہ کے فن اور اس کی خصوصیات اور ڈرامہ نگار کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ دیباچہ کا یہ حصہ نقل کیا جا رہا ہے۔

''ڈرامہ کا مقصد یہ ہے کہ ہیئت اجتماعی کی اصلاح شخصی واقعات اور روزمرہ کے حوادث سے کی جائے، لیکن افسوس ہے کہ کلکتہ اور بمبئی کے تماشہ گاہوں میں اس شریف اور بلند مقصد کی جس ناپاک اور گندہ طرز تحریر کے ذریعہ سے پامالی کی گئی ہے، وہ حد درجہ تاسف انگیز ہے۔ اس سے زیادہ تاسف انگیز یہ تھا کہ یہ راہ اس درجہ بدنام اور اس پر چلنا اس درجہ خلاف متانت تھا کہ مشاہیر اہل قلم اپنی عزت اور نام کے تحفظ کی بنا پر اس راہ میں ایک قدم بھی اٹھا نہیں سکتے تھے، لیکن الحمد اللہ کہ ہماری جماعت کے ایک ممبر نے نہایت جرات اور بہادری سے اس راستہ پر قدم رکھا ہے۔ تاہم آدمی پہلے پہل رسم کے خلاف کسی اچھی سے اچھی بات کو کرتے ہوئے بھی جھجکتا ہے اور شرماتا ہے۔ وہ بھی جھجکتے اور شرماتے ہیں، تاہم تم پہچاننے کی کوشش کرنے کے بجائے یہ دیکھو کہ اس لغزش گاہ عام میں کس طرح ایک ایک قدم سنبھال کر انھوں نے رکھا ہے۔ شخصی اخلاق نگاری کی یہ اردو میں پہلی کوشش ہے، اور وہ جس درجہ بھی کامیاب ہو مستحق ستائش ہے۔''[2]

(نوٹ) سید سلیمان ندوی کا لکھا ہوا یہ دیباچہ مولانا ماجد نے 'مکتوبات سلیمانی' (جلد اول) میں ضمیمہ کے طور پر نقل کیا ہے۔

---

[1] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۲۸۱

[2] مکتوبات سلیمانی (جلد اول) مرتب مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۶۰

’زود پشیماں‘ کومولانا ماجد نے اپنے اصل نام سے نہ شائع کرا کے ایک فرضی نام ناظرؔ سے شائع کرایا تھا۔لیکن سید سلیمان ندوی نے ’زود پشیماں‘ کے مصنف کو پہچان لیا، اور مولانا کو خط لکھ کر اس ڈرامہ کی فنی وادبی حیثیت کا بھی اعتراف کیا ہے۔خط کا یہ حصہ نقل کیا جارہا ہے۔

’’زود پشیماں کے مصنف کو میں نے بہت جلد پہچان لیا اتنے اشخاص ہیں جن کی تحریر کی ایک ایک سطر میں پہچانتا ہوں شبلی، نذیر احمد، ابوالکلام، عمادی، ماجد، شاید آپ بھی یہی الزام مجھ پر قائم کریں۔ میں آپ کی اس ادبی کامیابی پر صمیم قلب سے مبارک باد دیتا ہوں اگر قلت ضخامت وصفحات کوئی عیب نہ ہوتو میں کہہ سکتا ہوں کہ اس سے بہتر کوئی ڈرامہ علم اورفن کی حیثیت سے ہماری زبان میں نہیں لکھا گیا۔‘‘[۱]

اس زمانے کے مشاہیر مثلاً سید سلیمان ندوی، مولوی عبدالحلیم شرر، مرزا ہادی رسوا اور سجاد حیدر یلدرم جوخود اونچے درجہ کے تخلیق کار تھے نے ’زود پشیماں‘ کی داددی اوراسے نظر تحسین سے دیکھا۔لیکن خود مولانا ماجد صاحب اس ڈرامہ کو اپنے لیے باعث افتخار نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ اس کو اپنے نام سے منسوب کرنا بھی ناپسند کرتے تھے۔ اسی وجہ سے انھوں نے یہ ڈرامہ اپنے تخلص ناظرؔ کے نام سے شائع کرایا تھا۔ایک بار جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی کے استاد پروفیسر محمد حسن (جوخود بھی ایک نامور ڈرامہ نگار تھے) نے مولانا کے پاس خط لکھ کر فرمائش کی کہ ہم لوگ اردو تھیٹر قائم کرنا چاہتے ہیں، اوراسے حیدرآباد بمبئی لے جانا چاہتے ہیں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ہم آپ کے ڈرامہ ’زود پشیماں‘ کو اسٹیج کرنا چاہتے ہیں، مولانا کا جواب ملاحظہ ہو۔

’’آپ کا خط پا کر آپ کی ستم ظریفی کا قائل ہوگیا۔تھیٹر کو فروغ دینے کی کوشش میں ترغیب وتحسین کی توقع مجھ دقیانوسی ملامدیر صدق سے!

عشق ومزدوری عشرت گہ خسرو کیا خوب

کہیں میرے پیام کو اپنے کسی Comic کے اشتہار کا جزو بنانے کا تو ارادہ نہیں ’زود پشیماں‘ بالکل نوعمری کی تصنیف ہے اور وہ بھی بڑی حد تک قلم برداشتہ۔شیکسپیر کا نشہ اس وقت سوار تھا اور دو چار کتابیں فن پر الٹی سیدھی پڑھ ڈالی

---

[۱] مکتوبات سلیمانی (جلد اول) مرتب مولانا عبدالماجد دریابادی:ص:۶۰۔۶۱

تھیں۔اب اگر کتاب پر نظر ثانی کروں تو پچاس فیصدی بدل ڈالوں۔ایسی کتاب
کو آپ یاد ہی کیوں دلاتے ہیں جس کے ذکر ہی سے شرمندہ ہوا جاتا ہوں۔''[۱]

اردو ڈرامہ کو نئی جہتوں سے آشنا کرنے والے فن کار پروفیسر محمد حسن کے اس ڈرامہ کو اسٹیج کرنے کی خواہش ہی اس ڈرامہ کی فنی عظمت کی دلیل ہے۔'زود پشیماں' رسالہ الناظر میں قسط وار شائع ہوا تھا۔ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنی کتاب ''مولانا عبدالماجد دریابادی احوال و آثار'' میں اس کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔

''.....زود پشیماں'' یکم جون ۱۹۱۶ء سے ماہنامہ الناظر میں قسط وار شائع ہونا شروع ہوا۔پہلی قسط کی اشاعت کے ساتھ ایڈیٹر الناظر کا ایک مفصل نوٹ بھی شائع ہوا تھا۔قارئین کی دلچسپی کے لیے اس کا کچھ حصہ یہاں نقل کیا جارہا ہے۔''اب ہمارے ایک لائق دوست مسٹر''ناظر'' نے ان اصلاحی تجاویز کی بنا پر جو مروجہ ڈراموں کے متعلق ان کے ذہن میں تھیں،ایک ڈرامہ لکھا ہے جس میں اپنے خیال کے مطابق انھوں نے ان تمام معائب کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے جو رائج الوقت ڈراموں میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں اور اس غرض سے کہ پبلک کے رجحان کا اندازہ ہو سکے،اسے الناظر کی وساطت سے ارباب نظر کے مطالعہ کے لیے پیش کیا ہے۔اگر تعلیم یافتہ اصحاب کی معقول تعداد نے اس کو پسند کیا اور کم سے کم سو درخواستیں خریداری کی موصول ہوئیں تو پھر اسے کتابی صورت میں شائع کر کے کسی کمپنی سے ایکٹ کرانے کی بھی کوشش کی جائے گی۔''[۲]

مولانا ماجد نے یہ ڈرامہ اپنے دور الحاد و عقلیت پرستی میں تخلیق کیا تھا۔لیکن افسوس کہ بڑی تلاش وجستجو کے بعد بھی اس ڈرامہ کا کوئی نسخہ دستیاب نہ ہوسکا اس لیے ڈاکٹر تحسین فراقی کی کتاب سے اس ڈرامہ کا پلاٹ نقل کیا جارہا ہے۔

''نواب باقر حسین اپنی بیٹی حسنیٰ کو زمانہ شیر خواری ہی میں اپنے بڑے بھائی نواب راحت حسین رئیس خلد آباد کے بیٹے مشرف سے منسوب کر دیتا

---

۱. مکتوبات ماجدی (جلد اول) مرتب ڈاکٹر ہاشم قدوائی :ص:۱۸۔۱۹

۲. مولانا عبدالماجد دریابادی احوال و آثار: ڈاکٹر تحسین فراقی :ص:۴۸۴

ہے ۔اس بات کی پروا کیے بغیر (اور اپنی تمام تر روشن خیالی اور اصلاح کے دعووں کے ساتھ) کہ افراد کی قسمت کا فیصلہ ان کی مرضی اور رضا مندی کے بغیر کتنا مہلک ہوسکتا ہے۔ بڑی ہو کر حسنیٰ انگریزی تعلیم حاصل کرتی ہے اور تعلیم اس میں اعتماد اور خودداری کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔اسی دوران اس کا منگیتر جو جوان ہو چکا ہوتا ہے ،طرح طرح کے اخلاقی مفاسد یعنی شراب خوری اور طوائف بازی میں مبتلا ہوجاتا ہے علاوہ ازیں ذہناً بھی فاتر اور ہونق ہے۔ حسنیٰ اس صورت حال سے دل گرفتہ ہے۔

اسی دوران اس کی زندگی میں یوسف داخل ہوتا ہے ۔اعلی تعلیم یافتہ ، مہذب ،علم وآ گہی کا دلدادہ لیکن معاشی طور پر نا آسودہ اور مفلوک الحال ۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگتے ہیں ۔اس صورت حال کا جب نواب راحت حسین کو پتہ چلتا ہے تو وہ طرح طرح کے کمینہ حربے استعمال کرتا ہے اور بالآخر حسنیٰ کو یوسف سے متنفر کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور اپنے انگلستان جانے کا بہانہ بنا کر فوراً اپنے بیٹے سے اس کی شادی کر دیتا ہے۔ شادی کے بعد کھلتا ہے کہ مشرف ،شراب نوش اور عیاش تو تھا ہی ساتھ ہی ساتھ ہزار روپے کی خطیر رقم کا مقروض بھی ہے جو تمام حویلی اور جائداد بیچ باچ کر بھی ادا نہیں ہوسکتی۔ ادھر شادی کے ایک دو روز بعد ہی مشرف غائب ہوجاتا ہے اور ایک رنڈی کے کوٹھے پر ایک رقیب کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتار کرلیا جاتا ہے۔ادھر یوسف کو جب حسنیٰ کی شادی کی اطلاع ملتی ہے تو وہ ریوالور تانے اس کے گھر پہنچتا ہے اور اس سے اس کی بے وفائی کا سبب پوچھتا ہے۔

صورت حال کے منکشف ہوجانے پر وہ حسنیٰ کو بے گناہ اور معصوم سمجھتا ہے لیکن چونکہ وہ اس کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا اس لیے ریوالور سے خودکشی کر لیتا ہے۔ حسنیٰ اپنے محبوب کے دردناک انجام سے متاثر ہو کر زہر

کھا لیتی ہے اور خودکشی کر لیتی ہے۔ اسی دوران مشرف کو قتل کے جرم میں پھانسی دے دی جاتی ہے اور اس کی اطلاع داروغہ عین اسی وقت نواب باقر کو دیتا ہے۔ اپنی بیٹی اور داماد کی موت کے بعد زندگی اس کے لیے اندھیر ہو جاتی ہے اور وہ یوسف ہی کے ریوالور سے خودکشی کر لیتا ہے۔ یوں باقر حسین اپنے مزاج کی عجلت، زر پرستی، زود تاثری اور سطح بینی کے نتیجے میں پورے گھرانے کی تباہی کا باعث بنتا ہے۔ ڈرامے کا ڈراپ سین چار اموات پر ہوتا ہے۔''[۱]

'زود پشیماں' کی فنی و ادبی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے ڈاکٹر تحسین فراقی نے اس ڈرامہ کا ایک مختصر تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ جس سے چند اقتباسات نقل کیے جا رہے ہیں۔

''جہاں تک کردار نگاری کا تعلق ہے ماجد نے یوسف (ہیرو) حسنیٰ (ہیروئن) پروفیسر گھوش اور خصوصاً ماسٹر اے بیسٹی کے کرداروں کو خوب فنکارانہ طریقے سے گوندھا ہے۔ دوسرے سین میں یوسف کا ظہور ہوتا ہے جبکہ تیسرے سین میں حسنیٰ ظاہر ہوتی ہے، لیکن دونوں اپنی شخصیت کے تجاذب کے باعث قاری یا ناظر کو فوراً اپنی جانب کھینچتے ہیں۔ پھر ان دونوں کرداروں کو جس باطنی کشمکش میں گرفتار دکھایا ہے، وہ بھی انسانی نفسیات سے ماجد کی گہری آشنائی کا ثبوت مہیا کرتا ہے۔

اس ڈرامے سے جہاں زر پرستی کے بھیانک انجام اور بچپن کی سگائی کے مہلک نتیجے کو اجاگر کیا گیا ہے، وہیں ضمناً یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مردوں کی سخت حاکمیت کے نتیجے میں عورتوں کا طبقہ ریاکاری اور غلط بیانی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس میں لکھنوی معاشرے کے کھوکھلے پن کو بھی نشانہ طنز بنایا گیا ہے۔ جو تیسرے درجے کی رعایت لفظی، تعلّی اور ضلع کا اسیر ہو گیا تھا۔ پھر اس سے حاکم ومحکوم کی نفسیات بھی آشکار ہوتی ہے۔

''زود پشیماں'' کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے، اس میں بعض

---

[۱] مولانا عبدالماجد دریابادی احوال و آثار: ڈاکٹر تحسین فراقی: ص: ۴۸۵۔۴۸۶

حقائق تو ایسے ہیں جو خود ماجد کی آپ بیتی معلوم ہوتے ہیں۔ڈرامے کا یوسف خود ماجد کی شخصیت کا ثنی لگتا ہے اور حسنیٰ ان کی بیگم (عفت النسا) کی ہم زاد۔یوسف کی علمی دلچسپیوں کی جو تفصیل ان اوراق میں ملتی ہے،اس کے جس انداز کے منطقی مباحث پر مبنی مکالمے ان اوراق میں جھلکتے ہیں، یہ خود ماجد کی اپنی شخصیت کے جوہر تھے۔پھر حسنیٰ کو ایک بے حد امیر گھرانے کی لڑکی بتایا گیا ہے، اور یہی حال ماجد کی سسرال کا تھا۔جس طرح یوسف حسنیٰ کی محبت میں گرفتار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اور اس کے معاشرتی تفاوت کی وجہ سے تذبذب اور کشمکش کا شکار نظر آتا ہے، یہی کیفیت شادی سے پہلے ماجد کی تھی۔

سب سے اہم اشارہ اس ضمن میں وہ منظر ہے جہاں خدمت گار یوسف کو بلانے آتا ہے اور اس سے التجا کرتا ہے کہ وہ براہ کرم حسنیٰ کا بذریعہ مسمریزم علاج کریں کیونکہ وہ شدید سر درد میں مبتلا ہے۔علاج کے یہی چند لمحے اچانک محبت کا مقدمہ بن جاتے ہیں۔خود ماجد بھی مسمریزم کی خوب ریاضتیں کیے ہوئے تھے اور ایک خادمہ کے بلانے ہی پر شیخ یوسف الزماں کے گھر جا کر ان کی بیٹی کا علاج کرتے کرتے خود مریض بن گئے تھے۔پھر جس طرح ماجد کی بیگم محض قبول صورت تھیں، ایسا ہی نقشہ اس ڈرامے میں حسنیٰ کا بتایا گیا ہے۔یوسف اور ماجد میں ایک اور اہم مماثلت دونوں کا مذہب اور متعلقات مذہب سے انکار ہے۔عین زمانہ شباب کے ماجد کے تشکیکی والحادی خیالات کا ذکر ہم بیشتر مواقع پر کر چکے ہیں اب زود پشیماں کے 'یوسف' کے خیالات دیکھیے ''انسان جوں جوں مرتبہ انسانیت میں ترقی کرتا جاتا ہے، اسی نسبت سے اسے جذبات کی قید سے آزاد ہوتے جانا چاہیے۔دیکھیے انسان کی زندگی حقائق سے کس قدر دور اور وہم پرستیوں میں کس قدر گرفتار رہتی ہے۔ہوش سنبھالا تو لیجیے عشق ومحبت، لیلی ومجنوں کے افسانوں سے طبیعت بہلانے لگے۔کہولت کے دن آئے تو یہ ورق

بھی الٹ دیا۔ اب کیا ہے؟ اب بہشت و دوزخ، حور و غلمان، جبرئیل و عزرائیل کے چرچے ہو رہے ہیں۔ غرض ساری عمر اسی خرافات پرستی میں گزرتی ہے۔

بہر حال یوسف اپنی شخصیت میں بہت سے عناصر و خصائص ماجد ہی کی شخصیت کے سمیٹے بیٹھا ہے۔ اس لیے ایک سطح پر اسے ماجد کا ہم زاد کہا جا سکتا ہے۔ ماجد جو 'زود پشیماں' کے ذکر سے خوش نہیں ہوتے تھے تو جہاں اس کا سبب ڈرامے میں بعض تشکیکی خیالات کی موجودگی ہے، وہیں اس کا ایک سبب ان کی محبت کے مطول اور مفصل احوال کے کھل کر سامنے آجانے کا اندیشہ بھی رہا ہوگا۔

.....ماجد کے اس ڈرامے میں کرداروں کی پیکر تراشی عمدہ ہے۔ کرداروں کے عادات و خصائل کا ماجد نے خاص خیال رکھا ہے۔ اور ان کی تعمیر میں اعمال اور مکالمات سے مناسب مدد بھی لی ہے۔ پھر خود کلامی کے عناصر بھی اس میں شامل کیے ہیں۔ جس سے کرداروں کی کشمکش باطنی کا اندازہ ہوتا ہے۔ داخلی اور خارجی تصادم سے قاری یا ناظر کے تجسس کو بھی مہمیز کیا ہے۔ اور فتح و شکست اور پیش قدمی و پسپائی کے مناظر بھی دکھا رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ ان کا کوئی غیر معمولی کارنامہ نہیں ہے۔''[1]

مولانا ماجد دریابادی کلام اللہ کے مفسر تھے، اور درجنوں کتابیں سیرت و سوانح پر بھی لکھی ہیں۔ شاید اسی وجہ سے انھوں نے اس ڈرامے کا انتساب اپنے نام سے مناسب نہیں سمجھا۔ مگر اس سے یہ مطلب نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ یہ ڈرامہ فنی و ادبی اعتبار سے ناقص ہے۔

مولانا ماجد صاحب کا ایک دوسرا نامکمل ڈرامہ 'بدسرشت' بھی ہے۔ یہ ڈرامہ رسالہ الناظر لکھنو میں شائع ہوا مگر مکمل نہ ہو سکا۔

مولانا ماجد کی شاعری اور ڈرامہ کے متعلق ان کے بھتیجے اور داماد عبدالعلیم قدوائی صاحب کی رائے بہت ہی معتدل و مناسب ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''غرض یہ کی شاعری اور ڈرامہ کی طرف مولانا نے زیادہ توجہ نہ کی بلکہ

---

[1] مولانا عبدالماجد دریابادی احوال و آثار: ڈاکٹر تحسین فراقی: ص: ۴۸۷۔۴۸۸۔۴۸۹

آخر میں تو اس کو اپنی دور جاہلیت کی یادگار سمجھنے لگے تھے مگر ان کی ادبی زندگی اور
طرز فکر کے مطالعہ میں اس کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔''[۱]

مولانا کا شعری سرمایہ بہت مختصر ہے مگر پھر بھی اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ان کے کلام میں زبان و بیان کی چاشنی، شاعری محاسن کا غیرہ کا استعمال بڑے فنکارانہ انداز میں کیا گیا ہے۔ اسی طرح ان کے ڈراموں کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا کہ مولانا ڈرامہ کی فنی خوبیوں اور خامیوں سے بخوبی واقف تھے، ان کے ڈراموں میں کردار نگاری، مکالمہ نگاری پیکر تراشی، زبان و بیان وغیرہ کا استعمال بڑی خوبی سے کیا گیا ہے۔ آخر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا اگر شاعری اور ڈرامہ کی طرف توجہ کرتے تو وہ یقیناً بڑے شاعر اور کامیاب ڈرامہ نگار ہوتے۔

---

[۱] مولانا عبدالماجد دریابادی حیات وخدمات: عبدالعلیم قدوائی: ص: ۱۳۰

باب سوم

عبدالماجد دریابادی کی تنقید وتحقیق

عبدالماجد دریابادی بحیثیت نقاد

ادب اور تنقید کی ابتدا ایک ساتھ ہوئی ہے۔ان دونوں کا رشتہ روح اور جسم جیسا ہے۔تنقید کے معنی کھرے کھوٹے میں فرق کے ہیں۔لیکن اعلی درجے کی تنقید میں تخلیقی شان بھی مضمر ہوتی ہے۔ یہ تنقید محض اچھے برے کا فیصلہ ہی نہیں کرتی بلکہ فن پارہ کی تفہیم میں قاری کی مدد بھی کرتی ہے۔اور فن پارہ کی خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر کر کے اسے فنی عظمت بھی عطا کرتی ہے۔تنقیدی عمل میں کبھی فن پاروں کی تشریح وتوضیح ہوتی ہے، تو کبھی اس کے فنی محاسن ومعائب کی نشان دہی کی جاتی ہے۔

ادبی تنقید کی دو نوعیتیں ہیں۔ایک وہ جو تخلیقی عمل میں فنکار کی مدد کرتی ہے۔ دوسری وہ ہے جو فن پارہ کے وجود میں آجانے کے بعد اپنا عمل شروع کرتی ہے۔تنقید کی کارفرمائی اسی وقت سے شروع ہوجاتی ہے جب فن کار کے ذہن میں کوئی تخلیقی خاکہ جنم لیتا ہے۔تخلیقی عمل کے دوران ایک فن کار بہت سے الفاظ اور مواد کی کمی زیادتی کرتا رہتا ہے، یہ کمی زیادتی ہی فن کار کا تنقیدی شعور ہوتا ہے۔ اس فن کار کا تعلق مصوری، سنگ تراشی، مجسمہ سازی، شاعری وغیرہ کسی بھی فن سے بھی ہوسکتا ہے۔فن کار کی یہ تنقیدی کاوش اور شعور ناقدانہ فکر ونظر ہی اس کے فن کو لازوال بنادیتی ہے۔

ٹی ایس .ایلیٹ کا یہ قول برحق معلوم ہوتا ہے۔''جب ایک تخلیقی ذہن دوسرے سے بہتر ہوتا ہے تو اکثر اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جو بہتر ہوتا ہے وہ تنقیدی صلاحیت زیادہ رکھتا ہے۔'' یہ تنقید کا پہلا مرحلہ ہے۔ جس میں ایک تخلیق کار بذات خود اپنے فن پارے کا ناقد ہوتا ہے۔

فن پارہ جب وجود میں آتا ہے تو تنقید اسے جانچنے پرکھنے کا کام کرتی ہے، اور اس کے محاسن ومعائب کو نشان زد کرتی ہے۔معروضیت اور غیر جانب داری تنقید کا بنیادی وصف ہے۔ایک نقاد فنکار کی نفسیاتی اور اس کے شعور ولاشعور کا مطالعہ کر کے فن پارے کا تعین قدر کرتا ہے۔ اعلی درجے کی تنقید تخلیق

کے اعلی وادنی ہونے کا فیصلہ حتمی انداز میں نہیں کرتی ہے۔ بلکہ وہ فن پارے کی صراحت اور تحلیل و تجزیے سے کام لیتی ہے۔ اس عمل سے گذرنے کے میں نقاد کو بہت سے نشیب وفراز سے گذرنا پڑتا ہے۔ وہ فن پارے کو مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے اور اس کی باریکیوں تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ تخلیق کے معاصرین، معاشرہ اور ماحول کا جائزہ لیتا ہے۔ اس تنقیدی کاوش کے لیے وہ تمام علوم وفنون سے مدد حاصل کرتا ہے، جوفن پارے کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں، اور نقاد تب تک تلاش وجستجو کرتا ہے جب تک فن پارہ کی تہہ تک نہیں پہنچ جاتا ہے۔ گویا وہ تخلیق کی تشریح نہیں کرتا بلکہ اپنے اوپر تخلیقی عمل طاری کر لیتا ہے، اور اسی نشیب وفراز سے گذرنے لگتا ہے جس سے تخلیق کار گذر چکا ہوتا ہے۔ نقاد کا کام بہت پیچیدہ ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ نقاد کا مطالعہ بہت وسیع اور نظر گہری ہو اور ناقدانہ وادبی شعور بہت بالیدہ ہو اور وہ ادب کے ساتھ ساتھ تمام علوم وفنون سے واقفیت رکھتا ہو۔ عالمی ادب کے قدیم وجدید رجحانات سے بھی پوری طرح باخبر ہو۔ نہ وہ روایت کا پرستار ہو نہ اس سے بیزار۔ ایسا نقاد صحیح معنوں میں تنقید کا حق ادا کرسکتا ہے۔ اور ایسی تنقید کسی بھی اعتبار سے اعلی فن پاروں سے کم تر نہیں ہوتی۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کا بطور نقاد تعارف کرانے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زمانے کے ادبی اور تنقیدی منظر ناموں اور ادبی رجحانات کا مختصر جائزہ پیش کر دیا جائے۔ تاکہ مولانا کے تنقیدی مسلک اور ادبی شعور کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

اردو میں باضابطہ تنقید کا آغاز حالؔی کی کتاب 'مقدمہ شعروشاعری' سے مانا جاتا ہے۔ حالؔی نے پہلی مرتبہ ادبی تنقید کو ایک باضابطہ علم قرار دے کر اس کے اصول وضوابط وضع کیے۔ شعروسخن پر اصولی اور نظریاتی مباحث کے ساتھ ساتھ شاعری اور سماج کے تعلق کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے ان نظریات ومباحث کو ایک اساس فراہم کیا ہے۔ حالؔی کی یہی تنقیدی اساس بعد کے نقادوں کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ حالؔی نے غزل کی ہئیت اور بے معنی قسم کے روایتی اور فرسودہ مضامین پر بھی اعتراض کیا ہے۔ انھوں نے ردیف وقافیہ کی اہمیت کا خاص اعتراف نہیں کیا ہے، اور غزل کی مشرقی وروایتی اصطلاحات مثلاً 'آمد' 'آورد' وغیرہ کے تصور کو بھی مسترد کیا ہے۔ نیچرل یا فطری شاعری کا ایک خاص تصور حالؔی نے پیش کیا ہے۔ مقدمہ کے بعض مباحث ایسے ہیں جو آج بھی اہم ہیں۔ مثنوی وغیرہ پر حالؔی کی عملی تنقید آج کے نقادوں کے لیے ہدایت نامہ ہے۔

حالی کی طرح علامہ شبلی نعمانی نے بھی عملی و نظری تنقید کے عمدہ نمونے چھوڑے ہیں۔ شبلی کے مطالعہ میں تنوع اور وسعت تھی۔ مشرقی شعروادب پر شبلی کی نظر زیادہ عمیق تھی۔ یوں علامہ شبلی نعمانی کی زیادہ شہرت صاحب اسلوب نثر نگار، سوانح نگار اور مورخ کی حیثیت سے ہوگئی تھی۔ لیکن شبلی کا تنقیدی شعور بھی بہت بالیدہ تھا۔ ان کی تفہیمی صلاحیت بہت اعلیٰ تھی۔ وہ متون کی گہرائیوں تک بہت آسانی سے پہنچ جاتے تھے۔ البتہ جذباتیت کے باعث ان کے تنقیدی نظریات شدت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ 'موازنہ انیس ودبیر' میں اس نوع کے تنقیدی افکار کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ جس میں شبلی نے انیس کی یک طرفہ وکالت کی ہے۔ اور ایک کامیاب وکیل کی طرح انیس کے مقدمہ کو قاری کی عدالت میں پیش کیا ہے، اور انیس کو دبیر کے بالمقابل بڑا اور اہم شاعر قرار دیا ہے، یہ ایک الگ بات ہے کہ اردو میں تقابلی تنقید کی بنیاد شبلی کے ہاتھوں موازنہ کے ذریعہ رکھی گئی۔ تقابلی تنقید کی بنیاد رکھنے کی حیثیت سے شبلی کی عظمت مسلم ہے۔ علامہ شبلی کی شعر العجم مشرقی تنقید اور شعری روایت میں بنیادی حیثیت کی حامل تصنیف ہے۔ پانچ جلدوں پر مشتمل یہ تصنیف فارسی شاعری کی تاریخ ہی نہیں بلکہ چوتھی جلد میں شبلی نے اصول شعر کو واضح کیا ہے، اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر بصیرت افروز تنقیدی بحث اور اصناف سخن کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ شبلی محاکات اور تخیل کو شاعری کا اہم عنصر قرار دیتے ہیں۔

انیسویں اور بیسویں صدی کو اردو ادب اور اردو تنقید کا عبوری دور تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اسی دور میں اردو شاعری اور نثر مختلف خیالات ورجحانات کا آئینہ خانہ بنی ہوئی تھی۔ نئے نئے تجربات اسلوب اور ہیئت سے متعلق ہو رہے تھے۔ اس دور میں معروف شخصیات نے اپنی فنی و ادبی عظمت کا سکہ چلا رکھا تھا۔ مثلاً سرسید احمد خان، حالی، شبلی، محمد حسین آزاد، سرشار، عبدالحلیم شرر، مہدی افادی، مولوی عبدالحق، امداد اثر، چکبست، عبدالرحمٰن بجنوری، عبدالسلام ندوی، وحید الدین سلیم، سر عبدالقادر، سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان عظیم شخصیات نے اردو شعروادب کو جدید فنی تقاضوں سے ہم آہنگ کیا، اور اردو کو اس قابل بنایا کہ دنیا کے تمام موضوعات ومضامین کو اپنے دامن میں جگہ دے سکے، اور دنیا کی بڑی سے بڑی زبانوں کے بالمقابل آسکے۔ گرچہ اس زمانے میں تنقید کسی نظریہ ورجحانات کی علم بردار نہیں تھی۔ بلکہ تنقید صرف تنقید تھی۔ پھر بھی ان ادبی شخصیات کے یہاں مختلف تنقیدی دبستانوں کا عکس نظر آتا

ہے۔ جیسے شبلی کی تنقید میں جمالیاتی اور تقابلی رجحانات پائے جاتے ہیں ،اور وحیدالدین سلیم کے یہاں لسانیاتی تصورات ملتے ہیں ، وہ معنی کو الفاظ پر ترجیح دیتے ہیں ۔عبدالرحمٰن بجنوری ومہدی افادی کے یہاں تاثراتی تنقید کے رجحانات نظر آتے ہیں ۔اور مولانا ماجد دریابادی کے یہاں بھی تاثراتی ، جمالیاتی تنقید کی جھلک نظر آتی ہے۔ اسی طرح سبھی ادیبوں کے یہاں الگ الگ اور کہیں کہیں مشترکہ تاثرات کی چھاپ نظر آتی ہے۔ بیشتر ادیبوں کے یہاں مغربی ادب سے واقفیت اور مرعوبیت کا رجحان غالب نظر آتا ہے۔ لیکن حالی، شبلی ، آزاد کے علاوہ کسی کو فن تنقید میں پورے طور پر کامیابی نہ مل سکی۔

مولانا ماجد کا تنقیدی شعور اور ان کی ناقدانہ بصیرت مذکورہ ادبی وتنقیدی ماحول میں پروان چڑھی۔ مولانا ماجد کی تنقیدی تحریروں کا مطالعہ کرتے وقت اس بات کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ کہ ادیب یا ناقد کے نقطہ نظر میں وہ سارے عناصر کارفرما ہوتے ہیں۔ جو اس کے دل ودماغ پر طاری رہتے ہیں ۔سماج معاشرہ اور خاندانی تربیت کا اثر اس کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔ مولانا کو مذہبی علوم ،نفسیات ، فلسفہ ، تاریخ ،تصوف ، ادبیات وشخصیات وغیرہ سے بڑی دلچسپی تھی ۔ یہی سبب ہے کہ ان کی تنقیدی کاوشوں پر ان علوم کا پرتو دیکھا جاسکتا ہے۔ انھوں نے باقاعدہ کوئی تنقیدی تصنیف نہیں لکھی ۔ پھر بھی ان کے مختلف مضامین ، مقالے ، تبصرے جو مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوئے ، بعد میں انھیں مضامین کو کتابی شکل میں شائع کیا گیا، مولانا کی ان تحریروں میں ان کی تنقیدی بصیرت کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ جس زمانے میں یہ مضامین لکھے گئے اس وقت اردو تنقید کی حدود بندی نہیں ہوئی تھی ، اور تنقید کو مختلف دبستانوں میں تقسیم بھی نہیں کیا گیا تھا۔ چونکہ مولانا کا مطالعہ وسیع اور متنوع تھا اور ان کو کئی زبانوں اور علوم پر قدرت حاصل تھی ، اس لیے ان کے مضامین میں فلسفہ ،نفسیات ، جمالیات ،تاثرات اور ضلع جگت کا استعمال بکثرت ہوا ہے۔ مولانا کا اسلوب تحریر بڑا دلکش تھا، اور ان کی تنقیدی تحریروں میں بھی تخلیقی شان پائی جاتی ہے۔ احتشام حسین نے مولانا ماجد کی تنقیدی اور ادبی قدرومنزلت کا اعتراف اس طرح کیا ہے۔

> ''مولانا عبدالماجد دریابادی کی تنقیدی بصیرت پر نگاہ کرتے وقت اس بات کا یاد رکھنا ضروری ہے۔ کہ ایک ادیب کے نقطہ نظر کی تشکیل میں وہ سارے عناصر کام کرتے ہیں ۔ جو نقاد کے ذہن پر چھائے رہتے ہیں ۔ انھوں نے

مذہبیات، علوم اخلاق، نفسیات، سماجی محرکات، تاریخ افکار، تصوفِ، ادبیات اور شخصیات ہر ایک سے گہری دلچسپی لی ہے۔ مطالعہ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔ طالب علمانہ دور چھوڑ کر تقریباً ساٹھ سال سے یہ مشغلہ غور وفکر کے ساتھ جاری ہے اور اس کے عملی نتائج ہزار ہا صفحات کی شکل میں بکھرے ہوئے ہیں۔ جن کے تنوع کا یہ حال ہے کہ اگر اس میں ایک طرف زود پشیماں ہے تو دوسری جانب تفسیر ماجدی۔ ایک جانب ہلکے پھلکے موضوعات پر نثری مضامین کا سلسلہ تو دوسری جانب تصوف اسلام، ایک طرف فلسفہ اجتماع ہے تو دوسری طرف مختصر تبصرے اور کتابوں کے پیش لفظ ان سب کے اندر ایک ہی روح کارفرما ہے، ایک خاص طرح کی تنقیدی بصیرت جو تاثراتی اور شخصی ہوتے ہوئے بھی استدلالی رنگ رکھتی ہے۔ اپنی بات کہنے کے جوش میں حقائق کو نظر انداز نہیں کرتی''[1]

مولانا ماجد نے تنقید کے لیے جو زبان واسلوب استعمال کیا ہے، وہ بحث طلب ہے کہ ایسی زبان واسلوب تنقید کے لیے مناسب ہے یا نہیں۔ مولانا خود اپنی تحریروں کو انشا کا نام دیتے ہیں، تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ انھوں نے شعوری طور پر تنقید نہیں لکھی ہے۔ بلکہ مختلف موضوعات پر انھوں نے اپنے خیالات ونظریات کو عام فہم انداز میں قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ ہاں اگر وہ شعوری طور پر تنقید لکھتے تو یقیناً اردو تنقید میں ایک اضافہ ہوتا۔ پھر بھی ان کی تحریروں کی تنقیدی کاوشیں تحقیق طلب ہے، اور ان کی تحریریں اعلی تنقیدی بصیرت کا عمدہ نمونہ پیش کرتی ہیں۔ مولانا ماجد نے احتشام حسین سے اپنے ریڈیائی انٹرویو کے دوران اپنے مضامین ومقالات کے متعلق یہ بیان دیا تھا۔

''مضامین عبدالماجد نامی کتاب ایک ناشر صاحب نے بغیر میری اجازت کے چھاپ ڈالی۔ مقالات ماجد بیشک میری ترتیب دی ہوئی ہے۔ اس کا نام ایک ناشر صاحب کا طبع زاد ہے۔ میں تو اسے انشاء ماجد کہلاتا یا پھر ادبی مقالات۔[2]

مولانا نے احتشام حسین کے اس سوال کا مذکورہ جواب دیا تھا۔'' آپ کے جو ادبی مضامین

---

[1] مولانا عبدالماجد کی تنقیدی بصیرت (مضمون) مولانا عبدالماجد دریابادی: فروغ اردو: (عبدالماجد دریابادی نمبر) اگست تا اکتوبر ۱۹۷۷ء لکھنو: ص:۹۹

[2] نشریات ماجد (جلد دوم): مرتب عبدالعلیم قدوائی: ص:۵۱

'مضامین ماجد' 'مقالات ماجد' اور 'اکبر نامہ' میں شامل ہیں، کیا ان کے علاوہ بھی کوئی مجموعہ زیر طبع یا زیر ترتیب ہے؟''

مولانا کی تنقیدی تحریریں فکر وفلسفہ، زبان وبیان، اصطلاحات اور مغربی وضع کردہ ادبی معیار وپیمانوں سے پورے طور پر پاک ہیں۔ مولانا ماجد کسی فن پارہ کی تحسین وتعین قدر میں کسی مخصوص نقطہ نظر، دبستان، تحریکات، کا سہارا نہیں لیتے بلکہ فن پارے کو پڑھنے کے بعد ان کے دل ودماغ پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں، ان کا برمحل وبرجستہ اظہار عام فہم اور سادہ الفاظ میں کر دیتے ہیں۔ چونکہ مولانا تنقید کو مستقل کوئی فن نہیں مانتے تھے اور نہ ہی وہ نقاد کے الگ ادبی وجود کو تسلیم کرتے تھے۔ اسی وجہ سے مولانا کا قلم ایک نقاد کا قلم نہیں لگتا بلکہ ایک قاری اور تخلیق کار کا قلم معلوم ہوتا ہے، اور اس قلم سے بعض ایسی تحریریں لکھی گئی ہیں جو تنقیدی رنگ وآہنگ کی حامل ہیں۔ مولانا کا نقاد وتنقید کے متعلق یہ بیان ان کے تنقیدی مسلک کو واضح کرنے کے لیے اہم معلوم ہوتا ہے۔

> ''اب یاران طریقت نے تنقید کو ایک مستقل فن بنا لیا ہے، شاخ در شاخ اور پیچ در پیچ اور نقادی کو ایک پیشہ ٹھہرا لیا ہے۔ میں اتنا دماغ کہاں سے لاؤں، اور اپنی زبان کی ترکیب وترتیب فرنگی سانچے میں کیسے فٹ کرلوں؟ میرے جی کو تو وہی سیدھی سادی روش مولانا شبلی اور حسرت موہانی کی لگتی ہے، اور مرزا ہادی رسوا کا یہ قول نہیں بھولتا کہ ''بھئی میں تو غالب کا عاشق رہا ہوں۔ مدتوں دیوان غالب سرہانے رکھ کر سویا ہوں۔ لیکن جو شعر پہلی ہی مرتبہ سمجھ میں نہ آیا۔ اسے دوبارہ نہ پڑھا۔ یہ سمجھ لیا کہ یہ میرے لیے نہیں۔ شعر پر جب غور کرنا پڑا تو وہ فلسفہ ہو گیا۔ شعر کہاں رہا۔''[۱]

مولانا فن پاروں میں ادبیت کے ساتھ سادگی، صداقت، اخلاق وکردار اور شرافت کے بھی متلاشی ہوتے تھے۔ وہ ادب میں سوقیت، عریانیت، فحاشی کو کسی قیمت پر گوارا نہیں کرتے۔ ادب یا آرٹ کے نام پر کسی طرح کی غیر اخلاقی، غیر اسلامی، اقدر وروایات اور تہذیب کے بھی وہ قائل نہیں ہیں مولانا کی اسلام سے دلی وجذباتی وابستگی ہمہ وقت ان کے دل ودماغ پر طاری رہتی ہے۔ اسی وجہ سے غیر اسلامی

۱؎ نشریات ماجد (جلد دوم): مرتب عبدالعلیم قدوائی: ص:۵۱۔۵۲

وغیر شرعی باتوں کو ادب میں وہ برداشت نہیں کرتے۔ مولانا اسلام کی سربلندی اور اس کی عظمت کے اتنے قائل تھے، کہ وہ کسی بھی مقام پر خواہ وہ ادب، صحافت، سماج، معاشرہ ہر جگہ وہ اسلامی پرچم کو سربلند دیکھنا چاہتے تھے، اور اپنے فکر و خیال سے مطابقت رکھنے والی باتیں اس میں سے تلاش کر کے بطور عبرت وموعظت پیش کرتے تھے۔ مولانا ایک انصاف پسند نقاد کی طرح فن پارے کے محاسن ومعائب کی بلاخوف وتردد نشان دہی کر دیتے ہیں۔ فن کار کی شخصیت چاہے جتنی بلند و بالا ہو، اگر اس کے فن پارہ میں کوئی ادبی یا اخلاقی نقص ہے، تو مولانا کا قلم فوراً اس کی گرفت کرتا ہے۔ بغیر اس کی پرواہ کیے کہ اس کا لکھنے والا بہت بڑا شخص ہے۔ مثلاً سجاد ظہیر، پریم چند، سعادت حسن منٹو، عزیز احمد، جوش ملیح آبادی وغیرہ۔ مولانا ماجد کی تنقیدی تحریریں غیر جانب داری، معروضیت اور استدلالی اعتبار سے بہت منفرد وممتاز ہیں۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ مولانا کی کوئی باقاعدہ تنقیدی تصنیف نہیں ہے۔ لیکن ان کے ذریعہ لکھے گئے بعض ادبی وتنقیدی مقالے، کتابوں پر تبصرے، مقدمے، تقریظیں، تحقیقی مقالوں کے رپورٹ وغیرہ سے مولانا کی تنقیدی تحریروں کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ اکبر الہ آبادی کے فن وشخصیت پر مولانا نے بعض معرکتہ الآرا تنقیدی مقالے ومضامین قلم بند کیے ہیں۔ ان مضامین میں مولانا کا تنقیدی جوہر اور ان کی ناقدانہ بصیرت کا عکس پورے طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ اکبر الہ آبادی پر لکھے گئے مضامین کتابی شکل میں 'اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں' کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے۔ مولانا کے چند اہم تنقیدی مضامین کا اجمالی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

'الکلام' میں علامہ شبلی نعمانی نے باری تعالی کا وجود اور نبوت کو استدلالی ومنطقی انداز میں مغربی ومشرقی مفکرین کے خیالات ونظریات کی روشنی میں ثابت کیا ہے۔ یہ کتاب جب منظر عام پر آئی تو اس وقت عقلیت کے پرستار اور مادیت وسائنس کے طرف دار طالب علم مسٹر عبدالماجد نے اپنی ذہانت اور ناقابل تسخیر استدلالی صلاحیت کا ثبوت پیش کرتے ہوئے 'الکلام' کا پوسٹ مارٹم کر ڈالا۔ مولانا چونکہ اس زمانے میں مذہب اور روحانیت سے دور تھے اور دشت الحاد کے صحرانورد ہو چلے تھے۔ اس لیے انھوں نے اس کتاب میں بیان کی گئی ان تمام باتوں پر خط تنسیخ کھینچ دیا جو ان کے معیار اور عقلیت، مادیت کے پیمانے پر پورے نہ اترتے تھے۔ یہ مضمون رسالہ 'الناظر' لکھنو میں یکم مارچ ۱۹۱۰ء سے یکم جنوری ۱۹۱۱ء تک قسط وار شائع ہوا۔ اس مضمون کے سلسلے میں مولانا اپنی 'آپ بیتی' میں لکھتے ہیں۔

''مولانا شبلی کی علمیت وقابلیت کا سکہ ۱۹۰۶ء و ۱۹۰۷ء میں دل پر بہت گہرا بیٹھا تھا، لیکن کالج میں آکر لاادریت، تشکیک ولا دینی کے سیلاب میں وہ زیادہ نہ ٹک سکا۔ الٹی خود انھیں پر تنقید شروع کر دی ۱۹۱۰ء کا زمانہ تھا کہ ان کی کتاب 'الکلام' پر ایک زبردست تنقید سوا سو صفحہ کی ضخامت کی ماہ نامہ 'الناظر' کے لیے 'ایک طالب علم' کے نام سے لکھی اور اس میں ۶، ۷ قسطوں میں نکلی، تنقید دراصل اسلامی بنیادی عقائد وجود باری، رسالت' وغیرہ پر تھی، صرف آڑ مولانا کے نام کی تھی، انداز چونکہ شبلی ہی کا تھا یعنی بجائے مناظرانہ ومجادلانہ کے علمی وادبی اس لیے شہرت بھی بہت ہوئی، اور نفس خوب موٹا ہوا۔ 'الناظر' کے ایڈیٹر صاحب خود بڑے دین دار وعبادت گذار تھے، لیکن مولانا شبلی سے سخت ناخوش رہتے، اس لیے ایسے ملحدانہ مضمون کو بھی خوشی خوشی چھاپ دیا، رازداری اس مضمون کے لیے خاص طور پر رہی، اور لوگ برابر اس کھوج میں لگے رہے کہ لکھنے والا کون ہے؟''[۱]

مولانا ماجد کی ادبی تنقید میں 'الکلام' کی تنقید کا ذکر اس لیے ضروری ہے، کہ مولانا کی یہ تنقید ان کی پہلی کوشش ہے۔ جو ادبی نہ ہونے کے باوجود استدلالی اور منطقی ہے۔ مولانا نے 'الکلام' پر تنقید حقائق اور شواہد کی بنیادوں پر کیا ہے۔ انھوں نے اس تنقیدی تحریر کے شروع ہی میں بتایا ہے کہ ہر ادیب وفنکار ہر فن مولا نہیں ہوتا۔ ضروری نہیں ہے کہ اس کو جملہ علوم فنون پر یکساں قدرت حاصل ہو۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے اس کا تذکرہ اس طرح کیا ہے۔

''ماجد نے اس سلسلۂ تنقید کی پہلی قسط کا آغاز اس کلیہ سے کیا ہے کہ علم وفن کی دنیا میں عموماً دیکھا گیا ہے کہ ایک میدان میں کمال حاصل کرنے والا عموماً دوسرے شعبوں میں اس درجے اور مرتبے کو قائم نہیں رکھ سکتا۔ اس ضمن میں انھوں نے سعدی، فردوسی، امام بخاری، اور ڈیوڈ ہیوم کی مثالیں دی ہیں۔ سعدی اخلاقی نظم کے آدمی ہیں لیکن رزم میں نہیں چلتے۔ فردوسی اقلیم رزم کا تاج

---

[۱] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۲۱۳-۲۱۴

دار ہے، لیکن بقول ان کے بزم کی سرحد میں قدم رکھتے ہی بے بس ہو جاتا
ہے۔ امام بخاری حدیث میں سند تامہ کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن تاریخ نگاری
کرتے ہوئے تمام رطب ویابس کو اکٹھا کر دیتے ہیں۔ ہیوم اعلیٰ درجے کا
مورخ ہے لیکن تاریخ مرتب کرتے وقت تعصّبات ملکی کو اس کثرت سے دخل
دیتا ہے کہ اس کو اعتبار و استناد کے مرتبے سے ساقط کرنا پڑتا ہے۔''[۱]

مولانا ماجد دریابادی نے یہ مضمون عقل کی فکر اور معقولات کی روشنائی سے لکھا تھا۔ اس لیے جو مذہبی عقائد عقل وفلسفہ کے معیار پر پورے نہیں اترتے اس کو انھوں نے بلا دریغ ناقص قرار دے دیا۔ فکری ونظریاتی اعتبار سے مولانا نے 'الکلام' پر جو اعتراضات کیے ہیں، ان کا تذکرہ اقتباسات کے ذریعے کیا جارہا ہے۔

''الکلام تصنیف تو درکنار صحیح معنوں میں تالیف بھی نہیں کہی جاسکتی بلکہ
وہ درحقیقت مصر کے اہل قلم فرید وجدی کے خیالات کا اردو زبان میں خلاصہ
ہے۔ ہمارے مولانا چونکہ یورپین زبانوں سے ناآشنا ہیں اس لیے انھوں نے
یورپ کے متعلق اپنا تمام سرمایہ معلومات فرید وجدی کے خزانہ خیالات سے
قرض لیا لیکن افسوس یہ ہے کہ مولانا نے انتخاب میں غلطی کی۔ فرید وجدی مذہبی
جماعت میں خواہ کسی حیثیت سے علامہ تسلیم کیا جاتا ہو لیکن یورپ ومشرق کے
درمیان سفیر کی حیثیت سے وہ نہایت ناقابل اعتماد وغیر معتبر ہے۔ اس نے اپنی
تصانیف میں جس قدر تدلیس وتحریف سے کام لیا ہے اس کی پردہ دری کے لیے
ایک مستقل رسالہ کی ضرورت ہے۔.... الکلام میں متعدد مقامات پر جو یورپین
حکماء کے اقوال درج ہیں ان کے متعلق خوش عقیدہ اردو داں پبلک سمجھتی ہے کہ
یہ اقوال براہ راست اصل تصانیف سے اور صحیح معنی میں اقتباس کیے گئے ہوں
گے، لیکن اس طلسم کو توڑنے کے لیے ہم ذیل میں ایک مثال درج کرتے ہیں۔
''الکلام میں دو مقامات پر ہربرٹ اسپنسر کا مندرجہ ذیل مقولہ نقل کیا گیا
ہے۔ ''ان تمام اسرار سے جن کی یہ کیفیت ہے کہ جس قدر ہم زیادہ غور کرتے ہیں

---

[۱] مولانا عبدالماجد دریابادی احوال وآثار: ڈاکٹر تحسین فراقی: ص:۱۶۱

اسی قدر وہ اور غامض ہوتے جاتے ہیں۔اس قدر قطعی ثابت ہوتا ہے کہ انسان کے اوپر ایک ازلی وابدی قوت موجود ہے جس سے تمام اشیاء صادر ہوتی ہیں۔

اور دونوں مواقع پر اس سے استشہاد کیا گیا ہے کہ بڑے بڑے حکیموں اور فلسفیوں نے انتہائے غور وفکر کے بعد خدا کے ثبوت میں یہ استدلال پیش کیا ہے جیسا کہ خود مولانا کو مسلم ہے انھوں نے براہ راست یہ قول اسپنسر کی کسی تصنیف سے نقل نہیں کیا بلکہ یہ ماخوذ ہے فریدی وجدی کی کتاب 'حدیقہ فکریہ' سے لیکن تعجب یہ ہے کہ خود فرید وجدی نے بھی اسپنسر کی اصلی تصنیف کا مطالعہ نہیں کیا بلکہ اس نے ایک مصری عالم کی کتاب 'ثمرۃ الحیٰوۃ' سے نقل کیا جو ترجمہ ہے سر جان لبیک کی تصنیف ''یوز آف لائف'' کا اور اسپنسر کی کسی خاص تصنیف کا حوالہ لبیک صاحب کی کتاب میں بھی نہیں ہے! لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت ناک اس کا موقع استشہاد ہے۔فرید وجدی اور مولانا شبلیؒ اس سے یہ معنی لیتے ہیں کہ ہربرٹ اسپنسر خدا کا قائل تھا اور اس کے ثبوت میں اس نے یوں استدلال کیا تھا۔لیکن سر جان لبیک کی اصل کتاب جس کے یہ دونوں خوشہ چیں ہیں ہمارے سامنے موجود ہے، وہ اس کو خدا کے ثبوت میں پیش نہیں کرتا بلکہ یہ ظاہر کرنے کو کہ ہماری عقل راز ہائے عالم کا انکشاف نہیں کرسکتی اور اکثر امور میں ہم کو اپنی ناواقفیت وجہالت پر قانع ہونا پڑتا ہے۔....مذہبی جماعت کے نزدیک وہ عقل ناقص ہے جو کسی مذہبی عقیدے کے مخالف ہو چنانچہ خود پروفیسر شبلی اس بات پر سر سید سے ناراض ہیں کہ اس بیچارے نے معقولات سے قرآن کی تشریح کرنی چاہی تھی حالانکہ ہمارے علامہ کے نزدیک منقول کی بنا پر معقول کی تاویل کرنا چاہیے۔....جس طرح آفتابِ علم کے سامنے توہمات کی تاریکی دور ہو جاتی ہے، اسی طرح جوں جوں سائنس کی تعلیم عام ہوتی جائے گی اسی نسبت سے مذہب کا اثر بھی زائل ہوتا جائے گا۔''[1]

---

[1] بحوالہ مولانا عبدالماجد دریابادی احوال وآثار: ڈاکٹر تحسین فراقی: ص: ۱۶۲۔۱۶۳۔۱۶۴

مولانا کی یہ تنقیدی تحریر یک رخی نہیں تھی کہ صرف اس کی کمیوں یا خامیوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ بلکہ مولانا ماجد نے شبلی نعمانی کی صلاحیت اوران کی تخلیقی وادبی عظمت کا اعتراف بڑی فراخ دلی اور خندہ پیشانی سے کیا ہے۔نظریاتی اختلاف کے ساتھ ساتھ حقائق کا اظہار بھی اس تحریر کا خاص وصف ہے۔مولانا نے شبلی کی تصانیف سے کسب فیض کیا ہے،اس کا بھی اعتراف اس تنقید میں کیا ہے۔مولانا ماجد اپنے مضمون میں لکھتے ہیں۔

''وہ خطابی جملوں کو منطقی دلائل کا قائم مقام نہیں بناتے بلکہ علی العموم ان سے لطف لٹریچر پیدا کرنا چاہتے ہیں۔تمام کتاب میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ملتا جو متانت کے خلاف ہو جس سے کسی فریق کی دل آزاری و دل شکنی ہوتی ہو۔نہ کسی مقام پر طعن وتشنیع ہے نہ کہیں توہین وتحقیر کے الفاظ ہیں۔....ایک اور قابل ذکر خوبی جو مولانا شبلی کی تمام تصنیف میں مشترک ہے ان کا دل آویز طرز بیان ہے،اور علم کلام جیسے خشک مضمون میں اس دل آویزی کا نمایاں طور پر نظر آنا اور بھی قابل ستائش ہے۔....خاتمہ پر ہم کو ایک خطرناک غلط فہمی کا رفع کر دینا ضروری ہے جو ممکن ہے کہ اس تنقید سے کسی کے ذہن میں پیدا ہوئی ہو۔ممکن ہے کوئی شخص اس مطالعے سے یہ نتیجہ نکالے کہ راقم تنقید کو مصنف 'الکلام' کی لٹریری عظمت ووقعت سے انکار ہے،لیکن اگر کوئی اس نتیجہ پر پہنچتا ہے تو اس کو یقین کر لینا چاہیے کہ اس کا قیاس سرتاسر غلط اور قطعاً بے بنیاد ہے۔راقم تنقید اپنی ابتدائی زندگی میں جس قدر مولانا شبلی کی تصانیف سے فیض یاب ہوا ہے،اتنا کسی دوسرے سے نہیں۔اور آج بھی تحقیقاتی حیثیت سے اس پر مولانا کا جو بار احسان ہے،وہ باستثنا ایک انگریزی فلاسفر کے تمام دنیا میں کسی دوسرے مصنف کے احسانات سے کم درجہ پر نہیں لیکن عقیدت،ارادت اور احسان مندی کی تمام قوتوں سے زیادہ زبردست طاقت صداقت پرستی کی ہے۔''[1]

اسی مضمون کے آخری حصہ میں مولانا ماجد نے فن تنقید کے نظری وعملی اصول کی وضاحت کی

---

[1] بحوالہ مولانا عبدالماجد دریابادی احوال وآثار: ڈاکٹر تحسین فراقی :ص:۱۶۶۔۱۶۷

ہے، اور اپنے تنقیدی مسلک کا اظہار صریح الفاظ میں کیا ہے۔ مولانا کے یہ جملے ان کے تنقیدی نقطہ نظر کی تفہیم میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں اس لیے کہ انھیں نظریات وخیالات پر مولانا نے ایک نقاد کی ذمہ داریاں اور اس کے حدود کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''ناقدین پر ایک عام الزام ہے کہ ان کی نگاہ ہمیشہ عیوب ونقائص پر پڑتی ہے اور وہ مصنف کی صرف غلطیوں اور فروگذاشتوں کو پبلک میں ظاہر کر دینا اپنا فرض خیال کرتے ہیں، اور سچ یہ ہے کہ یہ الزام بے بنیاد نہیں۔ ملک میں جن تحریروں کو تنقید کہا جاتا ہے وہ عموماً دو طرح کی ہوتی ہیں۔ اگر تنقید نگار مصنف کا ہم خیال یا دوست ہے تو سرے سے مداحی کے گلدستے پیش کرنا شروع کر دیتا ہے، اور اگر اس کے معائب کے متعلق کوئی لفظ زبان سے نکالتا بھی ہے تو اس قدر ضعیف اور دھیمی آواز میں کہ مدح سرائی کے ہنگامہ خیز غلغلہ میں یہ صدا کسی کے کان تک نہ پہنچے۔ برعکس اس کے اگر ناقد کو کسی وجہ سے مصنف سے مخالفت ہے تو تصنیف زیر تنقید ہر قسم کے اعتراضات کی ہدف بن جاتی ہے۔ اس کی جزوی فروگذاشتوں کو نہایت اہمیت دی جاتی ہے اور قدم قدم پر اس کی مخالفت کی جاتی ہے۔ لیکن یہ دونوں طریقے سخت معیوب ونا پسندیدہ ہیں اور ایسی تحریروں کو تنقید کے نام پر یاد کرنا واقعیت پر ظلم کرنا ہے۔ ایک نقاد کو درحقیقت افراط وتفریط سے علحدہ ہوکر کامل دیانت داری اور راست بازی کے ساتھ بجائے خود ہر ایک مسئلہ پر غور کرنا چاہیے اور اس کا فرض ہے کہ جس آزادی کے ساتھ ادنی سے ادنی نقائص کی پردہ دری کرتا ہے اسی فیاضی کے ساتھ خفیف سی خفیف خوبیوں کا اعتراف کرے۔''[۱]

مولانا ماجد دریابادی کا یہ مضمون چھ قسطوں میں 'الناظر' میں شائع ہوا تھا۔ پہلی قسط میں مولانا نے اس اصول کو مدلل انداز میں پیش کیا ہے، کہ کوئی شخص تمام شعبوں کا ماہر وکامل نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ ایک میدان میں اگر کامل ہے تو دوسرے میدان میں وہ نااہل بھی ہوسکتا ہے۔ دوسری قسط میں مولانا نے 'فطرت

۱؎ بحوالہ مولانا عبدالماجد دریابادی احوال وآثار: ڈاکٹر تحسین فراقی: ص: ۱۶۵۔۱۶۶

انسانی اور حاسۂ مذہب' کے عنوان سے لکھا تھا اس قسط میں یہ بتایا گیا ہے کہ 'الکلام' فرید وجدی کی کتاب 'حدیقہ فکریہ' کی پیروی میں شبلی نے انسان اور ایمان کے تعلقات سے بحث کی ہے۔ تیسری قسط میں وجود باری پر اور چوتھی قسط میں نبوت ومعجزات پر، اور پانچویں میں روحانیت پر اور چھٹی اور آخری قسط میں انھوں نے 'الکلام' کے محاسن پر قلم اٹھایا ہے اور اپنا تصور نقد بھی بیان کیا ہے۔

مولانا جس زمانہ میں سائنس وعقل کو اپنا امام تصور کرتے تھے، تو بڑے جوش وخروش کے ساتھ ہمہ وقت مادیت کی تشریح اور روحانیت کی تردید میں لگے رہتے تھے۔ لیکن جب ان کے ذہن ودماغ پر اسلامی عظمت اور عشق رسول اور توحید باری تعالی کا غلبہ ہوا تو مسٹر عبدالماجد مولانا عبدالماجد بن کر اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اسلام کی تبلیغ واشاعت اور اسلامی عقائد کی تشریح وتعبیر میں صرف کرنے لگے۔ انھوں نے اسلام کو اپنا معیار وپیمانہ بنالیا تھا، اور اسی پیمانے پر دنیا کی تمام چیزوں کو تولتے تھے۔ جو کھرا اترتا تھا اس کی تحسین کرتے تھے، ورنہ اس کی تردید کردیتے تھے۔ 'الناظر' کی تنقید کے بعد کی تمام تنقیدی تحریروں میں مولانا کی اسلامی فکر اور مشرقی اخلاق واقدار کی عکاسی بکثرت ہوئی ہے۔

اکبرنامہ یا اکبر میری نظر میں

مولانا عبدالماجد دریابادی کی ایک اہم تنقیدی تصنیف 'اکبرنامہ یا اکبر میری نظر میں' ہے۔ یہ کتاب اکبر الہ آبادی کے فکروفن، ذات وشخصیت پر لکھے گئے مختلف مضامیں کا مجموعہ ہے۔ جنھیں مولانا نے مختلف مواقع اور اوقات میں قلم بند کیا تھا۔ 'اکبرنامہ' میں شامل مضامین کی تعداد تیرہ ہیں ان میں سے چند مضامین کے عنوانات اس طرح ہیں۔ پیام اکبر، نیا آئین اکبری، گاندھی نامہ، کلیات جدید اکبر الہ آبادی، نیا کلام اکبر، اکبر الہ آبادی نئے لباس میں، تائبہ کی موت، ایک سچا قصہ وغیرہ۔ یہ مضامین ۱۹۲۱ء سے ۱۹۵۱ء کے درمیان لکھے گئے ہیں۔ ۱۹۵۴ء میں ادارہ فروغ اردو لکھنو نے 'اکبرنامہ یا اکبر میری نظر میں' کو کتابی شکل میں شائع کیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۸ء میں حبیب احمد قدوائی مرحوم کی کاوشوں سے شایع ہوا۔ اس کا تیسرا ایڈیشن ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ سے ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔ یہ ایڈیشن بہت ہی عمدہ اور دیدہ زیب ہے۔ اس ایڈیشن کو عبدالعلیم قدوائی صاحب نے مرتب کیا ہے۔

مولانا ماجد چونکہ اکبر کے نیاز مندوں میں تھے۔ وہ اکثر وبیشتر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے

رہے، اوران کے تغزل، ظرافت اوراعلی درجہ کی لسانی، سیاسی شعور فلسفیانہ اور عارفانہ نکات سے متاثر ومحظوظ ہوتے رہے۔ مولانا ماجد اکبر الہ آبادی سے اپنے تعلقات اور فکری وقلبی وابستگی کا اظہار 'اکبر نامہ' میں 'تعارف' کے عنوان سے کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

> ''راقم آثم کی سب سے پہلی حاضری دربار اکبری میں اپریل ۱۹۱۲ء میں ہوئی اور ادھر ۲۰/سال کی عمر کا طالب علم ادھر ۶۱/سال کا ایک بزرگ۔ نیاز مندی کے یہ تعلقات بڑھتے گئے۔ اور آں مخدوم کے وقت وفات تک قائم رہے۔ ادھر سے عقیدت وتکریم تو کچھ واجبی سی ہی تھی۔ ادھر سے شفقت وکرم کی البتہ کوئی حد ہی نہ تھی۔ ۹/ برس کی مدت کچھ ایسی کم نہیں۔ بات کہتے ولطف وانبساط کا زمانہ گزر گیا اور اپنی صرف حسرت ناک یاد چھوڑ گیا۔ حضرت اکبر بارہا اس دوران میں لکھنو میں تشریف لائے اور کئی بار اس نیاز مند کو بھی الہ آباد یا پرتاپ گڑھ میں یاد فرمایا۔ اور خط وکتابت تو کثرت سے رہا کرتی تھی۔''[۱]

اکبر کی شاعری اس زمانے میں اپنے شباب پر تھی۔ جب ہندوستان تہذیبی، سیاسی، سماجی، اقتصادی اعتبار سے انقلاب اور تغیر زمانہ کا شکار تھا۔ مغربی تہذیب وتمدن، روایات واقدار کا غلبہ ہندوستان کے بام ودر پر نظر آرہا تھا۔ مغربی آفتاب کی شعائیں مشرقی تمدن اور اقدار کو اپنی ضو باریوں سے منور کر رہی تھیں۔ محکوم وغلام ہندوستان برطانوی اقتدار کے ساتھ ساتھ ان کی تہذیب وتمدن کا غلام بنتا جارہا تھا۔ اس خاص ماحول میں مشرقی تہذیب وتمدن کی بازیافت اور پاسداری کا فریضہ اکبر الہ آبادی کی شاعری انجام دے رہی تھی۔ اکبر الہ آبادی کی شخصیت میں حب الوطنی اور مشرقی تہذیب کا خمیر رچا بسا تھا۔ وہ ہمہ وقت اپنی مٹتی ہوئی تہذیب اور ختم ہوتی قدروں کو بچانے کی فکر میں مصروف رہتے تھے۔ مغرب کی اندھی تقلید اور مغربی وضع قطع کی پیروی وغیرہ کو وہ ذلت کا سبب مانتے تھے۔ برطانوی اقدار اور ان کی لائی ہوئی تمام چیزوں سے اکبر کو سخت نفرت تھی۔ اسی وجہ سے ان کی شاعری طنز وظرافت کی چاشنی کے باوجود مزاحمت اور احتجاجی رویوں کی بھی ترجمان ہے۔

مولانا عبدالماجد پہلے نقاد ہیں جنھوں نے اکبر کی شخصیت اوران کے کلام کی عظمت کا دل سے

---

[۱] اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں: عبدالماجد دریابادی: ص: ۲۷۷

اعتراف کیا ہے، اوران کے فکروفن کی تشریح وتعبیر بھی کی ہے۔کلام اکبر کی تفہیم مولانا ماجد کے ان مضامین کے بغیر ادھوری مانی جائے گی۔کلام اکبر کی فنی عظمت اوراس کی روح و پیغام کوعوام میں متعارف کرانے کے لیے مولانا ماجد نے ایک سچے قدردان اور نقاد کا کردار ادا کیا ہے۔جس طرح سے غالب کو شہرت وعظمت دلانے اورلوگوں میں متعارف کرانے میں حالی کا اہم کردار ہے۔اسی طرح اکبرالہ آبادی کو شاعری کا اکبر اعظم بنانے میں اورلسان العصر کے مسند پر جلوہ افروز کرانے میں مولانا ماجد کا اہم کردار ہے۔

مولانا ماجد دریابادی کی کتاب 'اکبرنامہ یا اکبر میری نظر میں' اکبرالہ آبادی کوان کے صحیح اسلامی فکر، مشرقی روایت، کے تناظر میں دیکھے جانے کی پہلی باضابطہ کوشش ہے۔اکبر کے زمانے میں ان کے فکروفن کا مکمل تعارف اورترجمانی اس کتاب کے ذریعہ بحسن خوبی ہوئی ہے، اوراس کتاب کے ذریعے اکبرالہ آبادی پہلی بار ایک جامع ومربوط اور معتدل شخصیت کے طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔

اردو میں بعض نقاد ایسے ہیں جو جانب داری، تنگ نظری، اور تعصب میں ڈوب کرفن تنقید کو مجروح کرتے ہیں، ادب کی تعمیر کے بجائے تخریب کرتے ہیں۔چند اسی قسم کے نقادوں نے تعصب کی روشنائی میں اپنے قلم کو ڈبوکر اکبرالہ آبادی کے فن وشخصیت کوداغ دار کرنے کی ناکام کوشش کی ہے، اوراکبر کی شخصیت میں تضاد کا پہلونکال کر بقول خود اپنا تنقیدی فرض ادا کیا ہے۔بعض نے اکبر کو ہنسوڑ ظریف کہہ کر ٹال دیا ہے، اکبر کوان کی زندگی میں اگر چند لوگوں نے ان کی شخصیت اورفن کو سمجھا بھی تو ان کی آواز دیوار سے ٹکرا کر واپس آگئی۔لیکن مولانا ماجد کی صدا اتنی بھاری تھی کہ سبھی کے کانوں تک پہنچ گئی۔مولانا کی تنقیدی تحریروں کی بدولت اکبر کی شخصیت وفن کونئی سمت وشناخت عطا ہوئی، اور کچھ دنوں کے بعد نقادوں کا ایک بڑا طبقہ کلام اکبر کا قدردان اورمداح ہوگیا۔

مولانا ماجد اکبرالہ آبادی کو بیسویں صدی کے نصف اول میں اقبال کا ہم رتبہ فن کارومفکر تصور کرتے تھے، اوراس کے لیے ان کے پاس ٹھوس ثبوت ودلائل موجود تھے۔اکبر کی وفات کے دو چار مہینے بعد ہی مولانا نے ایک مفصل مضمون 'پیام اکبر' کے عنوان سے قلم بند کیا، اور یہ مضمون پہلی بار رسالہ 'اردو' اورنگ آباد کے دونمبروں میں اکتوبر ۱۹۲۲ء اور اپریل ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا تھا، اوراب یہ مضمون 'اکبرنامہ' میں شامل ہے۔اس مضمون میں مولانا ماجد کی تنقیدی بصیرت پورے طور پر واضح ہوتی ہے۔انھوں نے اس مضمون میں

اکبر کی ہمہ گیرو ہمہ جہت شخصیت اور ان کے کلام کے پانچ اہم عنوانات ''ظرافت و زندہ دلی، سیاسیات، عشق وتغزل، اخلاق ومعاشرت، اور تصوف، معرفت وفلسفہ'' کے تحت جائزہ لیا ہے۔ لیکن مولانا مرحوم پانچویں عنوانات 'تصوف، معرفت وفلسفہ' پر نہ لکھ سکے اور اس کتاب میں چار عنوانات شامل ہیں۔ مولانا ماجد نے بالعموم عملی تنقید کے نمونے چھوڑے ہیں۔ وہ نظری تنقید یا تنقید کے اصول وضوابط پر ناقدانہ رائے دینے کے بجائے تخلیق کی تحسین، تعبیر، تشریح اور تعین قدر پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ ان کی تنقیدی رائے ایک صاحب فہم قاری کی رائے ہوتی ہے۔

مولانا کسی بھی فن پارہ پر تنقید کرتے وقت اس کی فنی وفکری معائب ومحاسن کے ساتھ ساتھ تخلیق کار کے معاصر ادبی رویوں اور سیاسی ومعاشرتی منظرناموں کو بھی نشان زد کرتے ہوئے فن کار کے ردعمل کو بھی پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا تنقیدی نظریہ تعمیری تنقید کا تھا۔ وہ فن پاروں کے ادبی معیار کے ساتھ ساتھ اس کے فکری اور اخلاقی پہلوؤں پر گہری نظر رکھتے تھے۔

اکبر ایک ایسے فن کار تھے جنھوں نے ہندوستان کے ہنگامہ خیز ماحول اور سیاسی، سماجی، تہذیبی قدروں کی پامالی اپنے نظروں سے خود دیکھا تھا۔ اسی طوفانی خیز سیاسی، سماجی، معاشرتی وتمدنی لہروں کے مد مقابل اپنے فکروفن کی تخلیق کر رہے تھے۔ مولانا ماجد بھی اسی عہد انقلاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اسی لیے وہ اکبر کے اشعار کو اپنے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ محسوس کرتے تھے، اور مولانا کو اکبر کے اشعار میں اپنے خوابوں کی تعبیر نظر آتی تھی۔ مولانا ماجد کی تنقید کو بھلے ہی آپ کلام اکبر کی توضیح وتشریح قرار دیں۔ لیکن عصری حالات کی سنگینی کو جس شدت سے اکبر محسوس کرتے تھے اسی شدت سے مولانا ماجد بھی اس پر مضطرب تھے۔ شاعر کے معاشرتی، سماجی، سیاسی، تمدنی تناظر سے اس قدر آگاہ اور اس کا رمز وشناس مولانا ماجد کے علاوہ دوسرا کون ہوسکتا ہے۔ مولانا نے اپنے ممدوح شاعر کی ذہانت، فطانت، جدت طبع اور ملک وملت کے لیے اس کی بیکراں ہمدردی واخلاص کو اس طرح اجاگر کیا ہے اور اس کے لیے ایسے موزوں ومناسب اشعار اپنے قارئین کے لیے پیش کیا ہے کہ قاری اکبر کے تخلیقی جوہر اور بنی نوع کے لیے ان کی بے لوث ہمدردی ودردمندی کا قائل ہوجاتا ہے۔

اردو زبان وادب میں اکبر الہ آبادی کے حقیقی مقام کے تعین میں سب سے بڑی رکاوٹ ان کی

شاعری کی ظرافت ہے۔ان کے اشعار فکر وفن کے ساتھ ساتھ طنز وظرافت سے لبریز ہیں۔ظرافت ہی کلام اکبر کی شناخت ہے۔ بسا اوقات یہی ظرافت ان کے فن کو مجروح بھی کر دیتی ہے اور چھپا بھی لیتی ہے۔اسی لیے وہ اپنے معاصرین میں بھی اور بعد کے ناقدین میں بھی ظریف شاعری کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ مولانا ماجد نے کلام اکبر کی ظرافت کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

''اکبر کی شہرت ومقبولیت کی سب سے بڑی نقیب ان کی ظرافت تھی۔ ان کے نام کو قہقہوں نے اچھالا۔ان کی شہرت کو مسکراہٹوں نے چمکایا۔ ہندوستان میں آج جو گھر گھر ان کا نام پھیلا ہوا ہے۔اس عمارت کی ساری داغ بیل ان کی شوخ نگاری ولطیفہ گوئی ہی کی ڈالی ہوئی ہے۔قوم نے ان کو جانا مگر اس حیثیت سے کہ وہ روتے ہوئے چہروں کو ہنسا دیتے ہیں۔ ملک نے ان کو پہچانا مگر اس حیثیت سے کہ وہ مرجھائے ہوئے دلوں کو کھلا دیتے ہیں۔''[۱]

مولانا نے اپنے مضمون 'پیام اکبر' میں اکبر کی کلیات سوم کو اپنے تنقید کا موضوع بنایا ہے۔اکبر کی عمر ڈھلنے کے ساتھ ساتھ شاعرانہ ظرافت میں کمی آتی گئی، اور آخر میں انھوں نے عشق حقیقی میں پناہ لینی شروع کر دی تھی۔لیکن پھر بھی ان کی ظرافت کا عکس ختم نہیں ہوا تھا۔ بلکہ دھیما ضرور پڑ گیا تھا۔اس کا ذکر مولانا نے کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

''.....کلیات سوم میں خالص ظریفانہ اشعار شاید دس فیصدی بھی نہ نکلیں حالانکہ کلیات اول ودوم میں ظریفانہ اشعار ۳۰ فیصدی سے کسی حال میں بھی کم نہ تھا۔لیکن ہے کہ مقام ازل نے ذہانت، فطانت، شوخی وزندہ دلی کی تقسیم میں ان کے لیے بڑی فیاضی سے کام لیا تھا اس لیے پیرانہ سالی میں بھی ایک طرف صدمات اور خانگی مصائب کے ہجوم اور دوسری طرف دین داری وتصوف کے غلبہ کے باوجود یہ جذبات فنا ہرگز نہیں ہونے پائے۔شمع جھلملا ضرور رہی تھی مگر بجھی نہ تھی آفتاب ڈھل بے شک چکا تھا۔زندہ دلی نہ صرف قائم تھی بلکہ اس قوت کے ساتھ اور اس شدت کے ساتھ کہ دیوان پڑھنے والے متحیر اور کلام سننے

---

[۱] اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں: عبدالماجد دریابادی: ص:۱۴

والے ششدر رہ جاتے تھے۔کلیات سوم میں اس کے نمونے پیشتر کے مقابلے
میں یقیناً کمتر لیکن پھر بھی اچھی خاصی معقول تعداد میں نظر آتے ہیں۔''[۱]

اکبرالہ آبادی کے کلام میں ظرافت تھی۔ ہزالت یا بازاریت نہ تھی۔ان کے یہاں کسی قسم کا پھکڑ پن اور بھونڈا پن نہیں ملتا۔ بلکہ ان کی ظرافت معنی و مفہوم سے لبریز ہوتی تھی۔اکبر ظرافت کے پیرائے میں بڑے سے بڑے مسائل کو پیش کرتے تھے۔سیاسی مسائل پر دل کھول کر اشعار کہتے تھے۔لیکن اس کو عام کرنے میں احتیاط برتتے تھے۔شاید اس کی وجہ ان کی سرکاری ملازمت تھی۔مولانا ماجد'اکبر نامہ' میں لکھتے ہیں۔

''اکبر ظریف تھے، ہزال و فحاش نہ تھے۔دلوں کو خوش کرتے تھے چہروں پر تبسم لاتے تھے جذبات سفلی کے بھڑکانے کی کوشش نہیں کرتے تھے ان کی ظرافت پھکڑ اور ہزل گوئی کے مترادف نہ تھی اکثر صورتوں میں معنویت سے لبریز ہوتی تھی اور محاورہ، لفظی مناسبت، ترکیب کی ندرت، قافیہ کی جدت کے زور سے شعر کو لطیفہ بنا دیتے تھے۔سیاسی مسائل میں رائے بڑی آزاد رکھتے جتنا کہہ جانے میں جری تھے اتنا ہی سنانے میں، چھاپنے میں پھیلانے میں محتاط تھے قدم اتنا پھونک پھونک کر رکھتے تھے کہ مخلصوں اور نیازمندوں تک کو حیرت کی ہنسی آجاتی تھی اور جو اتنے مہذب اور باادب نہ تھے وہ تو جھنجھلاہٹ میں حضرت اکبر کو خدا جانے کیا کچھ کہہ سن ڈالتے تھے۔خیر، ظرافت، اس خاص غرض یعنی سرّ حال کے لیے۔اخفائے خیال کے لیے ان کے ہاتھ میں اچھے لفافے کا، بڑے کارآمد آلہ کا کام دیتی تھی اور جو کچھ اور جس کی نسبت چاہتے اسی پردے میں سنا جاتے۔کچھ اکیلی سیاسیات پر موقوف نہیں۔رند و پارسا، امیر و فقیر، عالم و عامی''صاحب'' اور ''نیٹو''ہندو مسلم، سنی و شیعہ سب کی صحبت میں آمد و رفت رکھتے اور مسجد اور مندر کالج اور اسکول، خانقاہ و میکدہ کاؤنسل اور کچہری، سرکس اور تھیٹر، بازار اور دفتر کے ایک ایک گوشہ میں بے تکلفانہ سیر کرتے پھرتے ایک ایک چہرے کا جائزہ غور سے لیتے رہتے اسے جھانکتے اسے تاکتے۔''[۲]

---

۱ اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں: عبدالماجد دریابادی: ص:۱۴۔۱۵

۲ ایضاً: ص:۱۵۔۱۶

مولانا نے کلام اکبر کا مطالعہ لسانی تہذیبی اور فکری پس منظر میں کیا ہے، اور اکبر کی ظرفت کے فکری نکات کو نشان زد کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ واقعات و حالات جو کلام اکبر کی تخلیق کا محرک بنے ان اشعار کی وضاحت و تشریح مولانا نے استدلالی اور تفہیمی انداز میں پیش کی ہے۔ انھوں نے دوسرے معاصر شعرا کے کلام کو بطور مثال پیش کر کے کلام اکبر کی تفہیم و تشریح کی نئی راہیں نکالی ہیں۔ مولانا کا ایک بڑا تنقیدی کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اکبر کے وضع کردہ خاص استعاروں، علامتوں، تراکیب اور لفظیات مثلاً سید، اونٹ، گائے، مس، شیخ، برہمن وغیرہ جیسے الفاظ کی تشریح کلام اکبر کے سیاق و سباق میں پیش کی ہے۔ مولانا 'اکبر نامہ' میں لکھتے ہیں۔

''لغزشیں ظرافت میں جو کچھ آئیں نظر

دوستوں سے التجا ہے کریں اس کو معاف

سرد موسم تھا ہوائیں چل رہی تھیں برف بار

شاہد معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف

موسم کا اشارہ زیادہ تر سیاسی فضا کی جانب ہے اور ہواؤں سے مراد قانونی شکنجے اور سرکاری گرفتیں ہیں۔ وہ بھی آج (۱۹۴۴ء) کی نہیں۔ اس سے بھی ۳۰/۳۵ سال قبل کی، ان کی ظرفت کا بہت بڑا مظہر سیاسیات کا میدان تھا اور اس باب میں ان کا عمل عارف رومی کی اس تعلیم پر تھا۔

خوشتر آں باشد کہ سرّ دلبراں

گفتہ آید در حدیث دیگراں

اکبران دلبران سیاسی کی ایک ایک ادا کے محرم تھے۔ ان کے اسرار کی منادی وہ سر بازار کرتے لیکن زبان وہی اپنی مخصوص رکھتے۔ جو لوگ ان کی اس بولی سے واقف ہو گئے تھے وہ معنی و مفہوم کو سمجھ کر چشم و ابرو کو جنبش دیتے اور جو تہہ تک نہ پہنچتے وہ بھی بہر حال ایک دل لگی کی بات سمجھ کر ہنس تو پڑتے ہی تھے۔

''بت، صنم، مس، شیخ، سید، سید صاحب، اونٹ، گائے، کلیسا، حرم، دیر، بتکدہ،

کالج، برہمن، لالہ، صاحب'' وغیرہ بیسیوں الفاظ نے لغات اکبری میں کہنا چاہیے ایک مخصوص اصطلاحی حیثیت حاصل کر لی تھی۔''[1]

اکبرالہ آبادی کی ظریفانہ تنقید کا نشانہ مغربی معاشرہ اور تہذیب وتمدن تھا۔ جو مشرقی تہذیب وتمدن پر غالب ہو رہا تھا۔ اکبر کا دائرہ محدود نہیں تھا بلکہ وہ مغربی تہذیب کی بالادستیوں، ظاہری چمک دمک اور مشرقی اقدار وتمدن کے زوال پر گہری نظر رکھتے تھے، اسی کے ساتھ وہ قومی وملی اتحاد کے بھی خواہاں تھے۔ وہ زندگی کے تمام شعبوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ کوئی ایسا گوشہ حیات نہیں جو اکبر کی نظروں سے اوجھل ہو۔ اس کا تذکرہ مولانا ماجد نے نہایت تفصیل کے ساتھ کیا ہے، اور اکبر کے عہد کے سیاسی، تاریخی، معاشرتی، تمدنی، احوال انتشار اور فتنہ وفساد پر ان کے قلبی اضطراب اور بے چینی کا اظہار تشریحی انداز میں کیا ہے، وہ لکھتے ہیں۔

''دھن دیس کی تھی اس میں گاتا تھا ایک دیہاتی
بسکٹ سے ہے ملائم پوری ہو یا چپاتی

''پوری'' اور ''چپاتی'' اور ''بسکٹ'' تینوں کی تلمیحیں بالکل صاف ہیں۔ رہی ''دیس کی دھن'' تو ایک معنی اس کے ظاہری ہیں یعنی وطن کا جوش محبت باقی ''دھن ایک اصطلاح موسیقی بھی ہے اور ''دیسی'' ایک راگ کا نام ہے اور یہ سارا راگ ایک دیہاتی یعنی عامی کی زبان سے۔ نور علی نور۔ اس ردیف کا دوسرا شعر بھی سننے کے قابل ہے۔

شان نماز اکبر شاہانہ ہو چلی ہے
مسجد الگ بنائیں اپنی میاں بفاتی

نماز کی تو تاکید ہے ہی اس لیے کہ شاہ وگدا، آزاد وغلام، خادم ومخدوم ایک صف میں شانہ بہ شانہ کھڑے ہوں اور کم از کم اللہ کے گھر میں آکر تو دن میں پانچ مرتبہ یہ بندوں کے قائم کیے ہوئے امتیازات مٹے رہیں یہاں شیخ صاحب مسجد میں حاضر ہو کر بھی اپنی آقائی وخواجگی کو نہیں بھولتے اور بفاتی اور جمن

---

[1] اکبرنامہ یا اکبر میری نظر میں: عبدالماجد دریابادی: ص: ۱۶۔۱۷

بیچاروں کے لیے کوئی چارہ نہیں رہ جاتا بجز اس کے کہ اپنی مسجد ہی الگ بنائیں۔''[۱]

بیسویں صدی میں انگریزوں کی حکمرانی کے اثرات ملک کے خوش حال طبقہ پر اس قدر مرتب ہو رہے تھے، کہ جو لوگ فرنگی تہذیب وتمدن کو برا بھلا کہہ رہے تھے، وہ بھی اب حکمراں طبقہ کے انعام واکرام پر خوشی کا اظہار کرتے اور اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے۔ اس کا ذکر اکبر نے اپنے اشعار میں کیا ہے۔ جس کی تشریح مولانا ماجد نے اس طرح کی ہے وہ لکھتے ہیں۔

''ایک ذہنیت اس وقت یہ چلی ہوئی تھی کہ زبان سے تو فرنگیت، فرنگی سیاست، فرنگی تہذیب، فرنگی حکومت کو خوب برا بھلا کہا جائے لیکن انھیں حلقوں سے اگر کہیں واہ واہ ہونے لگے، شاباشی ملنے لگے، دادوستائش کی طرح پڑ جائے تو دل اس پر بھی خوشی سے اچھلنے لگتا ہو اور اندر ہی اندر لہر فخر ومسرت کی دوڑ جاتی ہے۔ اکبر کی نظر اس پہلو پر بھی گئی اس کی گرفت اپنے پنجۂ آہنی سے کی۔ صنعت گری کا کمال ملاحظہ ہو کہ فولاد کی صلابت وکرختگی کس خوبی کے ساتھ نرم وگداز مخملی دستانے کے اندر غائب کردی۔

رقیب سرٹیفکٹ دیں تو عشق ہو تسلیم
یہی ہے عشق تو اب ترک عاشقی اولیٰ

فلاں قومی شاعر کا خان بہادر ہو جانا، فلاں خادم ملت کا شمس العلماء بن جانا یہاں تک کہ اقبال کا 'سر' کے خطاب سے سرفراز ہو جانا۔ یہ سب مثالیں اکبری نظریہ کے مطابق اسی رقیب کے دیے ہوئے سرٹیفکٹ کی ہیں۔''[۲]

اکبرالہ آبادی کے تشبیہ واستعارہ کے فن کارانہ استعمال کو مولانا ماجد نے دلچسپ انداز میں سراہا ہے۔ اور اشعار کے ذریعے اس کا ثبوت بھی پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''تشبیہات کی ندرت اکبر کے نسخہ ظرفت کا جز واعظم ہے وہ وہ اچھوتی نادر لطیف تشبیہیں اور کیسی کیسی پھبتیاں انھیں برجستہ سوجھ جاتیں جو دوسروں کے ذہن میں سوچ بچار کر بھی نہ آتیں۔ یہ ہم سب آپ ہی جانتے ہیں اور روز

---

[۱] اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں: عبدالماجد دریابادی: ص:۲۱

[۲] ایضا: ص:۲۱۔۲۲

مرہ دیکھتے رہتے ہیں کہ ایک طرف شوق 'صلاحیت' کا فرنگیت سوار رہتا ہے دوسری طرف کچھ رکھ رکھاؤ کچھ ذات برادری کا ڈر کچھ وضع کا پاس بھی چلے جاتا ہے۔غرض نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے۔ایک تذبذب، گومگو اور دوعملی کا عالم قائم کبھی چار قدم آگے بڑھے تو کبھی چھ قدم پیچھے ہٹ گئے۔کتر بیونت کچھ ادھر سے کچھ ادھر سے جوڑ پھر بھی نہ ٹھیک بیٹھا۔بقول شخصے نہ خدا کی یافت ہوئی نہ صنم کا وصال نصیب ہوا۔ہنسے گئے بنائے گئے قہقہے ادھر سے بلند ہوئے تالیاں ادھر سے پٹیں۔واقعیت کے اس سادہ نقش پر حضرت اکبر کی لگ کاری ملاحظہ ہو ؎

مغربی ذوق ہے اور وضع کی پابندی بھی
اونٹ پر چڑھ کے تھیٹر کو چلے ہیں حضرت

اکبر کے زمانے میں سنیما کہاں تھا تھیٹر ہی سب کچھ تھا، ناٹک دیکھنے کے لیے کسی ثقہ بزرگ کا بہ این جبہ و عمامہ تشریف لے جانا اور پھر اس کے لیے اونٹ کے سے مقدس جانور کا انتخاب جان بلاغت ہے۔کیا کیا انگلیاں اٹھی ہوں گی جب حضرت سلامت کی سواری اس سج دھج سے اونٹ پر نکلی ہو گی۔''[۱]

اکبر کے اشعار کی تعریف کرتے ہوئے مولانا نے ان کی ذہانت، فطانت اور الفاظ و مفہوم کی باریکیوں کا اعتراف بھی کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں۔

''ظرافت کا ایک راز یہ بھی تھا کہ الفاظ و حروف کی باہمی مناسبتوں کی جانب ذہن تیزی سے منتقل ہوتا اور پھر ان مناسبتوں کے بل پر دلچسپ و پر لطف نکتے طرح طرح کے پیدا کرتا رہتا۔فرماتے ہیں ؎

پا کر خطاب ناچ کا بھی شوق ہو گیا
سر ہو گئے تو ''بال'' کا بھی شوق ہو گیا

علاقہ پنجاب کے مقام کیمبل پور کے کوئی مذہبی اہل قلم منشی الف دین

---

[۱] اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں: عبدالماجد دریابادی: ص: ۲۵

نامی تھے ایک کتاب حقانیت اسلام پر لکھی اور حضرت اکبر کے پاس ریویو کے لیے ارسال کی۔ پیر ظریف نے دو مختصر مصرعوں میں جامع و مانع ریویو کر دیا۔

تصنیف و مصنف دونوں پر ۔

''الف دین'' نے خوب لکھی کتاب

ملی جس سے ''ب'' دین کو راہ صواب

پہلے مصرعہ میں ''الف'' کے لام کو ساکن نہیں کسرہ کے ساتھ پڑھیے۔ دوسرے مصرعہ میں اس ''الف'' کے مقابلہ میں ''ب'' پڑھیے سارا کھیل بس اسی ''الف، ب'' کا ہے۔''[۱]

اکبر الہ آبادی کو سیاسی امور و مسائل سے براہ راست دلچسپی نہیں تھی، اور نہ وہ سیاست کے پر خار راہوں کے مسافر تھے۔ لیکن مشرقی رنگ و آہنگ ان کی فطرت میں بدرجہ اتم شامل تھا، اور مذہبی عقائد و ایمان کا ان کے اوپر پورا غلبہ تھا۔ وہ ایک حساس طبیعت کے مالک تھے۔ اسی وجہ سے ہر بات کو دل پر لے لیتے تھے۔ جب کبھی مشرقی تہذیب اور مذہب پر کوئی آنچ آتی تو وہ اس کے دفاع کے لیے بلا دریغ سیاست کی پر خار راہوں میں کود پڑتے، اس تمام سیاسی ناسور اور مہلک زخموں کو طنز و ظرافت کے نوک نشتر سے اور عمل جراہی کا سہارا لے کر معاشرہ کو صحت مند اور توانا بنانے کی کوشش کرتے۔ مولانا ماجد نے اکبر کی سیاسی دلچسپی کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

''سیاسیات سے براہ راست حضرت اکبر کو کبھی دلچسپی نہیں رہی، نہ ان کا یہ فن، نہ اس موضوع سے انھیں کوئی خاص مناسبت، لیکن تھے پورے مشرقی اور مشرقی سے بڑھ کر مذہبی۔ پھر دل و دماغ نہایت درجہ حساس، اس لیے مذہب کی توہین اور مشرقیت کی چوٹ پر تڑپ جاتے اور جب کبھی سیاسی کانٹوں کو مذہب و اخلاق کے دامن سے گستاخیاں کرتے دیکھتے تو قدرتاً یہ بات ان کے دل میں چبھ جاتی، اور مجبوراً خار زار سیاست میں قدم رکھ کر کانٹوں کو ایک ایک کر کے چنتے۔''[۲]

---

۱ اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں: عبدالماجد دریابادی: ص: ۳۵

۲ ایضاً: ص: ۴۹

مولانا نے اکبر کو بطور غزل گو شاعر متعارف کرانے اور ان کے فکر و فن کی قدر و منزلت کو متعین کرنے کی خاص طور پر کوشش کی۔ اکبرالہ آبادی کی شہرت بطور غزل گو نہیں بلکہ نظم گو کی حیثیت سے ادبی دنیا میں قائم ہو چکی تھی۔ 'عشق وتغزل' کے عنوان سے مولانا نے اکبر کے غزلیہ کلام کو کئی ادوار میں تقسیم کیا ہے، اور ہر دور کی غزلوں کے متعلق اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار کیا ہے، اور ان غزلوں کی فکری وفنی محاسن ومعائب کو بھی نشان زد کیا ہے۔ کلام اکبر کا موازنہ دوسرے غزل گو شعراء مثلاً داغؔ، مومنؔ، شیفتہؔ وغیرہ کے کلام سے بھی کیا ہے۔ اکبر کی غزل گوئی کے متعلق مولانا لکھتے ہیں۔

> ''اکبر کی شہرت عام غزل گو کی حیثیت سے نہیں، تاہم کلیات اول دوم میں ان کی متعدد غزلیں اچھی سی اچھی موجود ہیں۔ ایسی کہ ان کی بنا پر انھیں بلا تامل غزل اردو کے استادوں کے پہلو میں رکھا جا سکتا ہے۔.... یہ صحیح ہے کہ اکبر کی عظمت کی بنیاد ان کے عاشقانہ کلام پر نہیں۔ دوسرے اصناف سخن پر ہے۔ لیکن اس کے باوجود خاص تغزل میں بھی ان کا مرتبہ اردو شاعروں میں کچھ گیا گذرا نہیں کہ ان کے لیے باعث توہین ہو۔ اور ان کے پرستاروں کے لیے باعث شرم، روزمرہ، شیرینی اور زبان کی صفائی میں ان کی اکثر غزلوں پر داغؔ کے کلام کا دھوکہ ہو جاتا ہے اور معنوی بلند پروازیوں میں اگر وہ غالب کے ہم سطح نہیں، تو بھی مومنؔ وشیفتہؔ وغیرہ کے طبقہ میں تو انھیں بے تکلف جگہ مل ہی سکتی ہے۔ مثالیں کلام کے ابتدائی اور درمیانی دور میں بکثرت ملیں گی آخر دور میں کمتر۔''[۱]

کلام اکبر میں ایک اہم عنصر 'اخلاق ومعاشرت' کا بھی ہے۔ اخلاق کی سربلندی اور اصلاح معاشرہ بھی اکبر کی شاعری کا خاص موضوع ہے۔ آغاز سے شباب تک ان کی شاعری میں حسن وعشق اور شوخی وظرافت کا اظہار روایتی اور کلاسیکی انداز میں ہوا ہے۔ لیکن ان کے آخری دور کی شاعری پر عشق حقیقی، تصوف، مذہبی فکر وغیرہ کا غلبہ نظر آتا ہے۔ چونکہ اس زمانے کا ہندوستان تہذیبی، سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے شکست وریخت سے دوچار تھا۔ ہندوستان کی نسل نو کے ذہن ودماغ پر مغربی کلچر، روایت واقدار کا

---

[۱] اکبرنامہ یا اکبر میری نظر میں: عبدالماجد دریابادی: ص: ۷۵-۹۶

بھوت سوار تھا۔ نسل نو اور ہندوستانی قوم مشرقی تہذیب وتمدن کو فراموش کر کے مغرب کی تہذیب وتمدن کی پرستار بنتی جا رہی تھی۔ مغرب کی آندھی نے نہ صرف ہمارے اقدار کو تہ وبالا کیا تھا بلکہ ہماری معاشرتی وتہذیبی جڑوں کو بھی اکھاڑ ڈالا تھا۔ اس پر آشوب اور فتنہ پرور ماحول میں یہ کیسے ممکن تھا کہ اکبر جیسا حساس اور قوم پرست فن کار خاموش رہتا۔ اسی لیے کلام اکبر میں روح عصر اور معاصر اخلاقی ومعاشرتی زوال پر اشک باری ہوئی ہے۔ مولانا ماجد کلام اکبر کی معاشرتی واخلاقی پہلو کے متعلق 'اکبر نامہ' میں لکھتے ہیں۔

''اکبر کے صحیفہ کمال کا روشن ترین عنوان اخلاق ومعاشرت ہے۔ ان کی شاعری کی روح یا جان ان کی اخلاقی ومعاشرتی تعلیمات ہی ہیں۔ ابتدائی دور میں تغزل کی شوخیاں غالب تھیں۔ آخری دور میں تصوف کے خرقہ پوش ہو گئے تھے لیکن دو چیزیں ایسی تھیں جنھوں نے اول سے آخر تک کبھی ساتھ نہ چھوڑا۔ بلکہ ہر دور میں رفاقت قائم رکھی۔ پیرایہ ادا کی حد میں انداز بیان کی لطافت وظرافت اور مفہوم سخن وموضوع کلام کے حدود میں اصلاح ومعاشرت وتزکیہ اخلاق۔.....اپنی پستی اور صاحب کی بلندی، اپنی خاک نشینی اور صاحب کی فلک پیمائی دیکھ، حواس بجا کس طرح رہ سکتے تھے۔ خصوصاً جب کہ اپنے دل ودماغ کا سرمایہ پہلے ہی لٹ چکا ہو۔ ہوش گم، نگاہیں خیرہ۔ عقل دنگ، مرعوبیت غالب، دماغ مفلوج، ڈوبتے کو گھاس کے تنکے کا سہارا کافی نظر آیا۔ اندھیرے میں اپنے ہی سایہ پر بھوت کا گمان گذرا، اِلتِباس حواس میں دیو میں پری کا حسن وجمال معلوم ہوا۔ دیر میں حرم کا تقدس دکھائی دینے لگا۔ .....دنیا کی تاریخ میں یہ واقعہ انوکھا نہیں زبردست، جب کمزوروں پر غلبہ پا جاتے ہیں تو بس یہی ہونے لگتا ہے۔ ہر چیز یہ انھیں کی عینک سے یہ خود بھی دیکھنے لگتے ہیں اور اب نہ اپنی عقل باقی رہ جاتی ہے نہ اپنی نظر اور تاریخ والوں کا بیان ہے کہ قوموں کی قسمت میں یہ دستور ازل سے لکھا چلا آ رہا ہے۔.....تو یہ تھی وہ فضا جس میں اکبر نے آنکھیں کھولیں۔ یہ تھا وہ ماحول جس کے اندر

انھیں اپنا پیام پہنچانا تھا۔ رسمی شاعر نہ تھے۔ ہوتے تو پھر کوئی ایسی بات نہ تھی۔ ....لیکن مشکل یہ تھی کہ صاحب نظر تھے۔ ایک خاص دل و دماغ رکھتے تھے اور ایک خاص مقصد حیات لے کر آئے تھے۔ ایک مخصوص پیام کی تبلیغ کا بار ان کے شانہ پر تھا یوں کہیے کہ فطرت کی جانب سے ایک ''رسول'' بن کر آئے 'صاحب کتاب' حقیقی رسولوں کے جانشیں اور ادنی خادم۔ دل کڑھا دماغ متاثر ہوا۔ آنکھوں نے بہت کچھ دیکھ لیا جو دوسروں کی نظروں سے اوجھل تھا۔ ان کا پیام اس تحریک مغربیت کے خلاف ردعمل تھا۔ ان کی شاعری اول سے آخر تک اسی مادیت فرنگ کا جواب ہے۔ ان کی ترکش کا ایک ایک تیر اسی نشانہ پر لگتا ہے۔ ان کے فلسفہ، ان کی ظرافت، ان کی سیاسیات کے دائرہ کی ایک معمولی سی بھی پیمائش ممکن نہیں تاوقتیکہ نظر اس مرکزی نقطہ نظر پر نہ جمائی جائے۔ یہ رنگ موجود شروع ہی سے تھا۔ سن و تجربہ میں پختگی کے ساتھ نکھرتا گیا۔ یہاں تک کہ آخر میں ہر ساز سے یہی نغمہ پیدا ہونے لگا۔''[۱]

مولانا نے اکبر کے تاثر واحساس کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ بالکل اصل کے مطابق اور زندگی سے بھرپور ہے۔

'گاندھی نامہ' اکبر کے کلام کا ایک مختصر مجموعہ ہے۔ جو ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اکبر کے اس مجموعہ پر مولانا ماجد صاحب کا تنقیدی تبصرہ جو ۱۱ر جون ۱۹۴۸ء میں صدق میں شائع ہوا تھا۔ 'گاندھی نامہ' میں جنگ آزادی اور خلافت تحریک، مہاتمہ گاندھی کی ذات اور شخصیت، ترک موالات تحریک، وغیرہ کی تائید وحمایت میں کہے گئے اشعار ہیں۔ یہ اشعار اکبر کی حب الوطنی اور ان کے آزادی کے جذبوں کے ترجمان ہیں۔ بابائے قوم مہاتمہ گاندھی کی محبت میں اس مجموعے کا نام 'گاندھی نامہ' رکھا گیا ہے۔ اس مجموعے کی ترتیب واشاعت کے متعلق مولانا ماجد لکھتے ہیں۔

''قیاس ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اس سارے کلام کو یعنی جو کچھ بھی گاندھی جی اور ان کی تحریک ترک موالات وغیرہ کے سلسلہ میں تھا، یکجا کر دینے کا خیال آیا تھا۔ بہر حال وہ ۱۹۲۰ء بلکہ اغلباً ۱۹۲۱ء کا مرتب کیا ہوا۔ رسالہ

---

[۱] اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں: عبدالماجد دریابادی: ص: ۹۷-۹۹-۱۰۱

اس وقت سے اب تک یوں ہی مسودہ کی شکل میں پڑا رہا۔اور شائع اب جا کر ہوا۔جب نہ خود گاندھی جی باقی رہے ،نہ تحریک خلافت ،نہ تحریک ترک موالات اور نہ خود وہ حکیم وظریف شاعر! کتاب کے حصے جا بجا اب بھی دلچسپ ہیں۔اور کیوں نہ ہوتے کلام بہر حال اکبر کا کلام ہے۔لیکن پورا لطف صرف وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جو آج سے ایک ربع صدی قبل کی تلمیحوں سے پوری طرح واقف ہوں اور تو اور خود حضرت مرتب بہ ایں فضل وخوش فہمی پوری واقفیت نہ ہونے کے باعث بار بار دھوکا کھا گئے ہیں۔''[۱]

'گاندھی نامہ' کے بارے میں لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اس میں اکبر کے غیر مطبوعہ اشعار شامل ہیں لیکن مولانا نے تحقیق وتلاش کے بعد یہ ثابت کیا ہے، کہ اس میں شامل چند اشعار رسائل وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں۔اس کے علاوہ مولانا نے بعض اشعار کی تشریح اور مختلف اسماء کی تصحیح کا کام بھی کیا ہے۔عام طور پر کلام میں انگریزی نام اور عہدوں کا استعمال ہوا ہے، چند لوگوں کا خیال تھا کہ اشعار میں مستعمل یہ سارے نام وعہدے فرضی یا خیالی ہیں۔مولانا نے اس کی بھی تردید کی۔اور تحقیق سے یہ ثابت کیا کہ یہ نام فرضی نہیں ہیں۔بلکہ ان سب کا وجود تھا۔وہ لکھتے ہیں۔

''کتاب کے سارے کے سارے اشعار اب تک غیر مطبوعہ نہ تھے۔ متعدد اشعار یہ راقم آثم حضرت اکبر کی بیاض سے اپریل ۱۹۲۰ء میں (جب وہ پرتاب گڑھ میں اپنے صاحب زادے کے ہاں مقیم تھے) نقل کر لایا تھا اور اسی زمانہ میں رسالہ معارف (اعظم گڑھ) میں انھیں شائع بھی کرا دیا تھا۔اور ایک قطعہ (نئی روشنی کا ہوا تیل کم) صفحہ ۲۸/۲۷ کا بھی اسی زمانہ میں چھپ جانا اچھی طرح یاد ہے۔خیال ایسا پڑتا ہے کہ بدایوں کے ماہنامہ نقیب میں نکلا تھا۔....

پالیٹکس جھگڑے چھوڑ دو
ان باتوں سے اب منھ موڑ دو

---

[۱] اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں: عبدالماجد دریابادی: ص:۱۶۶

کیسے ڈائر کیسے ہنٹر
لاؤ اب ساغر لاؤ کنٹر

اس پر مرتب کا حاشیہ ڈائر تو تقریباً صحیح ہے کہ ڈائر لاہور کے فوجی افسر کا نام تھا۔ لیکن ہنٹر پر وہ صرف اس قدر لکھ کر رہ گئے کہ ہنٹر ایک فرضی نام معلوم ہوتا ہے۔ گو انگریزوں میں یہ نام عام ہے۔ حالانکہ ہنٹر اس مشہور انگریز بیرسٹر کا نام ہے جو اس تحقیقاتی کمیشن کا صدر تھا۔ جو ڈائر شاہی مظالم کی تحقیق کے لیے مقرر ہوا تھا۔ اگر ۲۰ء کے اخبارات کی فائیلیں اٹھا کر دیکھی جائیں تو کالم کے کالم ہنٹر کمیشن کی یہ کاروائیوں سے پر نظر آئیں گے۔''[1]

'کلیات جدید اکبر الہ آبادی' یہ مضمون مولانا ماجد کا ایک نشریہ ہے۔ جو لکھنو ریڈیو سے ۲۷ر جنوری ۱۹۴۹ء کو نشر کیا گیا تھا۔ اس مضمون میں مولانا ماجد نے اکبر کے آخری دور کے کلام کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ چونکہ انسان کی شخصیت وفکر میں وقت وحالات کے ساتھ تبدیلی آتی جاتی ہے۔ جوانی میں اس کی فکر دوسری ہوتی ہے، اور کبر سنی میں اس کا انداز فکر دوسرا ہو جاتا ہے۔ عمر کے آخری حصے میں سبھی پر مذہب، تصوف، روحانیت اور عشق حقیقی کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ اکبر چونکہ ہمیشہ سے مذہبی فکر و ذہنیت کے حامل تھے۔ اس لیے آخری عمر میں مذہبی جذبہ اور روحانیت سے ان کی دلچسپی اور شدید ہوگئی تھی۔ اکبر کے آخری زمانے کے کلام کی تفہیم میں مولانا کا یہ مضمون کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''آخر عمر تک پہنچتے پہنچتے اور دنیا کے گرم وسرد تجربے ہوتے ہوتے مذہبیت یوں بھی آجاتی ہے اور پھر حضرت اکبر تو ماشاءاللہ شروع ہی سے اپنی شوخیوں اور شوخ کلامی کے ساتھ بڑا گہرا مذہبی رنگ اور بڑی گہری عرفانی نظر رکھتے تھے۔ منزل پیری پر پہنچے تو واقعی ایک شیخ وقت یا مرشد طریق بن چکے تھے۔ توحید معرفت فنا وعبرت کا رنگ کلام میں جھلکتا ہوا ہمیشہ سے تھا۔ اب غزل کے جام سے بھی یہی مضمون چھلکنے لگا۔ اور قطعہ ہو یا رباعی، مثنوی ہو یا غزل ہر صنف کلام سے یہی چشمہ ابلنے لگا۔''[2]

---

[1] اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں: عبدالماجد دریابادی: ص: ۱۶۵-۱۶۶

[2] ایضاً: ص: ۱۷۶

مولانا ماجد کا اصل کارنامہ اکبر کے حوالے سے یہ مانا جاتا ہے، کہ انھوں نے کلام اکبر کی تنقید سے کہیں زیادہ تشریح کی ہے۔ اس لیے بطور شارح کلام اکبر میں مولانا ماجد کا مرتبہ و مقام بہت منفرد و ممتاز ہے۔ کلام اکبر کی تفہیم میں مولانا کے تمام مضامین بنیادی حیثیت کے حامل ہیں ۔ مولانا نے کلام اکبر کی تشریح و تعبیر کے ساتھ ساتھ کلام اکبر کی روح اور اس کی فکر کو عام فہم بنا کر قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ کلام اکبر کے نقاد، شارح، حاشیہ نگار کی حیثیت سے اولیت کا تاج مولانا ماجد ہی کے سر ہے۔

جن حضرات کی نظر سے حضرت اکبر اور ان کے کلام، پیام اور فلسفہ کے متعلق مولانا ماجد کی مفصل و معتبر شہادت نہیں گذری وہ اس لحاظ سے محروم کہے جائیں گے کہ وہ اردو کے اس باکمال شاعر کو پورے طور پر سمجھ نہیں پائیں گے۔ اپنے کو ترقی پسند یا جدید لکھنے، کہلانے والے ایسے بھی ہوئے ہیں جو ان کے کلام کی معنویت اور ان کے پیام کی حکمت و موعظت کو یا تو بالکل ہی نہ سمجھ پائے یا اپنی محدود بصیرت سے اس کے بالکل غلط معنی نکالے۔ بہر حال ایسے حضرات کی اردو ادب میں کوئی عزت کی جگہ نہیں حاصل ہے۔

اقبالیات ماجد

اکبر الہ آبادی کی طرح مولانا ماجد نے دوسرے صاحب پیام شاعر علامہ اقبال کے خیالات و نظریات اور ان کے فلسفہ حیات کو جامع و مختصر انداز، تشریحی و توضیحی لب و لہجہ میں پیش کیا ہے۔ اقبالیات پر لکھے گئے مولانا کے مضامین، تبصرے، شذرات وغیرہ کی حیثیت بنیادی متن کی ہے۔ یہ مختصر ضرور ہیں مگر ان مضامین کی تشریح اگر تفصیل سے کی جائے تو ایک مبسوط مقالہ تیار ہو سکتا ہے۔ مولانا کی اقبالیات سے متعلق تمام تحریریں، مکتوبات، پیامات، مضامین، تبصرے، وغیرہ کو جمع کر کے اقبال اکیڈمی حیدرآباد نے 'اقبالیات ماجد' کے عنوان سے اپنے ترجمان رسالہ 'اقبال ریویو' اپریل ۲۰۰۰ء کے خصوصی شمارہ میں شائع کیا ہے۔ سید خلیل اللہ حسینی اپنی تحریر 'دو ایک باتیں' میں اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

> ''ذکر اقبال کے شعر و حکمت کا، مولانا ماجد کی زبان قلم سے۔ اس پر اور کیا تبصرہ بن پڑے۔ اقبال نے اپنے خیالات کے اظہار و ابلاغ کے لیے ''حرف نیش دار'' اور ''حرف پیچ دار'' دونوں کا خوب استعمال کیا۔ ان پر مولانا ماجد کی نظر بڑی گہری ہے۔ وہ الحاد و عقلیت کی راہ سے معرفت کی منزل تک

پہنچے۔یہی وجہ ہے کہ مولانا ماجد کی تحریر میں ایک منفرد توازن ہے۔زیرنظر تحریریں، بیشتر اقبال کی کتابوں پر تبصرہ کا حکم رکھتی ہیں۔اس کے علاوہ شذرات اور پیامات بھی ہیں جو''سچ''اور''صدق''میں شائع ہوئے۔یہ تبصرے اگر چہ مختصر ہیں،لیکن مولانا ماجد کی نکتہ رس،جدت فکر اور منفرد انداز بیان کے آئینہ دار ہیں۔بڑی مسرت کی بات ہے کہ اقبال اکیڈمی حیدرآباد نے ان بکھرے موتیوں کو ایک لڑی میں پروکر صاحبان فکر ونظر کے آگے پیش کر دیا ہے۔''[1]

'اقبالیات ماجد' میں شامل مضامین کے عنوانات کچھ اس طرح ہیں۔''اقبال، پیام اقبال، شکوہ جواب شکوہ، جنون الحاد، مغرب کی ترقی کا راز،شیشہ اور موتی، پس چہ باید کرد، ضرب کلیم، دانش حاضر، جاوید نامہ، ارمغان حجاز، دو لفظ مرد خدا کی یاد میں، مکاتیب، نطشے، رومی اور اقبال، پیام''۔مولانا ماجد دریا بادی کی یہ تحریریں اقبال کی شخصیت اور فکروفن اور ان کی جملہ تخلیقات پر مختصر اور جامع انداز میں روشنی ڈالتی ہیں۔اقبالیات ماجد کی تمام تحریریں اقبالیات کی تفہیم وتشریح میں کلیدی حیثیت کی حامل ہیں۔

مولانا نے' پیام اقبال' کے عنوان سے اقبالؔ کی شاعری ان کی شخصیت اور ان کی پیامبری کو چند الفاظ میں پیش کیا ہے۔یہ پیام اقبالؔ کی شخصیت ،فکروفن کی ترجمانی کررہا ہے۔یہ پیام یوم اقبال کے موقع پر لکھا گیا تھا۔جس پر ۲۰ رمئی ۱۹۴۰ء کی تاریخ درج ہے۔یہ پیام نقل کیا جارہا ہے۔

''جس کی شاعری اول سے آخر تک ایک پیام ہی تھی،اس کی یادگار کے موقع پر پیام کوئی دو چار لفظوں کا کیا بھیجے! اقبال پر اس سے بڑھ کر کوئی ظلم نہیں کہ اسے شاعر یا فلسفی یا کچھ اور قرار دیا جائے۔وہ تمام تر''پیامبر''تھا۔حقیقی اور اصلاحی پیغمبر کا جانشیں اور خادم۔ساری زندگی گذار دی شرح وترجمانی میں اسی لاہوتی پیام کے،ناسوتیوں کی زبان میں نئے نئے رنگ سے نئے نئے ڈھنگ سے،حکیمانہ عنوان سے،ادیبانہ شان سے۔''[2]

'اقبالیات ماجد' میں شامل مضمون' شکوہ اور جواب شکوہ' میں مولانا ماجد نے فکر اقبال کی تشریح وتعبیر اور شکوہ جواب شکوہ کی اصل روح اور مقصد کو عام فہم اور مختصر انداز میں پیش کیا ہے۔شکوہ جواب شکوہ جیسے پیچیدہ اور

---

[1] دوایک باتیں (پیش لفظ) سید خلیل اللہ حسینی: اقبال ریویو: (خصوصی شمارہ اقبالیات ماجد) اپریل ۲۰۰۰ء: اقبال اکیڈمی حیدرآباد: ص:۲

[2] پیام اقبال (پیام) مولانا عبدالماجد دریابادی: اقبال ریویو (خصوصی شمارہ اقبالیات ماجد) اپریل ۲۰۰۰ء: اقبال اکیڈمی حیدرآباد: ص:۱۰

فلسفیانہ فکر و خیال کے حامل اشعار کی تشریح و وضاحت اس عام فہم انداز میں پیش کرنا مولانا ماجد ہی کا کارنامہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علامہ اقبال کی طرح مولانا کو بھی مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ مغربی علوم اور منطق وفلسفہ، نفسیات، سماجیات جیسے علوم پر قدرت حاصل تھی۔ اسی وجہ سے علامہ اقبالؔ کے افکار و اشعار کی تشریح اس انداز سے کی ہے۔ 'شکوہ اور جواب شکوہ' سے متعلق مولانا ماجد نے اپنے خیالات کو اس طرح پیش کیا ہے۔

''جو زبان خوگر تھی حمد و ثنا، شکر و مناجات کی وہ آخر ایک بار گلہ و شکوہ پر کھلی۔ یا یوں کہ کھلوائی گئی۔ آقا کا کرم جب خود ناز برداری پر آمادہ ہو جائے تو کون بندہ ہے جو نیاز کے فرش زمین کو چھوڑ کر ناز کی فضا میں اڑنے نہ لگے۔ عبدیت کی دنیا میں سنتے ہیں گریہ یعقوبی کے ساتھ ساتھ ایک منزل تبسم سلیمانی کی بھی تو آتی ہے۔ اقبالؔ کے شکوہ میں (شاعر اس وقت تک شاعر اسلام بن چکا تھا) بندہ اپنے خالق سے گویا روٹھ کر کہتا ہے کہ واہ بیگانوں پر، باغیوں پر، سرکشوں پر تو لطف و نوازش کی یہ بارشیں اور ہم اہل توحید کی یہ حالت زار۔ کیا یہی ہماری وفا کیشی کا صلہ ہے۔ یہی ہماری توحید پرستی کا انعام ہے۔

کون سی قوم فقط تیری طلب گار ہوئی
اور تیرے لیے زحمت کش پیکار ہوئی
کس کی شمشیر جہانگیر جہاندار ہوئی
کس کی تکبیر سے دنیا تری بیدار ہوئی

لیکن ''شکوہ'' کا نام شکوہ ہے۔ مضمون وہی حمد و مناجات کا اس لفافہ کے اندر بھی موجود ہے ہر طنز میں عبدیت کی چاشنی، ہر گلہ میں توحید پرستی کی شیرینی.....عوام اپنے جذبات کی ترجمانی ''شکوہ'' میں زیادہ پاتے ہیں اس لیے پست مذاق طبقہ آج تک شکوہ پسند ہی چلا آ رہا ہے۔ حالانکہ ''جوب شکوہ'' کی سطح ''شکوہ'' سے کہیں بلند ہے۔ ''شکوہ'' والا اقبال ایک صاحب حال سالک ہے ''جواب شکوٰ'' والا اقبال ایک صاحب مقام عارف ہے۔ پہلے کے قدم اقلیم

قلب کی وادیوں میں، دوسرے کی نگاہ فضائے روح کی بلندیوں میں۔‘‘[۱]

علامہ اقبال کا تیسرا شعری مجموعہ ’ضرب کلیم‘ ہے۔ اس مجموعہ پر مولانا ماجد نے تبصرہ لکھا ہے۔ جو بہت ہی جامع ہے۔ اس تبصرے کو پڑھ کر علامہ اقبال کے شعری مسلک اور ان کے فکر وفن سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ مولانا نے ’ضرب کلیم‘ کی روح کو اپنے مخصوص انداز نگارش میں پیش کیا ہے۔ مولانا ماجد اقبال سے بہت متاثر تھے۔ علامہ اقبال ملت اسلامیہ کو ترقی کی بلندیوں پر دیکھنا چاہتے تھے، اور مذہب اسلام اور اہل اسلام کی عظمت و سربلندی ہی ان کا مشن تھا، اسی وجہ سے انھیں شاعر مشرق کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ مولانا ماجد بھی مفسر قرآن کی حیثیت سے اسی مقدس مشن و تحریک کے ایک جانباز سپاہی تھے، اس لیے انھوں نے فکر اقبال کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا ہے۔ اور پر تاثیر انداز میں اس کی تشریح و تعبیر کی ہے۔ مولانا کے اس تبصرے سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

> ’’اقبال، مسلمانوں کی قوم کے کلیم، اقبال کا سن جوں جوں پختگی کی طرف بڑھتا جاتا ہے، حکمت و شاعری پختہ تر ہوتی جارہی ہے۔۔۔۔ اقبال کا پیام ساری دنیا کے لیے ہے، دنیائے اسلام کے لیے خصوصاً۔ قرآن کی بھی مخاطب ساری نوع انسانی ہے لیکن حقیقتہً فائدہ اٹھانے والے صرف مومنین ہیں۔ اقبال اپنا دردِ دل سنانا تو سبھی کو چاہتے ہیں، جو پہلے اقبال کے خدا کی، اقبال کے رسول کی سن چکے ہیں۔ **ان فی ذالک لذکری لمن کان له قلب اوالقی السمع وهو شهید** ۔ یہی وجہ ہے کہ بہت کچھ فارسی میں کہہ چکے ہیں بہت کچھ اردو میں کہہ رہے ہیں۔ تازہ ترین افادہ کا نام ’’ضرب کلیم‘‘ ہے۔۔۔۔ ضرب کلیم کا وصف امتیازی، حکیمانہ ژرف نگاہی ہے۔ ہر عنوان وقت نظر کا ایک مرقع ہر صفحہ نکتہ سنجیوں کا ایک گلدستہ۔۔۔۔ گھر کے بھید، گھر کے بھیدی سے بڑھ کر کس کی زبان سے ادا ہو سکتے ہیں۔ بتکدہ آذر پر تیشہ ابراہیمی سے بڑھ کر کس کی ضرب پڑ سکتی ہے۔ طلسم افرنگ کو توڑنے کے لیے افسوں خواں اقبال سے بڑھ کر کون ملے گا۔‘‘[۲]

---

[۱] شکوہ اور جواب شکوہ (مضمون) مولانا عبدالماجد دریابادی: اقبال ریویو (خصوصی شمارہ اقبالیات ماجد) اپریل ۲۰۰۰ء: اقبال اکیڈمی حیدرآباد: ص: ۱۱۔۱۲

[۲] ضرب کلیم (مضمون) مولانا عبدالماجد دریابادی: اقبال ریویو (خصوصی شمارہ اقبالیات ماجد) اپریل ۲۰۰۰ء: اقبال اکیڈمی حیدرآباد: ص: ۲۴۔۲۵

علامہ اقبال کی نظموں میں اکثر وبیشتر یورپ کی تعلیم اور یورپ کی ترقی کی مثالیں مسلم قوم کو بیدار کرانے کے لیے دی جاتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ان کا فلسفہ نوجوانوں کے دلوں میں مذہب کی بنیادیں ہلا ڈالتا ہے۔ اس لیے مومن کو چاہیے کہ اپنے آپ کو پہچانیں کیونکہ زمانہ کے آگے سجدہ پرستش کرنے کا کام کافروں کا ہے۔ مومن کا کام زمانے کا محکوم بننا نہیں ہے بلکہ زمانے کو محکوم بنانا ہے۔ علامہ اقبال کی اسی فکر کو مولانا ماجد صاحب نے جذباتی انداز میں بیان کیا ہے۔

> ''ہنگامہ برپا ہے کہ مسلمان زمانہ کا ساتھ نہیں دیتے اس لیے برباد ہوئے جاتے ہیں، مٹے جاتے ہیں حکیم امت کہتا ہے کہ نادانوں ذرا حواس درست کر کے زبان کھولو، مومن کو تم نے پہچانا کیا ہے۔ زمانہ کے آگے سجدہ پرستش میں گر پڑنا یہ کافروں کا شعار ہے۔ مومن کا کام زمانہ کے ساتھ جینا نہیں اسے اپنے ساتھ چلانا ہے، زمانہ کا محکوم بننے کے لیے نہیں، اسی پر حاکم بننے کے لیے آیا ہے۔ ؎
>
> کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں ہے گم
> مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق''[۱]

مولانا ماجد مفکر اسلام تھے، اور وہ دنیا میں حق کی بالادستی اور مسلم قوم کی بیداری کی راہیں ڈھونڈتے رہتے تھے، کلام اقبال مولانا کے جذبات وخیالات کے ترجمان ہیں، اسی لیے انھوں نے 'ضرب کلیم' سے ایسے ہی اشعار کو چن کر قاری کے سامنے پیش کیا ہے، جس میں مغربی تہذیب وتمدن کی ناپائیداری اور مشرقی تہذیب وتمدن کی پاسداری اور عظمت اسلام کی ترجمانی کی گئی ہے۔

علامہ اقبال کی لازوال اور شاہکار نظم 'جاوید نامہ' ہے۔ جو فکری وفنی اعتبار سے منفرد اور لاثانی ہے، یہ نعتیہ مثنوی ہے۔ علامہ اقبال کی انفرادیت اور ان کا فلسفیانہ نقطہ نظر نعت جیسی مقدس صنف میں بھی برقرار ہے۔ حضور اکرمؐ کی تعریف تو سبھی نے کی ہے، لیکن علامہ اقبال کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے دشمن اسلام ابوجہل کی زبان سے رسالت مآبؐ کی خدمت عالیہ میں حمد ونعت کا منفرد لہجے میں نذرانہ پیش کیا ہے۔ مولانا ماجد کے اسلوب نگارش نے ان اشعار کی تشریح وتعبیر میں اپنا جوہر دکھایا ہے، اور علامہ اقبال کے فارسی کلام کو سلیس وسادہ انداز میں پیش کیا ہے۔ تاکہ فکر اقبال اور عظمت رسالت مآبؐ کا احساس عام قاری کو بھی ہو سکے۔

---

[۱] ضرب کلیم (مضمون) مولانا عبدالماجد دریابادی: اقبال ریویو (خصوصی شمارہ اقبالیات ماجد) اپریل ۲۰۰۰ء: اقبال اکیڈمی حیدرآباد: ص: ۲۴-۲۵-۲۷

'جاوید نامہ' کے متعلق مولانا ماجد لکھتے ہیں۔

''یہ نئے طرز کی نعت، اسی اقبال کی زبان سے ابھی آپ نے سنی۔ نعت ایسی انوکھی نعت کیوں کسی نے کہی ہوگی، لفظاً ہجو اور معناً نعت ہی نعت ایسی نعت کی سند اگر ملتی ہے تو بندوں سے گذر یے، خود اللہ کے کلام میں، نوحؑ اور ابراہیمؑ، لوطؑ اور صالحؑ، شعیبؑ، اور یونسؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور سب سے بڑھ کر خاتم الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ ظالموں اور طاغیوں نے جو گستاخیاں کیں، قرآن پاک نے آخرانھیں نقل ہی کر کے محفوظ کر دیا۔ یہ سب انبیائے کرام کی نعت نہیں تو اور کیا ہے؟ خفاش (چمگادڑ) اگر شور مچا مچا کر کہے کہ یہ دن کیسا تیرہ و تار ہے مجھے ذرا بھی نہیں سجھائی دیتا تو یہ انسانوں کے لیے دلیل اس کی ہوئی کہ دن تاریک نہیں خوب روشن ہے۔ اشقیا اگر جی بھر بھر کر کوسیں تو یہ اس کی ہجو نہیں اس کی مدح ہوئی۔ پیکر ظلمت وضلالت کی زبان سے، چشمہ نور وہدیٰ کے لیے سب دشتم نعت کی وہ لطیف قسم ہے کہ دوسروں کا ذہن بھی یہاں تک پہنچنا مشکل ہی تھا۔''[۱]

'جاوید نامہ' کی تخلیق گر علامہ اقبال نے عشق رسول میں ڈوب کر کی ہے، تو مولانا ماجد نے اس کی ترجمانی وتشریح حب رسول سے سرشار ہو کر کی ہے۔ چونکہ دونوں میں یہی جذبہ مشترک تھا۔ اس لیے متن کے ساتھ ساتھ اس کی تشریح میں بھی روحانیت کا احساس ہوتا ہے۔ مولانا نے جاوید نامہ کی ترجمانی وتشریح اس انداز میں کی ہے، کہ مولانا کی زبان تجزیاتی وتنقیدی کے بجائے تخلیق سے قریب ہوگئی ہے۔

''سینۂ ما از محمدؐ داغ داغ! — از دم او کعبہ را گل شد چراغ!
از ہلاک قیصر و کسریٰ سرود — نوجواناں راز دست ما ربود
ساحر واندر کلامش ساحری است — ایں دو حرف **لا الٰہ** خود کافری است
تا بساط دین آ بادر نورد — یا خدا وندان ما کرد آنچہ کرد!

---

[۱] جاوید نامہ (مضمون) مولانا عبدالماجد دریابادی: اقبال ریویو (خصوصی شمارہ اقبالیات ماجد) اپریل ۲۰۰۰ء: اقبال اکیڈمی حیدرآباد: ص: ۳۵

پاش پاش از ضربتش لات ومنات — انتقام ازوے بگیراے کائنات!

دل بغائب بست واز حاضر گسست — نقش حاضر را فسون او شکست!

دیدہ بر غائب فرو بستن خطاست — آنچہ اندر دیدی ناید کجا ست!

ختم شدن پیش خدائے بے جہات! — بندہ رازو قے نہ بخشد ایں صلوات

اس محمدؐ کی تحریک نے ہمارے دلوں کو چھلنی کر ڈالا ہے۔ ہمارے کعبہ کی رونق اس نے غائب کر دی! قیصر وکسریٰ کے مٹانے کے خواب دکھا دکھا کر، ہائے خود ہمارے نوجوانوں کو ہم سے چھین لیا! کیا زبردست ساحر ہے، اور کلام تو سرتاپا سحر! اب اس سے بڑھ کر کفر صریح اور کیا ہوگا کہ دین کا کلمہ ہی **لا الہ الا اللہ** قرار دے دیا ہے! جس دین کو ہمارے باپ دادا ہمیشہ سے مانتے چلے آئے اسی کو جھٹلا کر رکھ دیا ہے اور ہمارے معبودوں کی توہین کی تو حد کر دی ، ہمارے 'لات' ہمارے 'منات' کسی کو بھی تو نہیں چھوڑا اور یہ اندھیر کی اب بھی اس سے انتقام نہیں لیا جاتا! پھر یہ عقیدہ بھی تو ملاحظہ ہو کہ 'آج' کو چھوڑ 'کل' کو پکڑو۔ 'حاضر' کچھ نہیں 'غیب' سب کچھ 'نقد' کو چھوڑ 'وعدہ' کے پیچھے دوڑنا، محسوسات کو چھوڑ ایک عالم غیب کے چکر میں پڑے رہنا، یہ آخر کہاں کی عقل ہے؟ جن معبودوں کو ہمیشہ ہم نے پوجا ہماری State نے پوجا، انھیں چھوڑ چھاڑ، ایک ان دیکھے خدا کے آگے سر جھکانے کے آخر معنی کیا؟''[1]

علامہ اقبال نے 'جاوید نامہ' میں ملت اسلامیہ کی تاریخی، تہذیبی اور سیاسی احوال وکوائف کو ایک ناقد کی حیثیت سے بڑے کیف اور مستی کے عالم میں پیش کیا ہے۔ ملت اسلامیہ جن جن نشیب وفراز سے دو چار ہوئی ہے، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے موجودہ حالات سے اس کا رشتہ جوڑا ہے، اور خدا کی ذات سے شاعر مشرق نے بعد خلوص یہ سوال کیا ہے کہ اب ہماری صفوں میں خالد بن ولید، فاروق اعظم جیسی شخصیات کیوں نہیں پیدا ہوتیں، اور عرب کی سرزمین میں قرن اول کی صدائے حق وانصاف آج کیوں نہیں سنائی پڑ

---

[1] جاوید نامہ (مضمون) مولانا عبدالماجد دریابادی: اقبال ریویو (خصوصی شمارہ اقبالیات ماجد) اپریل ۲۰۰۰ء: اقبال اکیڈمی حیدرآباد: ص: ۳۲۔۳۳

رہی ہے۔مولانا ماجد نے علامہ اقبال کے خیالات کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے۔

''گفت اے روح عرب بیدار شو
چوں نیا گاں خالق اعصار شو!
اے فوادا ے فیصل ،اے ابن سعود
تا کجا بر خویش پیچیدن چو دود!
زندہ کن در سینہ آں سوزے کہ رفت
درجہاں باز آورآں روزے کہ رفت
خاک بطحاں ،خالدے دیگر بزائے
نغمہ توحید را دیگر سرائے
اے نخیل دشت تو بالندہ تر
بر نہ خیز دار تو فاروقے دیگر
اے جہان مومنان مشک فام
از تو می آید مرا بوئے دوام
زندگانی تا کجا بے ذوق سیر
تا کجا تقدیر تو دردست غیر
بر مقام خو دنیائی تابہ کے
استخوانم دریے نالد چونے

اے عرب کی روح! تو کیوں بیدار نہیں ہوتی اور کیوں نہیں اپنے وہ کارنامے دکھا دیتی، جو تیرے اسلاف چھوڑ گئے ہیں۔اے مصر کے،عراق کے، حجاز کے، بادشاہو! کب تک بس اپنی نفسی نفسی میں پڑے رہو گے! اٹھو اور اپنے دلوں میں وہ سوز پیدا کرو جو آخر کبھی تو رہ چکا ہے! اٹھو اور ہمت کرو، کہ عظمت کے گذرے ہوئے دن واپس آجائیں! اے خاکہ مکہ، کاش تو ہی کسی دوسرے خالد جانباز کو از سر نو پیدا کر اور دنیا کو ایک بار پھر توحید کا ترانہ سکھا دے! اے سر زمین پاک (اللہ تیرے ریگستان کے کھجوروں میں برکت دے) کیا اب تجھ میں کوئی دوسرا فاروق اعظم نہ پیدا ہوگا؟ اے حبشہ کے پیارے باشندو، مشک کی صورت اور رنگ رکھنے والو، تم مجھے کس قدر محبوب ہو لیکن ہمت اور عزم اور ولولہ کے بغیر زندگی کا لطف کیا؟ وہ زندگی ہی کیا جو غیر کی محکومی میں ہو! اللہ وہ دن کب لائے گا جب تمہیں تمہارے اصلی مقام پر فائز دیکھوں میری ہڈی ہڈی

سے دعا نکل رہی تو یہی ۔'' [۱]

یہ پوری نظم علامہ اقبال نے اپنے پیرومرشد مولانا روم کی روحانی پیروی وتقلید میں لکھی ہے۔ تخلیقات کی دنیا میں وہ اپنے مرشد کے ساتھ عشق رسول کے پروں سے پرواز کرتے ہیں، اور اپنے افکار وخیالات کو اشعار میں ڈھالتے ہیں۔ اس خاص اسلامی وروحانی کیفیت سے دوچار ہوکر علامہ اقبال نے اس نظم کی تخلیق کی ہے۔ مولانا ماجد نے شاعر کے کلام کے الہامی ہونے کا اعتراف جذبات سے ڈوبے الفاظ میں کیا ہے۔ مولانا کا یہ اقتباس ان کے شعری مسلک اور تنقیدی نظریہ کا ترجمان بھی معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ''شاعر کی آواز الہام کی آواز ہوتی ہے ہاں ہر شاعر کی نہیں، اس شاعر کی نہیں جو بے بصری کے ساتھ تخیل کی ہر وادی میں ٹھوکریں کھاتا، اور اپنا سر ٹکراتا پھرتا ہے۔ بلکہ اس شاعری کی جو ایمان کی روشنی میں بصیرت کی شعاعوں میں **وانتصرو لهو من بعد ماظلموا** کے سایہ رحمت میں، حقیقت کی منزلیں طے کرتا رہتا ہے۔ اقبالؔ، قوم میں اسی قسم کا شاعر ہے، اقبالؔ کے نام سے خیال مسلم کانفرنس اور گول میز کانفرنس اور سیاسیات کی طرف نہ جائے۔ یہاں ذکر سیاسی اقبال کا نہیں اقبال شاعر کا ہے۔ اس اقبال کا جس نے ''قومی ترانہ'' گایا امت کا 'شکوہ' اپنے رب کو سنایا 'اسرار خودی' کی تشریح کی 'رموز بیخودی' کو بے نقاب کیا اور مغرب زدوں تک 'پیام مشرق' پہنچایا اور اب اپنی روئیداد دل 'جاوید نامہ' کے نام سے پیش کرنے اٹھا۔'' [۲]

مولانا ماجد نے علامہ اقبال کے آخری شعری مجموعہ 'ارمغان حجاز' پر تبصراتی وتجزیاتی مضمون اپنے مخصوص انداز میں لکھا ہے۔ مولانا نے اس مجموعے پر اپنے خیالات کے اظہار کے ساتھ ساتھ اقبال کی مشہور نظم 'ابلیس کی مجلس شوریٰ' کا ایک اہم تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے، تنقیدی نقطہ نظر سے مولانا کا یہ تجزیہ بہت اہم ہے۔ اس تجزیہ سے ابلیس کی تقریر والا حصہ نقل کیا جارہا ہے، تاکہ اندازہ کیا جاسکے کہ مولانا نے کتنے عام فہم الفاظ میں اس نظم کی روح اس کی تلخیص اور پیغام کو عام قاری تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

> ''آخری تقریر خود ابلیس کی ہوتی ہے وہ کہتا ہے تم میرے اثر واقتدار کو

---

[۱] جاوید نامہ (مضمون) مولانا عبدالماجد دریابادی: اقبال ریویو (خصوصی شمارہ اقبالیات ماجد) اپریل ۲۰۰۰ء: اقبال اکیڈمی حیدرآباد: ص: ۳۹

[۲] جاوید نامہ (مضمون) مولانا عبدالماجد دریابادی: اقبال ریویو (خصوصی شمارہ اقبالیات ماجد) اپریل ۲۰۰۰ء: اقبال اکیڈمی حیدرآباد: ص: ۳۴-۳۵

سمجھتے کیا ہو ان بیہودہ اشتراکیوں سے بھلا میں کیا ڈروں گا ان کی مجال جو میرے نظام تہذیب کو ذرا بھی دھکا پہنچا سکیں۔

کارگاہ شیشہ جو ناداں سمجھتا ہے اسے
توڑ کر دیکھے تو اس تہذیب کے جام وسبو
دست فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
مزد کی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو

ہاں البتہ میری قیادت وسیادت کو اگر ڈر ہے تو ایک دوسری امت سے جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو خود مٹ جانے پر بھی اگر مجھے مٹا دینے کی قوت کسی قوم میں ہے جس کی مناجاتیں پچھلی رات میں اب تک ناغہ نہیں ہوتیں! میری اصلی دشمن ہے تو یہی محمدؐ کی امت۔

خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشک سحر گاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے جس پہ روشن باطن ایام ہے
مزدکیت فتنہ فردا نہیں اسلام ہے

پس پناہ مانگتا ہوں تو اسی پیغمبر عرب کے تیر سے جس کا ہر نشانہ میرے لیے موت ہے حقیقتہ انقلاب آفریں اسی کا لایا ہوا دین اور اسی کا پھیلا ہوا آئین ہے۔

الحذر آئین پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظ ناموس زن، مرد آزما، مرد آفریں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک وصاف
منعموں کو مال ودولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بچنے کا ذریعہ صرف یہی ہے کہ خود مسلمان کو خوابِ غفلت میں

مست رکھو اُو کبھی راز دانِ دین نہ بننے دو۔'' [۱]

علامہ اقبال اور کلامِ اقبال سے مولانا ماجد کے لگاؤ اور دلی تعلق کا اندازہ ان کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے۔

> ''مبارک ہے وہ قوم جس کو ایسا شاعر نصیب ہے وہ شاعر جو اپنی یادگار ایسا کلام چھوڑ جائے اور مبارک ہے وہ ناشر جسے ایسے کلام کے نشر و اشاعت کی توفیق ہوئی۔'' [۲]

علامہ اقبال نے مغربی مفکرین کے فلسفیانہ خیالات سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ان میں جرمنی مفکرین و فلسفی نٹشے کے مشہور زمانہ نظریہ یا فلسفہ، فوق البشر (Superman) سے اثر قبول کر کے مرد کامل کا تصور پیش کیا ہے۔ مولانا ماجد دریابادی چونکہ مغربی منطق و فلسفے پر قدرت رکھتے تھے۔ علامہ اقبال کی طرح ان کی نظر بھی مغرب کے تمام فلسفیانہ مباحث پر تھی۔ اسی لیے انھوں نے اپنے مضمون 'نٹشے، رومی اور اقبال' میں نٹشے کے وضع کردہ فلسفہ فوق البشر کے ساتھ علامہ اقبال کے مردِ کامل کی تشریح و تعبیر عام فہم الفاظ میں پیش کی ہے۔ معاصر نقادوں میں شاید مولانا ماجد پہلے نقاد تھے جنھوں نے اقبال کے فلسفیانہ نظریات کو مشرقی و مغربی سیاق و سباق میں خوب سمجھ کر اردو زبان و ادب میں پیش کیا ہے۔ مولانا ماجد نے اپنے اس مضمون میں یہ بھی بتایا ہے کہ علامہ اقبال نے نٹشے سے کس حد تک اثر قبول کیا ہے، اور اس کے نظریے کو کس طرح آفاقی وسعت دے کر ایک نیا اسلامی تصور مردِ کامل یا مومن کا پیش کیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ اقبال نے شاہین یا اس سے ملتے جلتے دیگر علامتی و استعاراتی الفاظ کا استعمال بھی اسی جرمنی مفکر سے سیکھا ہے۔ مولانا ماجد کا تنقیدی کمال یہ بھی ہے کہ انھوں نے اقبال کے دل و دماغ میں نٹشے کا جو مقام تھا اس کو بھی عام فہم الفاظ میں واضح کر دیا ہے۔ اس مضمون کے چند اقتباسات نقل کیے جا رہے ہیں۔

> ''اقبال کا سال پیدائش ۱۸۷۸ء ہے۔ ان کی جب اعلیٰ تعلیم کا وقت آیا تو نٹشے کی شہرت کا آفتاب چمکا ہوا تھا۔ لاہور، جرمنی سب کہیں کی تعلیم میں نیٹشے کی شخصیت اثر انداز رہی جہاں تک نیٹشے کے پرشکوہ الفاظ اور رعب افگن اصطلاحات کا تعلق ہے اقبال کا دامن نیٹشائی جاہ و جلال سے خاصا متاثر رہا۔

---

[۱] ارمغان حجاز (مضمون) مولانا عبدالماجد دریابادی: اقبال ریویو (خصوصی شمارہ اقبالیات ماجد) اپریل ۲۰۰۰ء: اقبال اکیڈمی حیدرآباد: ص: ۵۴-۵۵

[۲] ایضاً: ص: ۵۵

شاہین، شاہین زادہ، عقاب کی تلمیحیں کلام اقبال میں بار بار ملتی ہیں۔ یہ سب اسی سر پھرے فلسفی ہی کا فیض ہے، اور مخالف طریقوں کو گوسفندی سے تعبیر کرنا یہ بھی اس کی اپج کی تقلید ہے۔ لیکن بس اقبال کی خوشہ چینی اس جرمن حکیم سے اسی حد پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس لیے جن ناقدروں نے بعض ظاہری الفاظ اور سطحی مشابہت سے دھوکا کھا کر اقبالؔ کو نیٹشے کا طفیلی کسی معنی میں بھی قرار دیا ہے۔ انھوں نے اقبال پر بھی ظلم کیا ہے اور خود اپنے ذوق سلیم پر بھی۔ اقبال کی نظر آفاقی تھی۔ ان کے اصول اخلاق میں کائنات کی گہرائی روحانیت کی ہم وسعتی تھی، وہ بھلا مادی حد بندیوں کے اندر کیسے محصور رہ سکتے تھے۔ ان کے ہاں بلا کا توازن تھا۔ نیٹشے کو جیسا انھوں نے پہچانا ہے، کم ہی کسی نے پہچانا ہوگا۔ وہ اس کی گرمی گفتار کے قائل ہیں۔ اسے مانتے ہیں کہ اس نے مغرب کی مصنوعی تہذیب وتمدن پر اپنی شمشیر قلم سے خوب خوب چرکے لگائے ہیں۔۔۔۔ اقبالؔ کی تلقین ہے کہ انسان تو دنیا میں اپنے خالق کا نائب بن کر آیا ہے۔ اس کا کام تکوینی تشریعی ہر حیثیت سے اس کی نیابت کرنا ہے اور علم اور عشق دونوں کی راہ سے اس کی معرفت حاصل کرنا ہے اور اس کے قانون کو نافذ کرنا ہے۔ نیٹشے کے فوق البشر سے دور، اور بہت دور، اقبال کا مطمح نظر ایسا مرد کامل ہے جو جسمانی، دماغی، اخلاقی، روحانی اعلیٰ قوتوں سے مسلّح ہو اور اپاہج، کام چور، بد ہمت نہ ہو۔ صاحب عزم وعزیمت ہو اور اپنے فرائض ادائی میں چاق و بیدار مستعد ومتحرک ہو۔ خود دکھ اٹھائے دوسروں کو سکھ پہنچائے۔ خود بھوکا رہے دوسروں کو کھلائے۔ خواہشوں کا غلام نہ ہو۔ ان پر حاکم ہو۔ اقبالؔ اپنے بعض فلسفیانہ مقالوں میں جدھر بھی چلے گئے ہوں لیکن ان کے ضخیم دفتر شاعری میں ایسے مرد کامل کے لیے مذہب کی زبان میں اصطلاح مرد مومن کی ہے۔''[1]

مولانا ماجد نے اپنے اسی مضمون میں علامہ اقبال کی شخصیت وفن پر مولانا روم کے اثرات کی

---

[1] نیٹشے، رومی اور اقبال (مضمون) مولانا عبدالماجد دریابادی: اقبال ریویو (خصوصی شمارہ اقبالیات ماجد) اپریل ۲۰۰۰ء: اقبال اکیڈمی حیدرآباد: ص: ۶۶۔۶۸

وضاحت بڑے مختصر مگر جامع انداز میں پیش کی ہے وہ لکھتے ہیں۔

''اقبال نے طلب علم میں استفادہ اپنے انگلستان اور جرمنی کے استادوں سے نہیں مشرق اور ہندوستان کے بھی خدا معلوم کن کن زندہ و مرحوم بزرگوں، عالموں، فاضلوں، شاعروں سے کیا (اور کون نہیں کرتا) چنانچہ بہتوں کے نام صراحت کے ساتھ ان کی نظم و نثر دونوں میں مل جاتے ہیں لیکن اصل اور پختہ عقیدت انھیں ان ساری باکمال ہستیوں میں صرف ایک شخصیت سے رہی ہے اس کو وہ مرشد روشن ضمیر مانتے ہیں انھیں کی روحانیت کا سہارا ہے کہ وہ فرش خاک سے اڑ کر عالم بالا تک پہنچتے ہیں اور انھیں کا دامن پکڑ کے آسمان کی سیر کر ڈالتے ہیں۔ ہر سوال کا جواب انھیں سے پاتے ہیں اور ہر گرہ انھیں کے ناخن حکمت و معرفت سے کھلواتے ہیں۔ ان کے مناقب جہاں کہیں لکھے ہیں منقبت نگاری کا حق ادا کر گئے ہیں اور نظر ایسا آتا ہے کہ محبت و عقیدت کے جذبات کے دھارے بے اختیار سینے سے ابلے پڑتے ہیں۔

ایک جگہ یہ انداز ہے۔

پیر رومی مرشد روشن ضمیر
کاروان عشق و مستی را امیر''[۱]

تبصرات ماجدی

مولانا عبدالماجد دریابادی کی تنقید کے حوالے سے اگر گفتگو کی جاتی ہے، تو ان کے ادبی تبصروں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، جو انھوں نے مختلف اصناف کی کتابوں پر لکھے تھے۔ ان تمام ادبی تبصروں کو ان کے بھتیجے اور داماد جناب عبدالعلیم قدوائی صاحب نے بڑی عرق ریزی اور کاوش سے مرتب کیا ہے، اور اس کتاب کو 'تبصرات ماجدی' کے نام سے قومی کونسل دہلی نے ۲۰۰۹ء میں شائع کر دیا ہے۔ تبصرات ماجدی میں ۲۰۶ تبصرے شامل ہیں۔ مولانا ماجد نے یہ تمام تبصرے اپنے ہفتہ وار اخبار صدق اور صدق جدید کے لیے لکھے تھے۔ مولانا کی صحافتی زندگی کا سفر تقریباً ۵۰ سالوں پر محیط ہے۔ اس درمیان انھوں نے بڑی ایمانداری اور دیانت داری سے مختلف

---

[۱] نشٹے، رومی اور اقبال (مضمون) مولانا عبدالماجد دریابادی: اقبال ریویو (خصوصی شمارہ اقبالیات ماجد) اپریل ۲۰۰۰ء: اقبال اکیڈمی حیدرآباد: ص ۶۹

اصناف کی کتابوں پر تبصرے لکھے۔ مولانا کے ان تبصروں میں ان کے تنقیدی شعور اور تنقیدی مسلک وبصیرت کا احساس ہوتا ہے۔ کسی کتاب پر تبصرہ لکھتے وقت مولانا حق وصداقت کے ساتھ تعصب اور ذاتی پسند وناپسند کو بالائے طاق رکھ کر بڑی ایمانداری سے اپنی ادبی رائے کا اظہار کر دیتے تھے۔ مولانا کے یہ تبصرے ان کے تنقیدی نظریہ ادب کی تفہیم کے لیے بہت اہم ہیں۔ تبصرہ لکھتے وقت بھی مولانا کے ذہن ودماغ پر اصلاح پسندی، اسلامی عظمت، مشرقی کلچر واقدار اور اخلاق وکردار کی بلندی ان سبھی کا غلبہ رہتا تھا۔ اسی لیے جو تخلیقات اس معیار پر پوری نہیں اترتی تھیں ان کی وہ نشاندہی کر دیتے تھے۔ مولانا اپنی رائے دینے میں کسی کے مقام ومرتبے کا کوئی پاس ولحاظ نہیں رکھتے تھے۔ چونکہ مولانا ماجد کا ادبی نقطہ نظر یہ تھا کہ ''زندہ ادب وہی ہے جو حق کی طرف بلائے اور صالح لٹریچر یا ادب شریف تیار کرے جس کو ہر قوم وملت کے شریف زادے اور شریف زادیاں پڑھ سکیں اور جس سے تہذیب نفس وتزکیہ باطن حاصل ہو سکے۔'' اس لیے وہ ہمہ وقت اصلاحی وتعمیری ادب کے قدردان اور پرستار نظر آتے ہیں۔ ان کے تبصروں کے متعلق عبدالعلیم قدوائی لکھتے ہیں۔

> ''.....ان تبصروں میں مولانا نے جو باتیں کہیں ہیں اور جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ دلچسپ، حقیقت افروز اور جچے تلے ہیں ایک بالغ النظر نقاد کی طرح وہ محض مدح وتعریف ہی نہیں کرتے بلکہ زیر تبصرہ کتابوں کی لفظی ومعنوی فرو گذاشتوں اور لغزشوں کی نشان دہی بھی کرتے ہیں اور لکھنے والے یا ترتیب دینے والے کو ہمدردی واخلاص سے صائب مشورے بھی دیتے ہیں اور ان کی حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔ مولانا کے ان تبصروں میں سوز وگداز، عبرت آفرینی اور معنویت کے ساتھ ہی شستہ وسلیس لکھنوی روزمرہ اور محاوروں کا لطف ملتا ہے۔ ان کی تحریروں میں آمد، روانی اور بڑے سلیقے سے رعایت لفظی یا ضلع جگت کا استعمال کیا جاتا ہے جس کے وہ بڑے ماہر تھے۔ ادب وانشاء کے لحاظ سے یہ نوشتہ جات بڑے قابل قدر ہیں۔''[1]

مولانا ماجد دریابادی کے چند تبصروں کا مختصر تجزیاتی مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے۔ تاکہ ان کے ادبی وتنقیدی قدر ومنزلت کا اندازہ ہو سکے۔

---

[1] تبصرات ماجدی: مرتب عبدالعلیم قدوائی: ص: xxiii

ترقی پسند نقاد احتشام حسین کی تنقیدی تصنیف 'تنقیدی جائزے' میں بارہ تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ ترقی پسند ادب اور مارکسی نقطہ نظر سے مرعوب ومتاثر ہوکر احتشام حسین نے یہ مضامین لکھے تھے۔ یہ مضامین فرائڈ اور مارکس کے خیالات ونظریات سے متاثر ہوکر قلم بند کیے گئے تھے۔ اس کتاب کے متعلق مولانا ماجد کی تنقیدی رائے ملاحظہ ہو۔

''احتشام صاحب کی تنقیدیں ہر فریقانہ وکسیلانہ تنقید کی طرح توازن واعتدال کی دولت سے محروم ہیں۔ نئی اور اکثر نامانوس ترکیبوں اور فقروں کی افراط سے بعض اوقات وہ اپنا مافی الضمیر بھی شاید وضاحت سے ظاہر نہیں کر سکے ہیں۔ بعض جگہ یہ دھوکہ ہونے لگتا ہے کہ احتشام صاحب نظیر اکبرآبادی، میر حسن دہلوی، چکبست لکھنوی کے شعروادب پر کچھ فرمارہے ہیں یا کسی علمی انجمن کے سامنے مابعد الطبیعات کی کسی شخصیت پر کوئی مقالہ سنارہے ہیں۔ بہرحال یہ کتاب ایک خاص قسم کے طرز ادب کی ترجمانی کی سنجیدہ ومخلصانہ کوشش ہے اور جو لوگ ترقی پسند تحریک کو خود اس تحریک کے کسی رئیس وعلمبردار کی زبانی سمجھنا چاہتے ہیں انھیں یقیناً اس کتاب کے مطالعہ سے مدد مل جائے گی۔ کتاب کا بہترین مضمون فانی بدایونی مرحوم پر ہے۔ کاش مصنف کا عام رنگ بیاں یہی ہوتا!''[1]

مولانا ماجد حالانکہ ترقی پسند تحریک کو ناپسند کرتے تھے۔ پھر بھی ادبی دیانت داری کا ثبوت پیش کرتے ہوئے ترقی پسندوں کے معائب ومحاسن دونوں کی نشاندہی کرتے ہوئے اپنے بالغ نظر نقاد ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے۔

آل احمد سرور کی کتاب 'نئے اور پرانے چراغ' پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا ماجد نے کتاب اور صاحب کتاب کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

''سرور کی مشرقی تربیت انھیں بہت سنبھالے ہوئے ہے۔ پھر بھی ان کی تنقیدوں کا اصل مایہ خمیر مغربی ہی نقادوں کے اصول وفروغ ہیں قدرۃ وہ اپنی نقادی میں مشرقی سے کہیں زیادہ مغربی ہیں۔ اور مسلمانوں سے کہیں زیادہ 'آزاد

---

[1] تبصرات ماجدی: مرتب عبدالعلیم قدوائی: ص: ۷۲-۷۳

خیال'.....سرور صاحب ذہین ہیں۔شریف ہیں، وسیع النظر ہیں، مہذب وشائستہ ہیں، لیکن اسے کیا کیجیے کہ جس مکتب فکر کے علم بردار ہیں اس کی وفاداری سے کسی حال میں بھی چوکنا جانتے ہی نہیں۔ان کی 'ترقی پسندی' ہزار پردوں میں بھی چھپائے نہیں چھپتی اور مذہب بیزاری چوں کہ صحیح یا غلط ترقی پسندی کا ایک جزو لاینفک بن چکی ہے اس لیے وہ کسی مذہبی شخصیت پر جب بھی قلم اٹھاتے ہیں ان کی تراوش فکر مدح سے زیادہ قدح پر اترتی ہے۔حقیقت پسندی تعصب میں تبدیل ہو جاتی ہے اور داد کی شیرینی پر لامحالہ بیداد کی تلخیاں غالب آجاتی ہیں۔ .....کتاب بہ حیثیت مجموعی اس تلخ حقیقت کو واضح کر کے رہتی ہے کہ ترقی پسندوں میں جو سب سے اونچے اور چوٹی کے لوگ ہیں وہ بھی اقبال، اکبر کے نام لیواؤں سے کتنا دماغی بعد، کتنی ذہنی بیگانگی رکھتے ہیں۔''[1]

جوش ملیح آبادی کی خودنوشت 'یادوں کی برات' پر تبصرہ کرتے وقت مولانا نے بڑے سخت انداز و لہجے میں گرفت کی ہے۔حالانکہ یہ خودنوشت اس زمانے میں شایع ہوئی تھی، جبکہ عوام وخواص کے دلوں پر جوش ملیح آبادی کی ادبی عظمت کا رعب طاری ہو چکا تھا۔لیکن مولانا نے کتاب اور صاحب کتاب کی پرواہ کیے بغیر اس کی خامیوں اور اخلاقی کمیوں کی نشان دہی کی ہے، اور بعض مقامات پر جملوں، تراکیب اور زبان و بیان اور محاوروں وغیرہ کے غلط استعمال پر بھی گرفت کی ہے۔ یہ ہمت وجرات مولانا ماجد کے علاوہ شاید ہی کسی میں ہوتی کہ وہ اتنے سخت الفاظ میں اس کتاب پر اپنے خیالات کا اظہار کر سکے۔'یادوں کی برات' کے تبصرے سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

''جوش صاحب ملیح آبادی ثم پاکستانی کا شمار وقت کے مشہور بلکہ نامور شاعروں میں ہے اور زبان پر انھیں عبور ہی نہیں کہنا چاہیے کہ حیرت انگیز ملکہ حاصل ہے۔علاوہ شاعری کے لغت کا کام بھی اچھا خاصہ کر سکتے ہیں بلکہ ایک بڑی حد تک انجام دے چکے ہیں۔اب انھوں نے خدا معلوم کن نادان مشیروں کے کہنے سننے میں آ کر اپنی ایک آپ بیتی ساڑھے پانچ سو صفحات کی 'یادوں کی

---

[1] تبصرات ماجدی: مرتب عبدالعلیم قدوائی: ص: ۱۲۸-۱۲۹-۱۳۱

برات' کے نام سے لکھ کر شائع کر دی ہے۔....'برات' اگر اس کا نام ہے تو تف ہے ایسی برات پر۔موزوں نام ہوتا 'یادوں کی کوّا گھار'۔ابواب کتاب کی ترتیب نہ تاریخی ہے نہ منطقی نہ نفسیاتی بس جو واقعہ جہاں بھی یاد پڑ گیا بس وہیں اسے ٹانک دیا ہے حافظہ جوش صاحب کا کسی زمانے میں جیسا بھی رہا ہو اب اس سن میں تو شاید بادہ خواری کی برکت سے اچھا خاصا جواب دے چکا ہے اور نام شخصیتوں کے ہوں یا جگہوں کے ان کی مٹی اچھی خاصی پلید کی ہے۔....زبان بہ حیثیت مجموعی اچھی اور بہت اچھی ہے اور ان کے سے ادیب کے شایان شان اور بعض ٹکڑے تو بے ساختگی کے لحاظ سے بے مثل و بے مثال۔لیکن ایسا ہر جگہ نہیں ہے اور جو ٹکڑے خوش وقتی کے وقت میں لکھے ہیں وہ اختلال حواس کی نظر ہو گئے ہیں۔جیسے کہ ہر شرابی اور نشہ باز کے ہونے چاہئیں۔ان پر بے تکلف حکومت، تصنع اور تکلف کی قائم ہو گئی ہے اور کہیں کہیں لفظ قلم سے غلط نکل گیا ہے۔مثلاً ص ۲۹۵ پر بجائے نفس امارہ کے 'نفس لوّامہ' اور دھومیں کا قافیہ گھومیں، دھوم تو صحیح ہے لیکن اس کے جوڑ پر گھوم بطور اسم کے پڑھنا اور پھر اس کی جمع بنانا تمام تر من گھڑنت اور ایجاد بندہ اگر چہ گندہ ہے۔ترکیبوں اور محاوروں میں کہیں کہیں تو بے شک جدت، ندرت، تازگی حلاوت ہے لیکن کہیں کہیں غرابت اور بھدا پن ہے مثلاً بارش کے لیے بجائے رم جھم کے 'روم جھوم' یا پانی کا 'جھوم جھام' کے برتا یا پٹیا پانی کے بجائے 'پیٹے کا پانی' یا اندھیرے کی جگہ 'اندھیارہ' یا گوڑیت (دیہاتی چوکیدار) کے بجائے 'گوڑ'۔....مقالہ کا عنوان میں نے ایک گندی کتاب رکھا ہے آپ چاہیں تو اسے 'ایک ننگی کتاب' بھی کہہ سکتے ہیں۔اچھا ہوتا اگر جوش صاحب اس کا نام فحشیات جوش رکھ دیتے کوئی نہ کوئی صاحب جوش صاحب پر ریسرچ ضرور ہی کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کریں گے۔یہ

مجموعہ ہاتھ آ جانے سے ان ریسرچ اسکالر صاحب کا کام خوب نکل جائے گا۔''[۱]

ترقی پسند مصنف عزیز احمد کا ناول 'شبنم' کے متعلق مولانا ماجد نے جو تبصرہ کیا ہے اس کو پڑھ کر مولانا کی فکشن پر قدرت ومہارت کا احساس ہو جاتا ہے۔ انھوں نے اس ناول کے معائب ومحاسن کو متعین کرتے ہوئے فنی وفکری قدر وقیمت کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ اس تبصرے میں مولانا کی بے باکی اوران کی ناقدانہ بصیرت، زبان وبیان پر قدرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اس تبصرے کے چند حصے ملاحظہ ہوں۔

''شبنم کوئی دینی، اخلاقی وتاریخی کتاب نہیں، ناول ہے۔ اور وہ بھی ایک معروف ترقی پسند ناول نگار کے قلم سے۔....ناول کی زبان عام طور پر خوب ہے۔ سلیس وشستہ، نستعلیق وشایستہ، لیکن کہیں کہیں یہ صاف نظر آنے لگتا ہے جیسے اردو مصنف صاحب کی مادری زبان نہیں ہے۔ بلکہ اجنبی زبان کی طرح سیکھی ہوئی اور مشقت سے حاصل کی ہوئی ہے۔ جیسے سوچتے انگریزی میں ہیں، اور پھر اس کا ترجمہ اردو میں کر دیتے ہیں:

''نوازش ہاسٹل میں شریک ہو گیا تھا جہاں خط پہنچتے میں شبنم کو وہی اندیشہ تھا جو پورا ہو کر رہا۔'' (ص ۱۹۷)

یہ 'داخل' ہونے کے بجائے شریک ہونا صاف Join کا ترجمہ ہے اور 'جہاں' اور 'جو' بالکل انگریزی ترکیبوں کی پیروی ہے۔

''ارشد نے اپنے دل میں ایک ہزار ایک افسوس کے ساتھ سوچا۔'' (ص ۲۹۸)

یہ ایک ہزار ایک خالی انگریزیت ہے۔ اردو محاورہ بہ صد افسوس، بہ ہزار افسوس یا بہ صد ہزار افسوس نری انگریزیت ہے۔....کہیں کہیں انداز بیان اتنا شستہ، بے تکلف اور پیارا ہو گیا ہے کہ مرزا رسوا کی امراؤ جان کا دھوکا ہونے لگتا ہے، گو یہ دھوکہ منٹ دو منٹ سے زیادہ قائم نہیں رہتا۔ کتاب عوام کے لیے نہیں اس کی ایک دو بیسیوں بلکہ پچاسوں ادبی شعری علمی تلمیحات کو عام لوگ سمجھیں گے بھی نہیں۔ کتاب سے پورا لطف صرف وہی اٹھا سکتے ہیں جو کالج

---

[۱] تبصرات ماجدی: مرتب عبدالعلیم قدوائی: ص: ۲۳۹۔۲۴۰۔۲۴۶

یا یونیورسٹی کے اونچے ماحول میں ایک مدت گزار چکے ہیں ۔مشرق ومغرب
دونوں کے سرچشموں سے خوب سیراب ہو چکے ہیں ۔اور ساتھ ہی اپنی نوجوانی
کی عمر بھی ختم کر چکے ہیں ۔عشق وعاشقی کے جذبات اور پھران کے پیچ وخم،
نشیب وفراز کچی عمر کے اسکولی لڑکوں اورلڑکیوں کے ساتھ مخصوص نہیں ۔''[۱]

مولانا کے تبصروں کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے رسمی قسم کے تبصرے نہیں لکھے ہیں ۔ بلکہ پوری کتاب کو پڑھ کرایک ایماندار قاری کی طرح اپنی رائے پیش کردی ہے ۔موضوع ومواد کی خوبیوں اور خامیوں پر مولانا ماجد اپنی رائے پیش کرتے تھے ۔کتاب کا تعلق جس صنف سے ہوتا تھا اس صنف کے فنی لوازمات کو مدنظر رکھتے ہوئے مولانا تبصرہ کرتے تھے ۔مولانا کے تبصروں میں تعمیری ،اخلاقی ، اصلاحی ، تاریخی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ زبان وبیان پر بھی خاص طور سے توجہ دی گئی ہے ۔

ظاہر ہے اس کتاب میں صرف ادبی تبصرے پیش کیے گئے ہیں ،اس سے کہیں زائد تبصرے ان کے دینی کتابوں اور رسائل پر ہیں ۔جن کی اہمیت وافادیت سے انکارنہیں کیا جاسکتا ۔اخباروں میں تبصرے لکھنے کے ساتھ مولانا نے اپنے خطوں ، پیغاموں ،اور مقالات میں بھی کتابوں اور رسالوں پر تنقید کی ہے ۔اور ہر جگہ ان کی یہی خصوصیات نمایاں نظر آتی ہے کہ وہ من قال نہیں ما قال پر اظہار خیال کرتے تھے ۔اور دیانت داری سے تحریروں کی خوبی یا کمزوری کی نشاندہی کرتے تھے ۔مولانا کے پاس بڑی تعداد میں کتابیں اور رسائل تبصرے کے لیے آتے تھے مگر وقت کی کمی کی وجہ سے ادھر پوری توجہ نہ کر پاتے تھے ۔خاص کر عمر کے آخری زمانہ میں انھوں نے کلام مجید کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا اس لیے رفتہ رفتہ ان کے قلم سے تبصروں کی تعداد کم ہوتی گئی ۔ان کے بہترین تبصروں میں لہو کے پھول ،شیش محل ، یادوں کی بارات ،امراؤ جان ادا،نواب جمیل الشان ، دید وشنید، گریز ، وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں ۔

انشائے ماجد یا لطائف ادب

انشائے ماجد میں شامل بعض مقالوں میں مولانا ماجد کا تنقیدی شعوراوران کی ناقدانہ بصیرت پورے آب وتاب کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے ۔ انشائے ماجد میں مقالے ،مقدمے ،تبصرے ،نشریے ،مرثیے وغیرہ شامل ہیں ۔حکیم عبدالقوی صاحب نے اس کو مرتب کیا ہے ۔اور ۱۹۹۱ء میں ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ نے

---

[۱] تبصرات ماجدی: مرتب عبدالعلیم قدوائی :ص:۴۳۳۔۴۳۴۔۴۳۵۔۴۳۶

شائع کیا۔اس کے بعض مضامین ،تبصرے وغیرہ مولانا کی دوسری کتابوں میں بھی شامل ہیں۔مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے چند مقالوں،مقدموں،تقریظوں کے تنقیدی عناصر پر تبصرہ کیا جائے۔

مولانا ماجد کسی فن پارے کی تنقید سنی سنائی باتوں کو بنیاد بنا کر نہیں کرتے تھے۔بلکہ اس فن پارے کا باریک بینی اور ناقدانہ نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد ہی اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار کرتے تھے۔اردو کی مشہور زمانہ مثنوی 'زہر عشق' کے متعلق یہ مشہور تھا کہ اس میں مخرب اخلاق اور اسلامی احکامات کے خلاف بعض باتوں کا بیان ہے۔اس لیے شرفاء کا طبقہ اس کتاب کو شجر ممنوعہ قرار دے کر نسل نو کو اس کے مطالعہ سے روکتا تھا۔اس مثنوی کے خلاف عام فضا تھی،اور اسے مخرب اخلاق سمجھا جاتا تھا۔لیکن مولانا نے لوگوں کے خیالات کی پرواہ کیے بغیر اس مثنوی کا مطالعہ کیا اور اس کے اخلاقی پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہوئے اس کے فکری وفنی محاسن کا تعین کیا،اور'اردو کا ایک بدنام شاعر یا گنہ گار شہزادی' کے عنوان سے ایک طویل تنقیدی مقالہ قلم بند کیا۔مولانا کا یہ مضمون نظری وعملی تنقید کا عمدہ نمونہ ہے۔مولانا نے منطقی واستدلالی انداز اپنا کر اس مثنوی کا تعارف ایک نئی حیثیت سے شگفتہ انداز میں کرایا ہے۔اس مقالے کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

> '' نواب مرزا کا شاہکار بہار عشق نہیں ،زہر عشق ہے ان کے نام کو بری یا بھلی جو کچھ بھی شہرت حاصل ہے اسی زہر عشق کے طفیل میں ہے۔یہ مثنوی بہار عشق سے چھوٹی ہے۔کوئی پانچ سو شعر ہونگے ،بحر وہی ،زبان وہی ،طرز بیان وہی ،لیکن درد واثر کے اعتبار سے اس سے بڑھ چڑھ کر، بہار عشق کا خاتمہ وصل کی شادمانی پر ہوا تھا۔زہر عشق کا انجام ہیروئن کی خودکشی اور عاشق کے اقدام خود کشی پر ہوتا ہے۔بہ حیثیت مجموعی یہ نظم بہار عشق کے مقابلہ میں بہت مہذب اور سنجیدہ ہے۔عریانی اگر اس میں ہے تو بس اتنی جتنی ہر عاشقانہ افسانہ میں ہوتی ہے۔ہیروئن اس کی بھی کوئی عصمت مآب نہیں ،لیکن دوسری طرف کوئی 'لکھا بیسوا' بھی نہیں ،ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی شریف گھرانے کی الھڑ لڑکی،نوعمری کی نادانیوں میں مبتلا ہوگئی ہے۔تاہم غیرت وعزت سے بالکل ہاتھ نہیں دھو بیٹھی ہے۔....اس مامتا کی ماری کا کیا حال تھا،جس کی ہری بھری گود ابھی خالی کرائی

گئی تھی، عمر بھر کی کمائی دم کے دم میں واپس لے لی گئی تھی، کلیجہ ابھی ابھی تیروں سے چھد چکا تھا، کس انسانی قلم میں قدرت ہے کہ اس کے داغ دل کا نقشہ صفحہ کاغذ پر کھینچ سکے، آہ! کہ جس کے دل میں بیٹی کی مانگ بھرنے کا ارمان ڈالا گیا تھا، اسی کے ہاتھوں اس لاڈلی کو کفن پہنوایا جارہا ہے، آہ کہ جو آنکھیں بیٹی کے سہاگ دیکھنے کے انتظار میں نور حاصل کر رہی تھیں، انھیں کو اسے مٹی کے ڈھیر کے نیچے دفن ہوتے دکھا کر بے نور کیا جارہا ہے۔ نواب مرزا تجھ پر رحمت، تیری روح پر رحمت کہ تو نے کوکھ اجڑنے والی ماں کے جذبات کی تصویر بھی کاغذ پر اتار کر رکھ دی ہے۔ ماں کے منھ سے یہ بول نکل رہے ہیں۔ یا دل و جگر کے ٹکڑے کٹ کٹ کر آنکھ اور زبان کی راہ سے خارج ہو رہے ہیں۔.... مشرق کے بدنام سخن گو، اردو کے بدنام شاعر رخصت! تو درد بھرا دل رکھتا تھا تیری یاد بھی درد والوں کے دلوں میں زندہ رہے گی، تو نے موت کو یاد رکھا تیرے نام پر بھی موت نہ آنے پائے گی تو نے غفلتوں اور سرمستیوں کی داستان کو خوب پھیلایا شاید کسی کی رحمت بے حساب پر تکیہ کر کے۔ لیکن انھی غافلوں اور سرمستوں کو موت وانجام کی یاد دلا کر بھی خوب رلایا، کسی کی عظمت بے پایاں کا خوف کر کے عجب کیا کہ خدائے آمرز گار، اس عالم کا ستار اور اس عالم کا غفار تیری خطاؤں اور لغزشوں کو اپنے دامن عفو و مغفرت کے سایہ میں لے لے اور تیرے کلام کے درد و عبرت، تیرے بیان کے سوز و گداز کا اجر بھی تجھے عطا کرے، اپنی ہی رحمت بے نہایت کی مناسبت سے، اپنے ہی کرم بے حساب کے حساب سے!''[۱]

اردو شعر و سخن میں انقلاب کے نقیب اور اردو شاعری کے اصلاحی اور افادی پہلوؤں کے قائل و پرستار الطاف حسین حالی کی شاعری اور ان کے فن کے متعلق مولانا ماجد نے اپنے ایک مقالہ بعنوان 'اردو کا واعظ شاعر' میں اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کلام حالی پر اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ حالی کے بعض اشعار کا معیار و مرتبہ کلاسیکی شعرا مومن، غالب سے کمتر نہیں۔ اس

---

[۱] انشائے ماجد یا لطائف ماجدی: مرتب حکیم عبدالقوی دریابادی: ص: ۱۲۴۔۱۳۴۔۱۳۵

مقالے میں مولانا نے کلام حالی کے بعض اشعار بطور نمونہ پیش کیا ہے مولانا ماجد نے حالی کی شہرۂ آفاق تخلیق 'مسدس حالی' کے متعلق بھی اپنے خیالات کا اظہار بڑی بے باکی سے کیا ہے۔اس مقالے سے چند اقتباسات ملاحظہ ہو۔

''حالی کا اصلی میدان غزل کا میدان نہیں ان کی شاعری 'واہ' کی نہیں 'آہ' کہ نہیں، جوش وولولہ کی نہیں، حزن وحسرت کی ہے۔نوعمری میں جو کچھ بھی رہے ہوں، لیکن عمر کی پختگی کے بعد تو گل وبلبل کے افسانے چھوڑ اور زلف وابرو کے جنجال سے نکل، بس قوم، کے ہو رہے تھے اور اب وہ تھے اور قوم کے اقبال کا ماتم۔ ساز کوئی سا بھی ہوتا، نغمہ یہی ایک نکلتا۔کسی بڑے سے بڑے زندہ دل ظریف کا جوان، چہیتا بیٹا، آنکھوں تڑپ تڑپ کر دم توڑ رہا ہو، اس وقت باپ کے دل پر کیا گذر کر رہے گی؟ منہ قہقہوں کے لیے کھلے گا یا آہ وبکا کے لیے؟ زبان پر حسرت ویاس کے کلمے ہونگے یا کوئی نئی پھبتی سوجھے گی؟ بس جو حال ہمارا آپ کا، ساری دنیا کا، بیٹوں کے لیے بھائیوں کے لیے رہتا ہے حالی کا وہی حال ساری امت اسلامیہ کے لیے، ساری ملت کے لیے ساری قوم کے واسطے تھا۔

.....مسدس مدوجزر اسلام فرط شہرت سے محتاج نہ کسی تعریف کا نہ کسی تعارف کا نہ کسی نئی مدح وتوصیف کا، نہ کسی جدید نقد وتبصرہ۔ایک مسلسل داستان درد شروع سے آخر تک ہے، آخر میں بطور ضمیمہ ایک قصیدہ لگا ہوا ہے۔ شاعر مسلمان ہے اور مسلمان کی حیثیت سے، اسلام اور مسلمانوں کا حال زار، دربار رسالت میں عرض کر رہا ہے، اس عرض ومعروض میں اللہ اکبر کس قدر اخلاص ہے اور کس قدر نیاز، کس درجہ تعلق خاطر ہے اور اصلاح حال کے لیے کس درجہ بے قراری۔

اے خاصہ خاصان رسل وقت دعا ہے

امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے

پر دیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

.....یہ مناجات تو وہ ہے کہ اگر مناسب ماحول میں پڑھی جائے تو
عجب نہیں جو درو دیوار بھی جھوم جھوم کر اپنی بولی میں اس پر' آمین' کہہ اٹھیں پھر
انسان کا دل تو آخر انسان ہی کا دل ہے۔''[۱]

اسی طرح مولانا ماجد نے اپنے مقالہ بعنوان' پریم چند' میں اردو افسانے کے معمار پریم چند کی فنی عظمت کا اعتراف بڑی فراخ دلی سے کیا ہے۔مولانا نے پریم چند کی ضخیم ناول' چوگان ہستی' پر اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار مدلل انداز میں کیا ہے،اور ناول کے کرداروں کے حوالے سے فنی محاسن کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔مقالے میں مولانا نے بہت مختصر اور جامع انداز میں پریم چند کی شخصیت اور فن و مرتبے کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔مقالے سے چند اقتباسات ملاحظہ ہو۔

''پریم چند خود تو اپنی اردو کتابوں میں بازار حسن نمبر اول پر رکھتے تھے۔
لیکن اس کم سواد بے استعداد کا خیال ہے کہ سب سے بڑھ چڑھ کر ان کی ضخیم
کتاب دو جلدوں اور ایک ہزار صفحات والی چوگان ہستی ہے کہیں سے بھی کھول
لیجیے یکساں دلچسپ۔شروع کر دینا شرط ہے۔ختم کیے بغیر جی ماننے کا نہیں۔
آورد اور تصنع کہنا چاہیے کہ ان کا قلم جانتا ہی نہ تھا۔جو بھی صفحہ الٹ کر دیکھیے
سادگی،بے ساختگی،آمد کے لحاظ سے خطہ گلزار۔جس حصہ کا بھی انتخاب کیجیے دل
کشی،دلآویزی اور جاذبیت کے اعتبار سے نمونہ بہار.....چوگان ہستی میں اگر
کمال یہ تھا کہ پلاٹ کی بندش،اتنی طوالت وضخامت کے باوجود کہیں سے سست
نہیں ہونے پائی۔اور دلآویزی میں خلل پڑنے کا کوئی لمحہ نہ آنے پایا تو یہ
چھوٹے چھوٹے افسانے بھی جن کے مجموعے کا نام پریم پچیسی ہے اور اس کی بھی
دو جلدیں ہیں اور اپنی نظیر بس آپ ہی ہیں۔چھوٹے چھوٹے دلکش جملوں میں
عجیب موہنی ہے ہر ہر فقرہ گویا موتیوں کی لڑی! فریب نظر کی حد یہ ہے کہ آپ خود

---

[۱] انشائے ماجد یا لطائف ماجدی: مرتب حکیم عبدالقوی دریابادی: ص: ۲۰۵۔۲۰۶۔۲۰۹۔۲۱۹

اپنے متعلق دھوکے میں پڑ جاتے ہیں۔ یہ یاد نہیں رہ جاتا۔ کہ سامنے کتاب کھلی ہوئی ہے اور آپ کسی کی سرگزشت پڑھ رہے ہیں۔ محسوس ایسا ہوتا ہے کہ یہ خود ہمارے ہی اوپر سب گزرتی چلی جا رہی ہے بچے بھی ہمیں، بوڑھے بھی ہمیں، ہمیں ظالم ہمیں مظلوم ابھی ہنس بھی ہم ہی رہے تھے ابھی رونے بھی ہم ہی لگے

تماشائی کی حیثیت غائب، تماشا ہم خود

شرافت ان کی تحریر کی جان ہے اور پاکیزگی ان کے قلم کا ایمان۔ منظر کیسا ہی گندہ ہو ان کی نظر انتخاب ہمیشہ انھیں عنصروں کو چن لیتی ہے جو نفس کو نہیں روح کو تڑپائیں جذبات کی سفلی نہیں علوی حصے کو گرمائیں اور بدی کی نہیں نیکی کی قوت کو حرکت میں لائیں۔..... ہماری معاشرت جس طرح شیطان کی اعزازی ایجنٹ بنی ہوئی ہے اس کی تصویر اس سے بڑھ کر لطیف بھی اور پردرد بھی اور کیا ہوگی؟ لوگ قصے کہانیوں کو محض لطف وتفریح کے لیے پڑھتے ہیں لیکن اس لطف کے ساتھ ہی ساتھ اگر نفع بھی منظور ہو، بدی کی محض راہوں کا علم، شیطنت کی خفیہ چالوں کا احساس، وطنیت کا صحیح جذبہ، اور ایثار، اخلاص، اور خدمت خلق کی تربیت بھی اگر مدنظر ہو تو ایسی شیریں خوشگوار کنین پریم چند ہی کے دوا خانہ میں دستیاب ہوگی۔ اور ہندوستان میں تحریک وطنیت کے آئندہ مورخ کو جس طرح گاندھی، نہرو، محمد علی، ابوالکلام، کی تحریروں کی ایک ایک سطر کی چھان بین ناگزیر ہوگی اسی طرح پریم چند کے بھی افسانوں کو الٹ پلٹ کیے بغیر کام نہ چلے گا۔''[۱]

مولانا ماجد نے متعدد کتابوں پر مقدمے اور تقریظیں بھی لکھی ہیں۔ ان مقدموں اور تقریظوں کی خصوصیت ان کا اختصار و جامعیت ہے۔ چند جملوں میں پوری کتاب کا عرق کشید کر صفحہ قرطاس پر بکھیر دینے کا ہنر مولانا کو آتا تھا۔ مولانا ماجد کا تاثراتی و وجدانی اسلوب نگارش ان مقدموں میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان مقدموں میں ظاہر کی گئی ان کی بعض رائے تنقیدی نقطہ نظر سے بہت اہم ہیں۔ چند مثالیں بطور

---

[۱] انشائے ماجد یا لطائف ماجدی: مرتب حکیم عبدالقوی دریابادی: ص: ۲۲۲۔ ۲۲۷۔ ۲۲۸۔ ۲۳۰

نمونہ ملاحظہ ہوں۔ عبدالرؤف عباسی کی ناول ''نواب جمیل الشان' پر لکھے گئے مولانا ماجد کے دیباچے سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

''جمیل الشان کہنے کو ایک ناول ہے اور کہنے کو کیا معنی، واقع میں ناول ہی ہے حسن و عشق کا قصہ، ایک بیسوا سے عشق، باہم رقابتیں، پولس والوں کی گھاتیں، شاطروں کی چالیں ہجر کی بے تابیاں، مصاحبوں کی کارستانیاں، بگڑے ہوئے نوابی کارخانے، شاہی خاندان کی آن بان، غرض ناول کی دلچسپی کے جتنے سامان ہوتے ہیں سبھی اکٹھے ہیں پھر زبان وحس بیان، سبحان اللہ جہاں لکھنو کی زبان دکھائی ہے وہاں خالص لکھنوی جہاں بدایوں کی بولی بول چلے ہیں وہاں پورے بدایونی۔.... آخر تک پہنچتے پہنچتے بدکاری وہوسنا کی کی بدانجامی، اور نیکی و پارسائی کی فتح، از خود بغیر بتلائے اور سمجھائے آئینہ ہو جاتی ہے اور مصنف کے حق میں دل سے دعائیں نکلنے لگتی ہیں۔ مصاحبوں اور خصوصاً میر صاحب عینک فروش کا چربہ خوب اتارا گیا ہے اور نواب جمیل الشان، خان بہادر میراں بخش بدایونی، اور نواب بنیاد حسین تینوں کی تصویریں اپنی اپنی جگہ پر مکمل ہیں۔ صرف ہیروئن کی تصویر کشی میں کہیں کہیں مبالغہ کا قلم چل گیا ہے آخر کتاب میں جو دو خطوط اس کی طرف سے ہیں وہ ساری کتاب کا نچوڑ ہیں حد درجہ موثر اور بلندی خیالات کے لحاظ سے لاجواب، کتاب بھر میں یہ دو خط ہوتے اور کچھ نہ ہوتا، جب بھی بہت کچھ تھا، اب دعا صرف اتنی ہے حسن قبول تصنیف اور مصنف دونوں کو نصیب ہو کتاب کو خلق میں اور کتاب نویس کا خالق کے ہاں!''[1]

مولانا کی شروع کی تحریریں کافی طویل ہوا کرتی تھیں۔ لیکن رفتہ رفتہ مولانا کی مصروفیت بڑھتی گئی جس کی وجہ سے ان کو پورا وقت اور ذہنی سکون نہیں مل پاتا تھا، کہ وہ کوئی طویل مقالہ یا کوئی مقدمہ لکھ سکیں۔ مولانا کا خاص انداز تھا کہ وہ اپنے مقدموں میں اس بات کا اظہار کر دیتے تھے کہ انھوں نے کتنے

---

[1] انشائے ماجد یا لطائف ماجدی: مرتب حکیم عبدالقوی دریابادی: ص: ۳۵۰۔۳۵۱

صفحات کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ مولانا اپنے مقدموں میں کتاب اور صاحب کتاب کی مقبولیت کے متعلق دعائیہ کلمات بھی لکھا کرتے تھے۔ مولانا کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی اتنی بڑھ گئی تھی کہ ہند و پاک سے کتابوں کی بڑی تعداد مولانا کے پاس تبصرہ اور مقدمہ کی غرض سے آتی تھیں۔ اسی وجہ سے وقت کی قلت مضامین کی طوالت کی اجازت نہیں دیتی تھی، اور وقت کی کمی کی وجہ سے ادھر پوری توجہ نہ کر پاتے تھے۔ خاص کر عمر کے آخری زمانہ میں انھوں نے سارا وقت کلام مجید کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا، اس لیے رفتہ رفتہ ان کے قلم سے تبصروں، مقدموں، مقالوں کی تعداد کم ہوتی گئی۔

نشریات ماجد

مولانا کے ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ دو جلدوں میں 'نشریات ماجد' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ یہ نشری تقریریں مختلف ریڈیو اسٹیشن سے ادبی، سماجی، ثقافتی، مذہبی عنوانات پر محکمہ ریڈیو کے ضابطوں اور فرمائش کے مطابق نشر کی گئی تھیں۔ ان کی زبان عام فہم سادہ اور سلیس ہے۔ محاکاتی، ڈرامائی اور خطیبانہ لب ولہجہ ان نشریوں میں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ اختصار اور جامعیت نے ان تقریروں کو بہت دلچسپ بنا دیا ہے۔ مولانا کی یہ نشری تقریریں 'نشریات ماجد' کے نام سے عبدالعلیم قدوائی صاحب نے مرتب کی ہیں اور صدق فاونڈیشن لکھنو نے ان کو شائع کیا ہے۔ مولانا کی نشری تقریروں کے متعلق عبدالعلیم قدوائی نے 'عرض مرتب' کے عنوان سے ان نشریوں کی اہمیت وافادیت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

> ''انھوں نے زیادہ تر لکھنو ریڈیو اسٹیشن اور کچھ دہلی ریڈیو اسٹیشن سے مختلف مذہبی، ادبی، تہذیبی، علمی، اور تاثراتی موضوعات پر نشر کیے۔ اس سلسلہ میں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ مرحوم ملک کے ان گنتی کے چند علماء میں سے تھے جنھوں نے عام روش کے خلاف ریڈیو پر آ کر اس ذریعہ ابلاغ کو اپنایا اور اس کے ذریعہ مذہب اسلام، مشرقی تہذیب اور اردو کی بے مثال خدمت انجام دی۔ یہ نشری تقریریں ۱۹۳۸ء سے ۱۹۷۶ء کے درمیان کی گئیں

اور حسن انشاء، معنویت، بلاغت اور اس سے بھی بڑھ کر روانی اور سلاست کا بہترین نمونہ ہیں۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ مرحوم نے ریڈیو تقریر Talk نشر کرنے کا ایک خاص انداز نکالا تھا۔ جس سے سننے والوں کے سامنے موضوع اور اس کی تفصیل کا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ مرحوم نے یہ فن خاص طور پر سیکھا تھا اور اس کے متعلق ان کا مختصر مضمون بھی اس مجموعہ میں شامل ہے۔ مضامین کے تنوع اور دلآویزی کی بنا پر یہ تقریریں ادب عالیہ میں جگہ پانے کی مستحق ہیں۔ عنوانات زیادہ تر محکمہ ریڈیو کے تجویز کردہ تھے۔ مگر یہ مرحوم کی فراست اور جودت طبع کا کرشمہ ہے کہ ضوابط وقیود کے باوجود ہر جگہ اپنا مافی الضمیر صاف صاف ادا کرتے گئے اور نکتہ چینی کا موقع کسی کو نہ مل سکا۔''[۱]

مولانا ماجد کے بعض نشریوں میں تنقیدی عناصر پائے جاتے ہیں، جن کا تذکرہ اختصار سے کیا جا رہا ہے۔

تنقیدی وفکری لحاظ سے مولانا ماجد کا ریڈیائی مضمون 'غالب کا فلسفہ' منفرد لہجہ وآہنگ کا حامل ہے۔ مولانا کا یہ مضمون دریا کو کوزے میں بند کرنے کی عملی مثال ہے۔ اور غالبیات میں ایک اور اضافہ بھی۔ چونکہ مولانا کو فلسفہ سے گہری دلچسپی تھی اور انھوں نے مشرق ومغرب کے فلسفیوں کے تمام مکاتیب فکر کا مطالعہ بڑی باریک بینی سے کیا تھا اور کئی مغربی مفکرین وفلسفیوں کی کتابوں کے ترجمے بھی انھوں نے کیے ہیں، اسی وجہ سے کلام غالب کے فلسفیانہ کلام کی تشریح وتعبیر مولانا نے اپنے مخصوص انداز نگارش میں کر کے اس کو آسان اور عام فہم بنا دیا ہے۔ مذکورہ مضمون سے چند حصے نقل کیے جا رہے ہیں۔

''فلسفہ نام ہے خود شناسی کا، زینہ ہے خدا شناسی کا، ہم کون ہیں؟ کیا ہیں؟ ہمارے گردو پیش کیا ہے؟ ہمارے جذبات کیا ہیں؟ عادات واطوار کیا ہیں؟ خدا کیا ہے؟ ماسوا کیا ہے؟ بس یہی روزمرہ کے مسئلے جن سے ہم کو آپ کو سب کو دو چار ہونا پڑتا ہے، کبھی جان کر، اور کبھی انجان، انھیں کو عقلی اصول پر ایک خاص نظام کے ماتحت ترتیب دے دیجیے اور لیجیے آپ فلسفی ہو

---

[۱] نشریات ماجد (جلد اول): مرتب عبدالعلیم قدوائی: ص: ۵

گئے ۔ پھر غالب غریب کینٹ اور ہیگل کے کینڈے کے تو انسان تھے بھی نہیں، ایک خوش باش، زندہ دل، خوش فکر، طبیعت دار آدمی باتیں کرتے تو ذرا گہری۔ نظر سطح کی نہیں، عمق کے عادی، چھلکے پر پڑ کر پھسل جانے والی نہیں، مغز تک پہنچ جانے کی خوگر۔ سوجھ بوجھ غضب کی۔ اپنے ان حکیمانہ تجربوں اور عارفانہ مشاہدوں کو ادا کرتے تو کبھی پیاری نثر میں، کبھی دلآویز نظم میں۔ کبھی شعر کا ساز ہاتھ میں اٹھا لیتے، کبھی نثر کے مائکروفون کو منھ لگا لیتے۔ شہرت شاعری کی زیادہ ہوگئی ورنہ تحقیق کے راوی کا تو یہ بیان ہے کہ نظم ونثر دونوں کے ماہر تھے۔

.....موتی کی قدر و قیمت سب جانتے ہیں، یہ فطرت بشری کا عارف کہتا ہے کہ موتی بنتا ہے پانی کے قطرہ سے لیکن ایسا ہی پانی کا قطرہ ایک اور بھی تو ہے، موتی سے کہیں زیادہ قیمتی۔ اسے حضرت انسان آنکھوں ہی آنکھوں میں رکھتے ہیں، اور باہر اسی وقت نکالتے ہیں، جب چوٹ پڑ لیتی ہے، دل پر نہ سہی، کم از کم جسم ہی پر سہی۔ سلسلہ موجودات میں جس کا جیسا ظرف، ویسا ہی اس کا مرتبہ۔

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

زندگی کی تلخیوں کے تجربے نے معتقد اس کا بھی بنا دیا تھا کہ زندگی بھر اس بند سے رہائی پانے کی کوئی صورت نہیں۔ جب تک انسان اس آب وگل کی دنیا میں ہے، کچھ بھی کرے، ناسوتی جھگڑے بہر حال اس کا ساتھ چھوڑنے کے نہیں، مرزا کی یہ آپ بیتی ان کی ذاتی نہیں، نوع بشر کی آپ بیتی ہے۔ لیکن شعر کے موزوں سانچہ میں، لطیف قالب میں ادا تو انھیں کی زبان سے ہو رہی ہے۔

قیدحیات و بندغم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟
یہی مفہوم، ردیف قافیہ اور وزن کی تبدیلی کے ساتھ ؂
غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک'' [۱]

اردو کے پہلے عوامی شاعر نظیر اکبرآبادی کی مشہور نظم 'آدمی نامہ' کا تجزیہ اپنے ریڈیائی نشریہ میں مولانا نے پیش کیا ہے، اس مختصر مگر جامع نشریہ میں 'آدمی نامہ' کی فکری وفنی اور ادبی وثقافتی قدر و قیمت کا تعین بڑی خوبی سے کیا ہے۔'آدمی نامہ' کا یہ اقتباس ان کی تنقیدی شعور اور تفہیمی صلاحیت کا گواہ ہے۔

> ''آدمی، سچ کہا جس نے کہا، خلاصہ کائنات ہے۔ بڑھنے پر، اٹھنے پر، سنورنے پر آئے، تو فرشتوں سے بازی لے جائے، اور گھٹنے پر، گرنے پر، بگڑنے پر اترے تو شیطان بھی اس سے نیچا دیکھ جائے۔ مذہب کی اسی بتائی ہوئی اور اخلاق کی اسی سجھائی ہوئی بات کو نظیر اکبرآبادی نے 'آدمی نامہ' میں ادا کیا ہے، شعر کی زبان سے، شاعرانہ آن بان سے، شاعری کے ساز و سامان سے.....زبان عام فہم، خیال پاکیزہ، نظیر کی اور بہت سی نظموں کی طرح آدمی نامہ کی بھی یہی خصوصیت ہے.....بہرحال آدمی نامہ لکھ کر اس مرد آدمی نے حق ادا کر دیا، اپنے آدم زاد ہونے کا اور مصوری کر دی آدم کے پھیلے ہوئے سارے نسل وخاندان کی!'' [۲]

مولانا ماجد کی تنقیدی تحریروں پر خطابت، پند و نصائح اور اخلاقی پہلوؤں کا بڑا غلبہ ہے۔ حق وصداقت اور مظلوم کی حمایت کی وجہ سے ان کی تنقید میں ایک قسم کی جانب داری پیدا ہو جاتی ہے، اور ہونی بھی چاہیے، کیونکہ وہ نقاد سے زیادہ مفسر قرآن اور مذہب اسلام کے مبلغ ہیں۔

عبدالماجد دریابادی بحیثیت محقق ومرتب

تحقیق عربی مادہ ح ق ق سے مشتق ہے۔ جس کے لغوی معنی حق بات ڈھونڈھنا، دریافت

---

[۱] نشریات ماجد: مرتب عبدالعلیم قدوائی: ص: ۷۹۔۸۰۔۸۲

[۲] ایضاً: ص: ۹۳

کرنا،کھوج لگانا کے ہیں۔ادب کی اصطلاح میں تحقیق کا مطلب یہ ہے کہ منظم لائحہ عمل کے تحت نامعلوم حقائق کی کھوج اور معلوم وموجود حقائق کی نئی تشریح وتعبیر اس طرح کی جائے کہ علم میں توسیع ہو جائے اردو ادب میں تحقیق کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قدیم ،نایاب ،نادر کتابوں کو دریافت کر کے ان کے متن کی تصحیح وترتیب کرنے کے بعد شائع کردینا مختلف محققین نے تحقیق کی تعریف اپنے اپنے انداز میں کرنے کی کوشش کی ہے۔ گیان چند جین نے تحقیق کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

> ''اس طرح اردو اصطلاح میں تحقیق کے معنی سچ یا حقیقت کی دریافت ہے۔ انگریزی اصطلاح ریسرچ کے معنی ہیں کھوج اور دوبارہ کھوج ہندی اصطلاح انوسندھان کے معنی کسی مقررہ نشانے کو حاصل کرنے کے لیے اس کا تعاقب کرنا۔اردو اصطلاح میں 'سچ' کے ارفع معنی پوشیدہ ہیں ،انگریزی میں محض کھوج ہے۔تلاش کسی عام یا غیر اہم چیز کی بھی ہوسکتی ہے۔مثلاً زمین پر کوئی چھوٹا سکہ گر جائے تو اسے ڈھونڈھنا یا کسی کا مکان تلاش کرنا۔ ہندی اصطلاح انوسندھان سب سے زیادہ ڈھیلی ہے کسی مقصود کا تعاقب کرنا۔''[۱]

مولانا ماجد دریابادی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ترتیب اور فن تحقیق سے بھی ان کو بڑا شغف تھا۔اس لیے اپنی تمام تر علمی ،ادبی ،صحافتی مصروفیات کے باوجود انھوں نے چند کتابوں کی تحقیق وترتیب کا کام بھی انجام دیا ہے۔مولانا کے تحقیقی کارناموں میں مثنوی بحر المحبت اور فیہ مافیہ کا شمار ہوتا ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے خطوط مشاہیر ،مکتوبات سلیمانی ،تحفہ خسروی کی تدوین وترتیب کا کام انجام دیا ہے۔

مثنوی بحر المحبت

مصحفی نے میر تقی میر کی مثنوی 'دریائے عشق' کے طرز پر ایک مثنوی 'بحر المحبت ' کے نام سے لکھی تھی۔ لیکن اس کا نسخہ کمیاب ہو چکا تھا۔مولانا کو اس کا ایک نسخہ اپنے خالہ زاد بھائی حکیم عبد الحسیب دریابادی کی ذاتی لائبریری سے دستیاب ہو گیا تھا۔اس کو دیکھ کر مولانا کو اس کی فنی وادبی اہمیت کا اندازہ ہوا ،اور انھوں نے اس کی تصحیح وترتیب جدید اصول وضوابط کی بنیاد پر کیا ،اور اس کا دیباچہ اور مقدمہ بھی لکھا۔مقدمہ میں مولانا نے مصحفی کی سوانح اور ان کے کلام پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔کتابی شکل میں اس مثنوی کو مکتبہ جامعہ دہلی نے

---

[۱] تحقیق کا فن: ڈاکٹر گیان چند جین :ص:۱۱

۱۹۲۲ء میں پہلی بار شائع کیا، اوراس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔ یہی نسخہ میرے پیش نظر ہے۔ اس مثنوی کی ترتیب وتحقیق کے متعلق مولانا 'آپ بیتی' میں لکھتے ہیں۔

''اپنے خالہ زاد بھائی شفاء الملک حکیم عبدالحسیب صاحب کے کتب خانہ میں ایک قلمی نسخہ مصحفی کی ایک چھوٹی سی مثنوی 'بحرالمحبت' کا نظر سے گذرا، نکال لایا اور ذرا وقت صرف کر کے اس کی تصحیح کی اور حاشیے کثرت سے دیے۔ پہلے اسے انجمن ترقی اردو کے رسالہ اردو میں چھاپا، پھر مقدمہ کے ساتھ اور نظر ثانی کے بعد کتابی صورت میں، اور چند سال بعد اس کا دوسرا ایڈیشن نکالا۔''[۱]

مولانا ماجد نے جدید اصول وتحقیق کے مطابق 'بحرالمحبت' کے دیباچہ میں کاتب کا نام، کتابت کا معیار اور املا کا انداز، کاغذ کا رنگ، صفحات کی ضخامت، الفاظ ومعنی کی تبدیلی کے متعلق قارئین کو آگاہ کیا ہے۔ مولانا کو تحقیقی مراحل میں جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہے، اس کا تذکرہ اپنے دیباچے میں اس طرح کیا ہے۔

''جو قلمی نسخہ پیش نظر ہے۔ چھوٹی تقطیع کے قدیم دبیز کاغذ پر تحریر ہے کاغذ کو اکثر مقامات پر کیڑے کھا گئے ہیں، چنانچہ کہیں کہیں اس قدر کرم خوردہ ہو گیا ہے کہ الفاظ بلکہ مسلم فقرے غائب ہو گئے ہیں۔ کاتب کوئی صاحب صاحب طاہرالزماں نامی ہیں۔ آغاز کتاب میں یہ عبارت درج ہے، ''مثنوی میاں مصحفی سلمہ کے برطبق مضمون مثنوی دریائے عشق کہ از میر تقی مرحوم است گفتہ اند۔'' خاتمہ پر عبارت ذیل درج ہے،

''نوشتہ بہ ماند سیاہ بر سفید
نویسندہ را نیست فردا امید

تمت تمام شد مثنوی بحرالمحبت میاں مصحفی ساکن لکھنو،

بہ خط محمد طاہرالزماں عفی اللہ عنہ بتاریخ ہشتم ماہ ج الثانی ۱۲۴۱ھ

باتمام رسید در دو یوم۔''

---

[۱] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۲۸۴

کاتب صاحب بہت ہی کم استعداد معلوم ہوتے ہیں، املا و کتابت کی بہت موٹی اور فاحش غلطیاں کی ہیں۔ مثنوی کو ہر جگہ 'مسنوی' لکھا ہے۔ مرقع کو ہر جگہ 'مرقہ' لکھتے ہیں۔ تہیہ کو 'تحیہ' حواس کو 'ہواس' کہار کو 'قہار' زرا کو 'زرہ' کو وہ غم کو 'کو ہے غم' وقس علی ہذا۔

اس کے علاوہ بعض الفاظ کے لیے کاتب صاحب اپنا ایک مخصوص طرز املا رکھتے ہیں۔ جس کی مثالیں اس زمانہ کی طرز کتابت میں عام طور پر بھی ملتی ہیں مثلاً ان کے 'ک' و 'گ' میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ 'گ' کو وہ ایک ہی مرکز دیتے ہیں۔ 'تو' کو 'توں' لکھتے ہیں۔ 'نے' 'نین' 'آ' کو 'ا' وقس علی ہذا۔ سو برس کے عرصہ میں زبان میں جو تغیر ہو گئے ہیں وہ اہل نظر پر مخفی نہیں۔ اس لیے کتاب پر حواشی دینے ضروری تھے۔ لیکن مقابلہ کے لیے کسی دوسرے نسخہ کا موجود نہ ہونا، کاتب نسخہ کی بدخطی، املا کی بکثرت غلطیاں، اور پھر کتاب کا جا بجا کرم خوردہ ہونا، ایسی حالت میں یہ کام انجام دینا جس قدر دشوار تھا، اس کا اندازہ وہی حضرات کر سکتے ہیں، جنھیں خود کبھی اس قسم کے کام انجام دینے کا اتفاق ہوا ہے۔''[۱]

تنقیدی و تحقیقی نقطہ نظر سے اس کتاب کا وہ حصہ اہم ہے جس میں مثنوی بحرالمحبت اور دریائے عشق کا تقابلی مطالعہ و موازنہ پیش کیا گیا ہے۔ ان دونوں میں جو یکسانیت اور اختلاف ہے اس کی نشاندہی کرتے ہوئے خیال، پلاٹ، طرز بیان، وزن و بحر وغیرہ کے متعلق بھی مولانا نے اظہار خیال کیا ہے۔ اس حصے سے چند اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں۔

''دونوں کا پلاٹ ایک ہے، طرز بیان ایک ہے، وزن ایک ہے، اور چونکہ زمانہ تالیف ایک ہے، اس لیے زبان بھی قدرۃً ایک ہے، یہاں تک کہ کہیں کہیں الفاظ بھی متحد ہو گئے ہیں۔.... دونوں ہیرو عاشق بھی بالکل ایک ہی طریقے سے ہوتے ہیں، یعنی سیر چمن سے واپسی کے بعد نگاہ ایک رہگذر میں کسی بالاخانہ پر جاتی ہے، اور طرفین کے دل فوراً بسمل ہو جاتے ہیں۔.... میرؔ و مصحفیؔ کی

---

[۱] مثنوی بحرالمحبت: مرتب مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۴۔۵

داستان میں کسی قدر فرق ہے، میر صاحب کے ہاں خاندان والوں نے لڑکی کو خاموشی کے ساتھ یک بیک رخصت کر دیا ہے، بہ خلاف اس کے مصحفی کے ہاں جہاں لڑکی کی رخصتی دکھائی گئی ہے، وہاں لڑکی والوں کی دماغی و نفسی کیفیات کی بھی پوری تشریح ملتی ہے اور یہ اضافہ مصحفی کے کمال کی دلیل ہے، ناظرین دونوں مثنویوں کا مقابلہ کر کے پڑھیں تو خود نظر آ جائے گا کہ اس موقع پر مصحفی کا بیان بہت زیادہ نفسیات بشری کے مطابق ہے۔.... تصریحات بالا سے معلوم ہوا ہوگا کہ میرؔ و مصحفی دونوں نے ایک ہی بحر میں شناوری کی ہے۔ میرؔ کی افضلیت واولیت تمام اردو شاعروں کے مقابلہ میں مسلم ہے، لیکن اس مخصوص میدان میں جیسا کہ اوپر کئی بار اشارہ کیا جا چکا ہے، مصحفی کا پلہ جھکتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کا سبب خواہ یہ ہو، کہ ان کے سامنے ایک نمونہ پیشتر سے موجود تھا اور نقش ثانی ہمیشہ نقشہ اول کے مقابلہ میں آسان تر و بہتر ہوتا ہے، خواہ کچھ اور ہو، واقعہ بہر صورت یہ ہے، کہ مصحفی کی مصوری مقتضائے حال سے قریب تر اور جذبات بشری کے زیادہ مطابق ثابت ہوئی، با این ہمہ میر پھر میر ہیں، ان کے قلم سے متعدد اشعار اس قدر دل نشیں اور ڈھلے ہوئے نکلے ہیں، اور جن میں اس مخصوص افسانہ سے قطع نظر کر کے عام واردات قلب اس خوبی سے بیان کیے گئے ہیں کہ بے اختیار زبانوں پر چڑھ گئے ہیں اور فرط مقبولیت سے قریب ہے کہ ضرب المثل کے درجہ تک پہنچ گئے ہیں۔''[1]

منقولہ اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا ماجد نے مصحفی کی مثنوی کو انسانی جذبات ونفسیات اور مصوری ومحاکات کے اعتبار سے میرؔ کی مثنوی سے زیادہ اہم قرار دیا ہے، اور فنی ولسانی نقطہ نظر سے دونوں کا معیار یکساں ہے۔ مصحفی کی مثنوی کو زیادہ کامیاب مولانا نے اس لیے قرار دیا ہے کہ اس کی حیثیت نقش ثانی کی ہے، اور نقش ثانی ہمیشہ نقشہ اول کے بالمقابل اچھا ہوتا ہے۔

بحرالمحبت کے دیباچہ اور 'آپ بیتی' میں مولانا نے ایک ہی نسخہ ملنے کا تذکرہ کیا ہے، لیکن ڈاکٹر

---

[1] مثنوی بحرالمحبت: مرتب مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۲۳-۲۴-۲۷-۲۸-۳۵-۳۶

تحسین فراقی اپنی کتاب 'مولانا عبدالماجد دریابادی احوال و آثار' میں لکھتے ہیں ''اس مخطوطہ کے طبع اول کے نکلنے کے ڈیڑھ دو سال بعد انھیں حسن اتفاق سے دوسرا قلمی نسخہ مل گیا تھا جو جناب شاکر حسین نکہت سہسوانی کی ملکیت تھا اور جوان تک سید محفوظ علی بدایونی کی وساطت سے پہنچا تھا۔'' دوسرے نسخے کے کاتب بھی کم علم تھے اور کتابت میں بہت سی غلطیاں تھیں، اور یہ نسخہ ۱۲۲۵ھ میں لکھا گیا تھا، اور میر تقی میر کے نام کے ساتھ سلمہ لگا ہوا تھا۔ مولانا کے مطابق مصحفی نے یہ مثنوی میر تقی میر کی زندگی ہی میں لکھی تھی۔ مکتبہ جامعہ نے 'بحر المحبت' کے دو ایڈیشن شایع کیے ہیں دوسرے ایڈیشن میں مولانا ماجد کا وہ دیباچہ جس میں انھوں نے دوسرے دستیاب نسخے کا ذکر کیا تھا شامل نہیں کیا ہے۔ تحقیقی وتنقیدی نقطہ نظر سے دیباچے بڑی اہمیت وافادیت کے حامل ہوتے ہیں دوسرا دیباچہ شامل نہ ہونے کی وجہ سے تحقیق میں شکوک وشبہات پیدا ہونے کا امکان ہوگیا ہے۔ مثنوی 'بحر المحبت کو ایڈیٹ کر کے مولانا نے اپنی تحقیقی بصیرت کا ثبوت پیش کیا ہے۔

مثنوی بحر المحبت کے دونوں دستیاب نسخے ناقص تھے، اس لیے مولانا نے بڑی عرق ریزی اور دیانت داری سے حاشیہ میں وہ سب معلومات درج کردی ہیں، جن کی ضرورت متن کے قرأت میں پڑسکتی ہے۔ مشکل الفاظ کی فرہنگ کے ساتھ ساتھ املا اور جملوں کی تراکیب کی بھی بعض جگہ تشریح کی گئی ہے۔ چونکہ مولانا کی پہلی تحقیقی کاوش ہے اس کے باوجود یہ فن تحقیق کے معیار پر پوری اترتی ہے، اور تحقیق کی دنیا میں مولانا کا یہ کارنامہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔

فیہ مافیہ

مولانا ماجد کی دوسری تحقیقی یادگار مولانا روم کی فیہ مافیہ ہے۔ دائرہ اسلام میں شامل ہونے کے بعد مولانا کو تصوف سے بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی، مولانا روم کے وہ خاص معتقد تھے۔ انھوں نے مولانا روم کی کتاب 'فیہ مافیہ' (جس میں ان کے منتخب اقوال، ملفوظات شامل ہیں) کی تدوین وتحقیق کے بعد شائع کیا۔ اس کتاب کے شروع میں مولانا روم کی مفصل سوانح حیات 'تذکرہ مولانا جلال الدین رومی صاحب ملفوظات' کے عنوان سے مولانا ماجد نے لکھا ہے۔ کئی مختلف نسخوں کو سامنے رکھ کر انھوں نے اس کی تدوین و ترتیب کا کام انجام دیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۲۸ء میں عمل میں آئی۔ اس کتاب کی تحقیق وتدوین اور نسخوں کی دستیابی سے متعلق مولانا نے 'آپ بیتی' میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

''رام پور جانا ہوا اور پہلے وہاں کے اعلی سرکاری کتب خانہ میں الٹ پلٹ میں نظر مولانائے رومی کی 'فیہ مافیہ' پر نظر پڑ گئی۔ اور وہاں سے اس کی نقل منگانے کا انتظام کرآیا، پھر کچھ روز بعد حیدرآباد جانا ہوا، اور وہاں بھی نواب سالار جنگ کے نادر کتب خانہ میں اس کا ایک قلمی نسخہ مل گیا، اور یہ بھی اللہ کا مزید کرم کہ ایک تیسرا نسخہ حیدرآباد کے سرکاری کتب خانہ میں نکل آیا۔ یہ تین تین نسخوں کا ہاتھ آجانا بغیر کسی تلاش وتفحص کے، محض اللہ کی دین نہیں تو اور کیا کہا جائے۔ بہرحال ان تینوں کے نقل کا بھی انتظام ہو گیا مگر ظاہر ہے کہ اس میں وقت بہت لگ گیا، اور جن لوگوں نے اس کے لیے سعی وپیروی کی، ان کے لیے دل سے دعائیں نکلیں۔ کیمبرج یونیورسٹی کے استاد عربی پروفیسر نکلسن سے بھی مراسلت تھی، انھیں لکھا ان بچارے نے اپنے اثر ورسوخ سے کام لے کر ایک نسخہ قسطنطنیہ سے نقل کرا بھیجا۔ اس وقت تک قلمی مخطوطات کے فوٹو لے لینے کا طریقہ اگر رائج ہو بھی چکا تھا، تو میری دست رس سے بہرحال باہر تھا۔ سوا اس نقل وکتابت کے فرسودہ طریقہ کے اور کوئی صورت میرے علم میں نہ تھی، مہینوں نہیں، برسوں ان سارے نسخوں کی فراہمی، اور پھر ان کے مقابلہ وتصحیح میں لگ گئے، اور بعض دوستوں کی اعانت بھی اس میں حاصل ہوتی رہی۔ مگر یہ نقلیں جو ہو کر آئیں، خود ہی بہت غلط تھیں۔ ان غلط در غلط نسخوں کا مقابلہ اور پھر تصحیح! کام کی دشواریاں بہت بڑھ گئیں، پھر اپنی ایک تو فارسی میں استعداد ہی واجبی سی، اور اس سے بڑھ کر ترتیب وتہذیب (ایڈٹ کرنے کا کام) میں عدم مہارت، نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب بالکل چوپٹ ہو کر نکلی، اور کتاب میں غلطیاں لاتعداد رہ گئیں۔ سالہا سال بعد ایران کے وزیر تعلیم ڈاکٹر بدیع الزماں فروزاں فر نے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ذریعوں کو کام میں لا کر ایک اعلی نفیس ایڈیشن شائع کیا، تو اپنی نااہلی اور اپنے کام کی انتہائی پستی کا مشاہدہ برائے العین ہو گیا۔''[1]

---

[1] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۲۸۵۔۲۸۶

مولانا ماجد 'فیہ مافیہ' کی تحقیق وتدوین میں فن تحقیق کے جدید اصول وضوابط کا پورے طور پر خیال نہ رکھ سکے ہیں، اور صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو جدید اصول کے وہ قائل بھی نہ تھے۔ 'فیہ مافیہ' کے دیباچے میں مولانا لکھتے ہیں۔

''قدیم کتابوں کے ایڈٹ کرنے (تہذیب) کا جدید دستور یہ ہے کہ اختلاف قرات پر مسلسل نوٹ دیے جاتے ہیں، اور چھوٹی بڑی ہر وہ عبارت یا ہر وہ لفظ جو دو مختلف نسخوں میں مختلف طریقوں سے پڑھا جا سکتا ہے، خواہ وہ اختلاف ایک نقطہ یا شوشہ ہی کا ہو، مگر فٹ نوٹ میں اس کا اختلاف ظاہر کر دیا جانا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ عام ناظرین تو خیر، البتہ 'ناقدین' معاف فرمائیں، کہ میں اپنی نااہلی یا نافہمی سے اس جدید تصنیفی فیشن کی نہ عملاً تقلید کر سکا، نہ اصولاً اس کی ضرورت کا قائل ہوسکا، میں نہ 'اسکالر ہوں' نہ 'ریسرچ اسکالر' نہ 'مستشرقین' وعلمائے مشرقیات کی صف میں، بیٹھنے کی ہوس اب دل میں باقی ہے، تھوڑی بہت محنت جو کچھ بن پڑی ہے، اس سے مقصود مغرب کے 'اہل قلم' کی نہیں بلکہ مشرق کے 'اہل ذوق' کی خدمت کرنی ہے، مثنوی کے مطالب کے سمجھنے میں اگر کسی طالب کو اس رسالہ سے مدد مل گئی، اور کسی اہل دل کی دعا، ان اوراق کے جامع کے حق میں نکل گئی، تو اس کا مقصد حاصل ہے۔ مجھے اپنی کوتاہیوں کا پورا اعتراف ہے اور اگر کوئی دوسرا اس کام کو کرتا، تو یقیناً مجھ سے کہیں بہتر صورت میں انجام دیتا، اصل کتاب میں متعدد فقرے ایسے ہیں، جن کا کوئی مطلب میں نہیں سمجھ سکا ہوں، اکثر ایسے موقع پر نشان استفہام (؟) بنا دیا ہے، ممکن ہے کوئی دوسرے صاحب مطلب نکال لیں، میں نے اسی طرح نقل کر دیا ہے، جس طرح پایا تھا۔''[۱]

'فیہ مافیہ' مولانا جلال الدین رومی کی کوئی باضابطہ تصنیف نہیں ہے، بلکہ یہ ان کے وعظ، پند ونصائح کا مجموعہ ہے۔ جو وہ اپنے مریدوں کو مخاطب کر کے فرمایا کرتے تھے۔ مولانا کے خاص مخاطب حکومت کے وزیر

---

[۱] دیباچہ: فیہ مافیہ: مرتب مولانا عبدالماجد دریابادی: ص:۶-۷

معین الدین صاحب تھے۔ یہ مولانا سے تصوف اور اس کے متعلق سوالات کرتے تھے اور مولانا روم ان کا جواب دیتے تھے۔ ان تمام مباحث وملفوظات کو مولانا روم کے صاحبزادے سلطان بہاؤالدین نے قلم بند کر کے مرتب کر دیا تھا۔ مولانا ماجد نے 'تبصرہ فیہ مافیہ' کے عنوان سے اس رسالے پر اپنے تنقیدی وتحقیقی خیالات کا اظہار کیا ہے، اور یہ بتایا ہے کہ مولانا روم کی مثنوی کا مقام ومرتبہ 'فیہ مافیہ' سے بہت بلند ہے۔ اس کے علاوہ 'فیہ مافیہ' میں اجمال ہے اور مسائل کی پوری تفصیل وتشریح نہیں ہے۔ مولانا ماجد لکھتے ہیں۔

> ''ملفوظات کے خیال ومطالب ،مثنوی کے خیالات ومطالب ہیں ، انداز بیان ،مثنوی کا انداز بیان ہے، زبان ،مثنوی کی زبان ہے، اس لیے ملفوظات کے صحیح ومستند ہونے میں بھی شبہہ کی وجہ نہیں ،فرق جو کچھ ہے ،وہ اجمال اور تفصیل اور نثر وشاعری کا ہے ،'فیہ مافیہ' مختصر ہے، اس لیے قدرۃ مطالب میں اجمال ہے، مثنوی کی سی تکرار وتفصیل ،شرح وبسط اس میں نہیں علیٰ ہذا جو جوش وخروش ، جو کیف ومستی ، جو درد وگداز مثنوی کے ایک ایک شعر میں ہے ،اس کا مقابلہ ملفوظات کے سارے اوراق مل کر بھی نہیں کر سکتے ،ان دو باتوں سے اگر قطع نظر کر لی جائے ،تو اور ہر حیثیت سے 'فیہ مافیہ' دونوں ایک ہی پھول کی پنکھڑیاں ،ایک ہی گلشن کی بہاریں ،ایک ہی نور کی تجلیاں ہیں۔''[۱]

مولانا ماجد صاحب نے 'تبصرہ فیہ مافیہ' کے آخر میں مولانا جلال الدین رومی کے تصوف ،مجالس اور فیہ مافیہ کے مشمولات کا تذکرہ اس طرح کیا ہے۔

> ''مولانا کا تصوف اسلام کا تصوف تھا ،کتاب وسنت کا تصوف تھا، طاعت وعبادت کا تصوف تھا، تقویٰ وطہارت کا تصوف تھا، رندی وبے قیدی ، آزادی ووارستگی کا تصوف نہ تھا، مولاناؒ کی مجالس ذکر الٰہی وتزکیہ نفس کی مجالس ہوتی تھیں، 'فیہ مافیہ' شروع سے آخر تک اسی تعلیم سے لبریز ہے، کہیں کسی آیت قرآنی کی تفسیر بیان ہو رہی ہے، کہیں کسی حدیث نبوی کی شرح ہو رہی ہے، کہیں ملحدوں اور بد مذہبوں کی تردید ہو رہی ہے، کہیں نماز کے لطائف

---

[۱] فیہ مافیہ: مرتب مولانا عبدالماجد دریابادی: ص:۳۲۔۳۳

واسرار بیان ہو رہے ہیں، کہیں اصول وعقائد اسلام کی خوبیاں روشن کی جا رہی ہیں، کہیں اصلاح نفس وتزکیہ باطن کے طریقوں کی تعلیم ہوری ہے کہیں اگلے بزرگوں اور اللہ کے دوستوں کے مناقب وفضائل ذکر ہو رہے ہیں، بس ان کے علاوہ، شروع سے آخر تک کسی مقام پر نہ آج کل کی رسمی پیرزادگی وسجادہ نشینی کا ذکر ہے، نہ قبور کے سجدہ وطواف کا، نہ چادر اور گاگر کا، اور نہ مروجہ عرس اور غسل مزارات کا! خاتمہ کلام ان الفاظ پر ہوا ہے جو بہت تھوڑے سے فرق کے ساتھ سلسلہ چشتیہ کے چشم وچراغ، حضرت سلطان المشائخ نظام الدین محبوب الٰہی کی زبان مبارک سے بھی ادا ہوتے ہیں، یعنی اللہ سے تقوی اختیار کرو، کم کھاؤ، کم سوؤ، کم بولو، گناہوں سے بچو، خواہشات نفس کو مغلوب کرو، خلق اللہ کا جور وجفا برداشت کرو، دن میں روزہ اور شب میں نماز کی عادت دائمی رکھو، بددین کی صحبت سے الگ رہو، اور صالحین کی صحبت اختیار کرو۔''[۱]

مولانا ماجد صاحب نے 'فیہ مافیہ' کو مختلف عنوانات کے تحت ترتیب دیا ہے۔ وہ اس طرح ہے۔

(۱) دیباچہ۔ اس میں تحقیق وترتیب کے متعلق درپیش مسائل کا اظہار خیال مولانا نے کیا ہے۔

(۲) تذکرہ مولانا جلال الدین رومی۔ اس عنوان کے تحت مولانا ماجد نے مولانا روم کی مفصل سوانح حیات لکھا ہے، اور ان کے نظریہ تصوف وتصانیف کا تذکرہ کیا ہے۔

(۳) تبصرہ فیہ مافیہ۔ اس عنوان کے تحت مولانا ماجد نے اصل متن کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔

(۴) فیہ مافیہ۔ اس عنوان کے تحت مولانا ماجد نے اصل متن کو حواشی وفرہنگ کے ساتھ نقل کیا ہے۔

'فیہ مافیہ' کی اہمیت وافادیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ شاعر مشرق علامہ اقبال نے مولانا ماجد سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ خود ہی اس کی تحقیق، تدوین وترتیب کا کام انجام دیں۔ علامہ اقبال کا وہ خط جس میں اس خواہش کا اظہار کیا گیا ہے اس کا یہ حصہ نقل کیا جا رہا ہے۔

''مولانا کی کتاب فیہ مافیہ کو آپ خود ایڈٹ کریں اس میں کوئی شک نہیں کہ یورپ میں وسائل ایڈٹ کرنے کے بہت زیادہ ہیں۔ لیکن آخر ہندی

---

[۱] فیہ مافیہ: مرتب مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۴۱۔۴۲

مسلمانوں کو بھی تو یہ کام کچھ نہ کچھ شروع کرنا ہے۔ میری رائے میں آپ یہ ضروری کام خود کریں۔ بعد میں یورپین ایڈیشن بھی نکل آئے گا۔''[۱]

تحفہ خسروی

۱۹۲۱ء کا ہندوستان سیاسی، سماجی اعتبار سے انتشار کا شکار تھا۔ شورش، بغاوت، قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ حاکم و محکوم کے درمیان محبت و سرپرستی کا رشتہ ختم ہو چکا تھا۔ خود غرضی، بد اخلاقی اور وقت پرستی کا بول بالا تھا۔ ہر حاکم یا بادشاہ اپنے تخت و تاج کو بچانے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار رہتا تھا۔ اس خاص پر آشوب و پرفتن ماحول میں انسانیت، روحانیت، شرافت وغیرہ جیسے جذبوں کا فقدان ہوتا جارہا تھا۔ مادیت، حاکمیت اور تانا شاہی کا غلبہ تھا۔ اس ماحول کا مقابلہ کرنے کے لیے اور حاکم و محکوم کے درمیان رشتہ محبت کو استوار کرنے کے لیے بادشاہ، حاکم، رعایا، محکوم وغیرہ کو ان کے فرائض اور حقوق کی یاد دہانی کے لیے مولانا ماجد دریابادی نے 'تحفہ خسروی' کا نایاب تحفہ انسانیت کو دیا۔ 'تحفہ خسروی' میں مولانا ماجد نے قرآن و حدیث، پند نامہ عطار، بہارستان، اخلاق جلالی، گلستاں، بوستاں، اخلاق محسنی، مثنوی معنوی، کیمیائے سعادت، سیاست نامہ، اور یونانی حکماء کے اقوال وغیرہ سے نصیحت آموز اقتباسات و اقوال کو جمع کر کے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کی ترتیب و اشاعت کا مقصد مولانا نے اپنے دیباچے میں اس طرح بیان کیا ہے۔

> ''آج دنیا جن مصائب کا شکار ہو رہی ہے، اور ہر جگہ شورش و غدر، فتنہ و فساد، جبر و استبداد کی جو آگ بھڑک رہی ہے، اس کا ایک خاص سبب یہ ہے، کہ حاکم و محکوم، راعی و رعیت، علی العموم دونوں گروہوں نے اپنے فرائض کو فراموش کر دیا ہے، ان کے باہمی تعلق کی بنیاد خلوص و اعتماد، محبت دوستی، ہمدردی، و خیر اندیشی پر ہونی چاہیے تھی۔ لیکن بجائے اس کے کس چیز پر ہے؟ بد گمانی و بے اعتمادی، نفاق و بیگانگی، بد اندیشی و بد خواہی پر۔..... مسلمانوں پر جب تک حب اسلام غالب رہا۔ تاج شاہی ہمیشہ عمامہ شریعت وجبہ طریقت کے اشاروں پر حرکت کرنا اپنا فرض سمجھتا رہا، لیکن آج جبکہ یہ بیدار کرنے والی جماعت خود خواب غفلت کی نظر ہے، عام خادمان علم پر فرض ہے، کہ اس شمع

---

[۱] (خط ۱۷ اپریل ۱۹۲۲ء) بنام مولانا عبدالماجد دریابادی: اقبال ریویو (خصوصی شمارہ اقبالیات ماجد) اپریل ۲۰۰۰ء: اقبال اکیڈمی حیدرآباد: ص: ۶۰

ہدایت کو اپنی بساط کے موافق روشن رکھیں، مسلمانوں کے فلسفہ حکومت و نظام سیاست پر افسوس ہے، کہ زمانہ حال کے کسی محقق نے اب تک توجہ نہیں کی، اس کے متعلق قدیم کتابوں میں معلومات کا بہت وسیع ذخیرہ موجود ہے، لیکن نہایت منتشر و متفرق ہے۔ اس سمندر کو کھنگالنے کے لیے طویل فرصت کی ضرورت ہے، حالات نے اگر مساعدت کی تو انشا اللہ کچھ روز میں اس کوشش کے نتائج منظر عام پر لائے جائیں گے۔ سر دست چند مستند ماخذوں سے صرف اقتباسات لے کر مختلف عنوانات کے ماتحت مرتب کر کے بغیر کسی قسم کی رائے زنی کے پیش کیے جاتے ہیں، توقع ہے کہ مسلمان والیان ریاست، امراء و حکام اعلیٰ نیز عامہ مسلمین کے لیے اس رسالہ کا مطالعہ مفید و سبق آموز ثابت ہوگا۔''[1]

مولانا ماجد نے اس کتاب کی جمع و ترتیب میں جن ماخذ سے استفادہ کیا ہے ان سب کا تذکرہ اپنے دیباچے میں کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

''چونکہ مخاطب اصلی پیروان اسلام ہیں، اس لیے سب سے مقدم مرتبہ قرآن و احادیث نبوی کا رکھا گیا ہے اس کے بعد جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے ان کی تصریح حسب ذیل ہے۔

(۱) کیمیائے سعادت۔ یہ امام حجت الاسلام غزالی کی تصنیف ہے۔ ان کی مشہور عالم تصنیف احیاء العلوم کا یہ گویا فارسی ایڈیشن ہے۔

(۲) مکاتیب امام غزالی۔ یہ امام صاحب کے فارسی مکتوبات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنے زمانے کے سلاطین امراء و وزراء کے نام تحریر فرمائے تھے۔

(۳) گلستاں۔ نامور معلم اخلاق شیخ سعدی کی مشہور و معروف تصنیف ہے۔

(۴) بوستاں۔ گلستاں کے ہم پایہ ان کی منظوم تصنیف ہے۔

(۵) پند نامہ۔ یہ بھی شیخ موصوف کے افادات علم سے ہے۔

---

[1] دیباچہ تحفہ خسروی: مرتب مولانا عبدالماجد دریابادی: ص:۱۔ الف۔۲

(۶) بہارستان ۔مشہور صوفی بزرگ ملا جامی کی اخلاقی تصنیف ۔

(۷) سبحۃ الابرار ۔موصوف کی منظوم عارفانہ تصنیف ۔

(۸) اخلاق ناصری ۔حکیم اسلام نصیر الدین محقق طوسی کی تصنیف جو انھوں نے امیر ناصر الدین کی فرمائش پر تیار کی تھی ۔

(۹) اخلاق جلالی ۔از ملا جلال الدین محقق دوانی ۔

(۱۰) اخلاق محسنی ۔از ملا حسین واعظ مصنف تفسیر حسینی وانوار سہیلی

(۱۱) قابوس نامہ ۔از سلطان قابوس شاہ شمس المعالی یہ ان نصائح کا مجموعہ ہے جو ایک بادشاہ نے اپنے ولیعہد کے لیے قلم بند فرمائے تھے ۔

(۱۲) سیاست نامہ ۔ یہ ان نصائح کا مجموعہ ہے ، جو مشہور مدبر و وزیر سلطنت نظام الملک طوسی نے سلطان ملک شاہ کے حسب الحکم اپنے وسیع تجربہ کی بنا پر تحریر فرمائے تھے ۔

ان کے علاوہ ایک ایک جگہ مثنوی مولانا روم اور شاہنامہ فردوسی کے بھی مختصر اقتباسات آگئے ہیں ، اور آخر میں وصایائے افلاطون وارسطو بہ طور ضمیمہ شامل کر دیے گئے ہیں ، شاہان یونان سے لے کر اس وقت تک صدہا سلاطین کا دستور العمل انھیں کے مطابق رہا ہے ۔'' [۱]

'تحفہ خسروی' میں شامل مضامین کے عنوانات اس طرح ہیں ۔

باب (۱) ۔ نیابت الٰہی وشکر نعمت ، خوف خدا و طاعت گذاری

باب (۲) ۔عدل وداد گستری

باب (۳) ۔شفقت وعفو، حلم وتحمل ، رحم ومغفرت

باب (۴) ۔ جود وکرم ، سخا وعطا

باب (۵) ۔انتخاب صحبت وحفظ مراتب ارباب علم

باب (۶) فرائض رعایا ، اطاعت ، خیر خواہی ووفاداری

---

[۱] دیباچہ تحفہ خسروی : مرتب مولانا عبدالماجد دریابادی : ص ۲۔۲ الف

باب (۷)۔ وصایائے افلاطون

باب (۸) وصایائے ارسطا طالیس

'تحفہ خسروی' ۷۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ مطبع منشی نول کشور لکھنو سے ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی۔

عدل وانصاف، جمہوریت اور طریقہ حکمرانی کے مقام ومرتبے کو جاننے کے لیے تحفہ خسروی بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔ اس لیے کہ اس کی جمع وترتیب میں مولانا ماجد نے کلام اللہ وحدیث رسولؐ کے علاوہ بھی جن کتابوں سے استفادہ کیا ہے، وہ کتابیں اخلاقیات وسیاسیات میں خاص مقام رکھتی ہیں۔ موضوع ومواد کے اعتبار سے یہ کتاب وقت کی اہم ضرورت تھی۔ لیکن مولانا ماجد صاحب اس کتاب کو بہت اہم نہیں سمجھتے تھے، اور اس کتاب کو اپنی تالیف میں شمار کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ 'آپ بیتی' میں لکھتے ہیں۔

''سلسلہ آصفیہ میں جو چیز سب سے پہلے آٹھ دس مہینہ بعد شروع ۲۰ء میں شائع کی، وہ کتاب کا ہے کو تھی ایک مجموعہ انتخاب تھا عدل وآداب جہاں بانی پر۔ آیات قرآنی واحادیث نبوی سے جو کچھ اس وقت مل سکا، وہ تھا اور اس کے بعد کچھ ٹکڑے تھے کیمیائے سعادت، اخلاق جلالی، گلستاں وسیاست نامہ، فارسی کی سات آٹھ کتابوں کے کل ۷۷ صفحہ کا رسالہ ۱۸ +۲۲ سائز پر چھاپ، اس کا نام تحفہ خسروی رکھ دیا۔ چھپنے کے بعد یہ کتاب اپنے کو ایسی پست نظر آئی کہ اپنی جانب اسے نسبت دیتے شرم آنے لگی۔ اس کے اشتہار واعلان کی نوبت برائے نام آئی۔''[۱]

'تحفہ خسروی' میں شامل مواد کی تلخیص ڈاکٹر تحسین فراقی نے مختصر مگر جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

'''تحفہ خسروی' میں شامل اقتباسات، حکیمانہ نکات، دل پذیر نصائح اور دلکش اسلوب بیان پر مبنی ہیں اور ان کا خلاصہ یہ ہے کہ سلطان عادل کا ایک یوم عدل ساٹھ سالہ عبادت سے بہتر ہے۔ دنیا وآخرت کی مثال کوزہ سفالیں اور کوزہ زریں کی ہے کہ کوزہ سفال کو بقا نہیں جب کہ کوزہ زریں کبھی ٹوٹتا

۱؎ آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۲۸۳

نہیں۔ سیاست فاضلہ امامت کا درجہ رکھتی ہے اور اس میں امور معاش اور معاد دونوں آتے ہیں۔ درجہ بادشاہی درجہ نبوت کے بعد ہے۔ پہلوان وہ ہے جو اپنے غصے پچھاڑ سکے۔ حضرت عیسیٰ سے پوچھا گیا کہ کس چیز کے ذریعے غضب الٰہی سے بچا جا سکتا ہے، فرمایا ترک غضب کے ذریعے۔ جس میں احسان نہیں، وہ انسان نہیں۔ سخی کی مثال کف گیر کی ہے کہ دوسروں کو رزق مہیا کرتا ہے اور خود خالی رہتا ہے۔ بہترین سلطان وہ ہے جو اہل علم کی نشست وصحبت اختیار کرتا ہے کہ علم، گنج سے بہتر ہوتا ہے کیونکہ خزانوں کی حفاظت تیرا کام ہے جبکہ علم تیری حفاظت کرتا ہے۔ امیر وقت کا کہا سنو خواہ وہ حبشی غلام اور کم عقل ہی ہو۔ حکمت قولی وحکمت عملی دونوں کا امتزاج ضروری ہے۔'' [۱]

مکتوبات سلیمانی

سید سلیمان ندوی کا شمار اردو ادب کے معماروں میں کیا جاتا ہے۔ وہ متنوع شخصیت کے مالک تھے، اور شبلی نعمانی کے شاگرد رشید اور جانشیں تھے۔ سید سلیمان ندوی مولانا ماجد دریابادی کے معاصر تھے لیکن عمر میں مولانا ماجد سے بڑے تھے پھر بھی دونوں کے تعلقات بے تکلفانہ اور دوستانہ تھے۔ وہ تمام معاملات ومسائل کے متعلق مولانا ماجد سے صلاح ومشورہ کرتے تھے۔ دونوں کے درمیان محبت واخوت کا رشتہ تقریباً ۴۰ رسالوں تک قائم رہا، اور کبھی تلخی کی نوبت نہ آئی۔ دونوں مشاہیر علم وفن میں مراسلت کا رشتہ بھی کئی سالوں تک قائم رہا۔ سید سلیمان ندوی علمی، ادبی، سیاسی وسماجی خانگی معاملات ومسائل سے متعلق ہمیشہ خطوط لکھ کر مولانا ماجد سے صلاح ومشورہ کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی بعض معاملات ومسائل میں مولانا ماجد کو سید سلیمان ندوی بھی صلاح ومشورہ دیا کرتے تھے۔ مولانا ماجد نے اپنے نام لکھے گئے سید سلیمان ندوی کے خطوط کو دو جلدوں میں 'مکتوبات سلیمانی' کے نام سے مرتب کر کے دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع کرایا تھا۔ پاکستان سے جناب چودھری طارق اقبال صاحب نے 'مکتوبات سلیمانی' کی دونوں جلدوں کو یکجا کر کے 'سید سلیمان ندوی کے خطوط عبدالماجد دریابادی کے نام' کے عنوان سے نفیس اکیڈمی کراچی سے ۱۹۸۶ء میں شائع کر دیا ہے۔ یہ ایڈیشن بہت عمدہ ہے۔ دونوں جلدوں کے یکجا ہونے کی وجہ

---

[۱] مولانا عبدالماجد دریابادی احوال وآثار: ڈاکٹر تحسین فراقی: ص: ۵۰۱

سے طلبہ اور محققین کے لیے بڑی سہولت ہوگئی ہے۔ اس مجموعے میں مولانا سید سلیمان ندوی کے کل ۲۷۷ خطوط شامل ہیں، اور تقریباً مولانا ماجد کے لکھے ہوئے ۲۲۰۰ توضیحی حاشیے بھی شامل ہیں۔ اس مجموعے میں مولانا ماجد کے لکھے ہوئے دونوں جلدوں کے دیباچوں کو بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ جلد اول کے دیباچے میں مولانا ماجد نے سید صاحب سے اپنے تعلقات اور مراسلت کی مدت کے متعلق اس طرح لکھا ہے۔

> ''خطوط کا مجموعہ جو آپ کے پیش نظر ہے۔ اس کی مدت کا رقبہ ۴۰ سال کا ہے سب سے پہلا خط ۱۹۱۲ء کا ہے اور سب سے آخری ۱۹۵۳ء کا۔ یہ مجموعہ سارے خطوں کا نہیں۔ سب کے سب نہ محفوظ رہ سکتے تھے اور نہ رہے، کچھ تو دیمک چاٹ گئی، کچھ بارش کے اثر سے دھل کر صاف ہوگئے۔ اور کچھ میری بے خیالی سے ادھر کے ادھر ہو گئے۔ اور شروع میں تو ان کے جمع و حفاظت کا اہتمام ہی نہ رہا۔ اخیر کے چند سالوں میں ۵۰ء و ۵۱ء ۵۲ء کا خط کوئی بھی تلاش سے نہ مل سکا۔ اس کا قلق خصوصیت کے ساتھ ہے ۵۳ء کا کل یہی ایک ہی خط مل سکا جو وفات سے چند ہفتہ قبل کا ہے۔ سید صاحب اپنے مرتبہ کے لحاظ سے واقعتہ میرے بزرگ تھے، سن میں بھی مجھ سے ۷/۸ سال بڑے تھے۔ لیکن اپنے کمال شفقت سے برتاؤ میرے ساتھ اس قسم کا رکھا ہے جیسے ایک بے تکلف دوست، دوست سے رکھتا ہے۔ اسی لیے ان خطوط میں ہر قسم کی گھریلو باتیں ملیں گی۔ ادبی، سیاسی، علمی، دینی بحثیں بھی اسی بے تکلف گھریلو انداز میں۔''[۱]

یہ خطوط نجی ہونے کے باوجود تاریخی، سماجی، ادبی، سیاسی اور علمی اعتبار سے بہت اہم ہیں۔ سید سلیمان ندوی کی شخصیت اور سوانح کے لیے یہ خطوط بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان خطوط سے سید سلیمان ندوی کے گھریلو حالات، تجارتی معلومات، اور ادبی نقطہ نظر کے ساتھ ساتھ ان کے معاصر، ادبی و سیاسی منظرناموں ورجحانات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ یہ خطوط مکتوب نگاری کے فن پر پورے اترتے ہیں۔ بے تکلفی، سادگی، اختصار اور محاکاتی لہجہ ان خطوط کی خصوصیات ہیں۔ سید سلیمان ندوی کے خاص اسلوب نگارش کی جھلکیاں ان خطوط میں بھی نظر آتی ہیں۔ طنز و ظرافت، ضلع جگت، اور ان کے مخصوص رنگ

۱؎ دیباچہ مکتوبات سلیمانی (جلد اول): مرتب مولانا عبدالماجد دریابادی: ص ۵۔۶

کی بدولت یہ خطوط دلچسپ ہو گئے ہیں۔ ان خطوط کی ادبی حیثیت کے متعلق مولانا ماجد 'مکتوبات سلیمانی' جلد دوم کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

''ان کے علم و ادب، ان کے فضل و کمال، ان کی تحقیق اور باریک بینی کی پوری شان اگر دیکھنا ہے۔ تو مطالعہ ان کی سیرۃ النبی کا، خطبات مدراس کا، خیام کا، اور دوسری کتابوں کا کیجیے۔ عام خطوط میں تو ان چیزوں کی صرف ہلکی سی جھلکیاں جابجا نظر آئیں گی۔''[۱]

بطور نمونہ 'مکتوبات سلیمانی' سے خطوط کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں تا کہ ان خطوط سے حاصل شدہ معلومات کے تنوع کا اندازہ لگایا جا سکے۔

مولانا ماجد دریابادی نے فلسفہ کے موضوع پر کوئی کتاب لکھنے کا خیال ظاہر کیا تھا اور سید صاحب سے اس سلسلے میں مشورہ طلب کیا تھا۔ اس کے جواب میں سید صاحب کے خط کا یہ حصہ ملاحظہ ہو۔

''آپ جڑ سے پہلے شاخ کیوں لیتے ہیں؟ فلاسفی سے اگر دلچسپی ہو تو لکھ دیجیے۔ فلسفہ کی تعریف، فلسفہ کے اقسام، جدید فلسفہ کی مختصر تاریخ، مصنفین رکبار کا مختصر بیان، اقسام فلسفہ کی تشریح اور مسائل کا خلاصہ، مباحث متعلقہ، فلسفہ کی فہرست اور ان کی توضیح واستدلال، اس طرح لکھیے گویا فلسفہ پر آپ ایک جامع ومتین کتاب لکھ رہے ہیں۔ جو کسی یونیورسٹی میں داخل ہونے والی ہے۔''[۲]

مولانا ماجد دریابادی نے معارف میں ایک غزل برائے اشاعت بھیجی تھی۔ اس غزل کے مقطع کا شعر قابل اصلاح تھا۔ سید سلیمان ندوی نے اس کی اصلاح کر دی اور بطور اطلاع مولانا ماجد کو خط لکھا جس کا یہ حصہ نقل کیا جا رہا ہے۔

''ہاں صاحب ایک گستاخی معاف کیجیے کہ ناظرؔ کی غزل کے مقطع میں ایک لفظ گرتا تھا 'ایسی کشش کچھ حلقہ دار و رسن میں ہے' حلقہ کی جائے حلقی حلق سے نیچے اتر جاتی ہے، میں نے اسے نگل دیا، سوائے اس کے چارہ نہ تھا' کچھ ایسا جذب حلقہ دار و رسن میں ہے' اس میں بھی الف دبتا ہے لیکن گرتا نہیں ہے۔

---

۱ دیباچہ مکتوبات سلیمانی (جلد دوم): مرتب مولانا عبدالماجد دریابادی: ص ۴

۲ مکتوبات سلیمانی (جلد اول): مرتب مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۵۱۔۵۲

جذب اور کشش کے فورس میں جو فرق ہے وہ مانتا ہوں، لیکن چارہ کار نہیں۔''[۱]

مولانا ماجد کو دراصل مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ مغربی علوم پر بھی قدرت حاصل تھی۔ سید سلیمان ندوی مولانا ماجد کی انگریزی دانی پر فخر کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ کاش مجھے انگریزی آتی تو میں دین کی خدمت بہتر طریقے سے کرتا۔ سید صاحب مولانا ماجد کو مخلصانہ مشورہ بھی دیتے ہیں کہ علمی، فکری و مذہبی کام آپ انگریزی زبان میں انجام دیا کریں۔ مولانا ماجد ممبئی میں ایک خطبہ دینے والے تھے جس کے متعلق سید صاحب نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ انگریزی میں خطبہ دیں۔ خط کا یہ حصہ ملاحظہ ہو۔

''آپ انگریزی سے گریز کرتے ہیں، اور بخدا میں حسرت کرتا ہوں کہ میں انگریزی سے محروم رہا، ورنہ میں دین اور خالص دین کا کام چوگنے اثر کے ساتھ کر سکتا، آپ اپنی دنیا اردو داں طبقہ تک محدود کر کے علم و مذہب کا بڑا فائدہ نہیں پہنچایا، آپ کا فرض ہونا چاہیے تھا، جو ہم جیسوں کی آواز نہیں سن سکتے۔ آپ برا مانیں گے اور میں کہوں گا کہ آپ نے اپنے کو خانقاہ کے دائرہ میں بند کر کے اپنے کو محدود اور دوسرے کو فائدہ پہنچانے کے سلسلہ کو مختصر کر دیا۔ اس درازنفسی کا حاصل یہ ہے کہ آپ کو یہ خطبہ انگریزی میں دینا چاہیے۔''[۲]

اسلام کی طرف مراجعت کے بعد مولانا ماجد نے مشرقی علوم وفنون اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت کو اپنا مشن بنالیا تھا، اور بڑے شد و مد کے ساتھ اس میں مصروف رہتے تھے۔ مولانا نے سائنسی و مغربی علوم وفنون سے خود کو الگ کر لیا تھا۔ اس سلسلے میں سید صاحب مولانا ماجد کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ مغربی علوم وفنون کی طرف توجہ دیں اس خط کا یہ حصہ نقل کیا جا رہا ہے۔

''کاش ایسا ہوسکتا کہ مولویت کے بجائے آپ پھر فلسفیت کا قلم ہاتھ میں لیتے اور فلسفہ مذہب کا تار تار بکھیر دیتے، اور صحیح فلسفہ مذہب پیش کرتے۔ میں اس کتاب کے مشرقی و مذہبی مباحث کی تنقید تو کر سکتا ہوں مگر مغربی خیالات کی تنقید میرے بس سے باہر ہے، اس کے لیے ایک فلسفی قلم کی ضرورت ہے۔ کیا اس بہانہ سے الکلام کی تلافی نہ کی جا سکے گی، مولانا عبدالماجد سے زیادہ ہم کو

---

[۱] مکتوبات سلیمانی (جلد اول): مرتب مولانا عبدالماجد دریابادی: ص:۷۹

[۲] ایضا: ص:۲۸۴۔۲۸۵

مسلمان صوفی مسٹر عبدالماجد بی.اے کی ضرورت ہے۔'' [1]

سید سلیمان ندوی اکثر و بیشتر خطوط میں اپنے کسی فقرے یا عبارت کے استعمال اور دارالمصنفین کی کتابوں کی اشاعت وغیرہ کے متعلق مولانا ماجد سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ یہ خط ملاحظہ ہو۔

''پروفیسر معتضد ولی الرحمٰن صاحب (حیدرآباد دکن) نے سایکالوجی آف فلاسفر کا ترجمہ کیا ہے۔ اور بشرائط اس کو دارالمصنفین کو دینا چاہتے ہیں، مجھے تو یہ پسند نہیں۔ مگر میں چونکہ اس موضوع میں بے بصر ہوں، اس لیے آپ کی رائے چاہتا ہوں ترجمہ کا مرسلہ آپ کے پاس بھیجتا ہوں دیکھ کر واپس فرما دیجیے۔

میں نے سیرت جلد ششم اخلاق میں ایک فقرہ لکھا ہے۔ ''حکمائے اخلاق کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ انسان کا کوئی فعل غرض و غایت سے خالی نہیں ہوتا، لیکن غلطی اس میں ہے کہ وہ تلاش کرتے ہیں کہ غرض و غایت کیا ہوتی ہے اور یہ نہیں بتاتے کہ کیا ہونی چاہیے۔'' ایک صاحب جو اخلاقیات کے سابق حکیم اور مترجم ہیں۔ لکھتے ہیں کہ علمائے اخلاق ایسا نہیں کہتے۔ لیکن مجھے تو یہی نظر آیا۔ آپ فرمائیں کہ کیا میرا خیال صحیح ہے؟ اور نہیں تو آپ بتایے کہ یہ عبارت کس طرح لکھی جائے۔ اور صحیح بات کیا ہے۔ دوسرا فقرہ۔ (اخلاقیات کے مختلف فرقوں کی تحدید کے سلسلے میں) ''ذرا وسعت نظر سے کام لیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان تمام اختلافات کا منشا صرف ایک ہے، یعنی یہ کہ آیا ہمارے اخلاق کی بنیاد کوئی روحانی تخیل ہے۔ یا محض جسمانی پہلے کو یونانی اصطلاح میں 'رواقیہ' اور دوسرے کو 'لذیۃ' موجودہ اصطلاح میں پہلے کو 'ضمیریہ' اور دوسرے کو 'افادیہ' کہہ لیجیے۔ یا ایک اور تعبیر کے لحاظ سے یوں کہیے کہ پہلا فریق اخلاق کی بنیاد 'جذبات' پر قرار دیتا ہے اور دوسرا 'عقل' پر، پھر دو منشائے اختلاف کے تحت میں تعبیر کے اختلاف سے اور بہت سے فرقے پیدا ہو گئے۔ ارسطو اور اس کے متبعین نے اخلاق کا منبع نفس کو قرار دیا ہے۔'' اس فقرہ پر بھی 'حکیم موصوف'

---

[1] مکتوبات سلیمانی (جلد اول): مرتب مولانا عبدالماجد دریابادی: ص:۲۸۶

نے انکار کا نشان بنایا ہے۔ کیا یہ تعبیر صحیح نہیں ہے؟''[۱]

سید سلیمان ندوی کے خطوط میں سنہ و تاریخ کا التزام نہ تھا۔ وہ سنہ ہجری لکھا کرتے تھے، اس کا ذکر 'مکتوبات سلیمانی' جلد دوم کے دیباچے میں مولانا ماجد نے کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''سید صاحب کے خطوں میں سنہ و تاریخ کا التزام نہ تھا۔ حتی الامکان اس کمی کو پورا کر دیا گیا ہے اور اخیر عمر کے تو اکثر خطوں میں بجائے سنہ عیسوی کے صرف سنہ ہجری درج ہوتا تھا جہاں جہاں بہ آسانی ممکن ہوا، سنہ عیسوی کا اضافہ۔ پرانی جنتری دیکھ کر کر دیا گیا۔ املا بھی جا بجا سہواً غلط ہو گیا تھا۔ حتی الامکان اس کی بھی صحت کر دی گئی ہے۔''[۲]

خطوط مشاہیر

'خطوط مشاہیر' ان خطوط کا مجموعہ ہے جو مولانا ماجد کے نام مشاہیر علم وفن علامہ شبلی نعمانی، اکبرالہ آبادی اور محمد علی جوہر نے لکھے تھے۔ ان تینوں عظیم شخصیات کا مولانا ماجد بڑا احترام کرتے تھے، اور اپنا سرپرست و کرم فرما تصور کرتے تھے۔ مولانا نے ان مشاہیر علم وفن کے مکتوبات کو ترتیب و تدوین کر کے 'خطوط مشاہیر' کے نام سے تاج کمپنی سے شائع کرایا۔ اس کے متعلق مولانا آپ بیتی میں فرماتے ہیں۔

''وقت کے مشاہیر اہل علم، اہل شعروادب واہل سیاست کے خطوں کا ذخیرہ اپنے پاس ایک عرصہ سے موجود تھا۔ جی میں آیا کہ انھیں مرتب کر کے اور ان پر اپنے حاشیے بڑھا کر انھیں چھاپ دیجیے۔ چنانچہ پہلی جلد 'خطوط مشاہیر' کے نام سے مولانا شبلی اور اکبرالہ آبادی اور مولانا محمد علی جوہر کے خطوں کی اپنے دیباچوں اور بہ کثرت حاشیوں کے اضافے کے ساتھ تاج کمپنی کو پانسو نقد کے معاوضہ پر دے دی اور اس نے غالباً ۱۹۴۷ء میں چھاپ دی۔''[۳]

'خطوط مشاہیر' کی طبع ثانی تقریباً ۲۲ رسال بعد ہوئی۔ نظر ثانی کے بعد مولانا ماجد نے جابجا اپنی عبارتیں بھی تبدیل کر کے اور حاشیوں میں مزید اضافہ کرنے کے بعد ۱۹۶۹ء میں نسیم بک ڈپو لکھنو سے شائع کرایا۔ خطوط مشاہیر میں چار دیباچے شامل ہیں۔ ایک دیباچہ 'خطوط مشاہیر' پر اور تینوں مشاہیر کے خطوط

---

[۱] مکتوبات سلیمانی (جلد دوم): مرتب مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۵۸-۵۹

[۲] ایضاً: ص: ۵ : [۳] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۲۸۹

سے قبل ایک دیباچہ لکھا گیا ہے۔اس مجموعے میں مولانا ماجد کے نام لکھے گئے خطوط کی کل تعداد ۲۶۷ ہے۔ جن میں شبلی نعمانی کے ۴۰، اکبرالہ آبادی کے ۱۹۷، اور محمد علی جوہر کے ۳۰ خطوط شامل ہیں۔دیباچوں میں مکتوب نگاروں کی ادبی شخصیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مولانا ماجد کو شبلی نعمانی، اکبرالہ آبادی اور محمد علی جوہر سے قلبی محبت اور والہانہ عقیدت تھی، اور ان تینوں حضرات سے مولانا کو علمی، فکری، جذباتی وابستگی بھی تھی۔تینوں مشاہیر مولانا ماجد سے عمر میں بڑے تھے، مگر مولانا کے تعلقات ان سب سے مخلصانہ اور نیاز مندانہ تھے۔مولانا ماجد نے 'خطوط مشاہیر' کے دیباچے میں ان شخصیات سے اپنے مراسم اور تعلقات کے ساتھ ساتھ ان کی ادبی زندگی پر روشنی ڈالی ہے وہ لکھتے ہیں۔

> ''مولانا شبلی، حضرت اکبرالہ آبادی، مولانا محمد علی اپنے وقت کے مشاہیر میں ہوئے ہیں۔مولانا شبلی (متوفی ۱۹۱۴ء) اپنے زمانے کے ایک ممتاز ادیب، مورخ، شاعر، سیرت نگار، متکلم اور خطیب شیوا بیان۔پڑھے لکھوں کے حلقہ میں پوری شہرت رکھتے تھے۔میر اکبرحسین الہ آبادی (متوفی ۱۹۲۱ء) شاعر وظریف کی حیثیت سے ملک بھر میں چھائے ہوئے تھے۔مولانا محمد علی (متوفی ۱۹۳۱ء) ایک زبردست قومی لیڈر، اہل علم اور پرجوش خطیب کی حیثیت سے عوام وخواص سب نے جانا۔میرے تعلقات ان سب حضرات سے مخلصانہ ہونے کے ساتھ ہی محض خسروانہ اور نیاز مندانہ تھے، معاصرانہ اور مساویانہ نہ تھے۔نہ ہو سکتے تھے۔ مولانا شبلی کے زمانہ میں تو میری کالج کی طالب علمی بس ختم ہی ہوئی تھی۔حضرت اکبر میرے والد مرحوم کے ملنے والے اور سن میں ان سے کچھ بڑے ہی تھے مولانا محمد علی البتہ سن میں صرف چودہ سال بڑے تھے اور بے تکلف ہو ہو کر مجھے گستاخ بھی بناتے رہے۔لیکن اسے کیا کیجیے کہ ان کی اخلاقی عظمت اور دماغی بلندی دونوں نے 'ایاز' کو بھی 'قدر خود بشناس' کی حد سے باہر نہ قدم رکھنے دیا۔''[۱]

خطوط مشاہیر میں پہلے نمبر پر شبلی کے خطوط کو شامل کیا گیا ہے۔اس میں شامل پہلے خط کے علاوہ سبھی

---

[۱] دیباچہ خطوط مشاہیر: مرتب مولانا عبدالماجد دریابادی: ص:۶-۷

خطوط ان کے آخری ایام کے ہیں۔ پہلا خط مولانا ماجد نے شبلی نعمانی سے عبدالباری ندوی جو مولانا ماجد کے دوست تھے ان کا داخلہ علی گڑھ میں کرانے کی سفارش کی تھی اس کے جواب میں شبلی نعمانی کا یہ خط ہے۔ باقی شبلی کے تمام خطوط ۱۹۱۳ء اور ۱۹۱۴ء کے ہیں۔ ان تمام خطوط میں سیرۃ النبی کی تالیف وتصنیف، ندوۃ العلماء کے مسائل وغیرہ کا تذکرہ ملتا ہے۔ دیباچہ میں مولانا ماجد لکھتے ہیں۔

''بجز پہلے خط کے یہ سارے خط مولانا کی زندگی کے آخری دور کے ایک بہت مختصر زمانہ کے ہیں۔ یعنی نومبر ۱۹۱۳ء سے لے کر جولائی ۱۹۱۴ء تک کل نو مہینہ کی مدت کے مولانا اس زمانہ میں سیرۃ النبی کی تالیف میں مشغول بلکہ منہمک تھے۔ اور ندوہ کے اندرونی اختلافات سے ملول و مایوس ہو کر اس سے گویا ہٹتے جا رہے تھے۔ خطوط میں ان دونوں چیزوں کے اثرات قدرتا نمایاں ہیں۔''[۱]

سیرۃ النبی لکھتے وقت شبلی نعمانی کو انگریزی ادب سے مدد لینی پڑتی تھی۔ شبلی نعمانی انگریزی سے ناواقف تھے اس لیے انھوں نے مولانا ماجد کو سیرۃ النبی کے تالیفی اسٹاف میں رکھا تھا، اور مولانا ماجد انگریزی سے ترجمہ کر کے دیتے تھے۔ اس کا تذکرہ شبلی کے ایک خط میں کیا گیا ہے۔ خط کا یہ حصہ نقل کیا جا رہا ہے۔

''آپ صرف مترجم نہیں بلکہ مصنف بھی ہیں۔ اس لیے آپ کے سوا کوئی اور شخص مشکل سے میرے ارادوں اور خواہشوں کے موافق کام کر سکے گا۔ بہر حال جو فیصلہ ہو مطلع کیجیے گا۔ ترجمہ میں آنحضرتؐ کے متعلق مفرد کی ضمیر نہ استعمال کیجیے بلکہ جمع کی۔''[۲]

سیرۃ النبی لکھتے وقت سیرت نبوی پر مستشرقین کے اعتراضات کے ضمن میں شبلی نعمانی کے پاس مواد کا خاصہ ذخیرہ تھا۔ لیکن انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے ایسے ماخذ تک براہ راست ان کی رسائی نہ تھی اس لیے مولانا ماجد سے خطوط کے ذریعہ انسائیکلوپیڈیا وغیرہ سے عرب کی قدامت، عرب میں کون کون حکومتیں قائم ہوئیں، فارسٹر کا جغرافیہ تاریخی سے عرب قدیم کے متعلق معلومات مفید نادرہ انتخاب، اور کسی خط میں انگریزی کتابوں کی فہرست بنانے کی درخواست کی گئی ہے، اور کہیں اسلام کی آمد پر فارس اور ہند کی تہذیبی

۱۔ دیباچہ شبلی نامہ: خطوط مشاہیر: مرتب مولانا عبدالماجد دریابادی: ص:۹

۲۔ خطوط مشاہیر: مرتب مولانا عبدالماجد دریابادی: ص:۱۵

حالت کے متعلق معلومات فراہم کرنے کی درخواست کرتے نظر آتے ہیں۔

سیرۃ النبی کی امداد ریاست بھوپال سے آتی تھی۔ اس لیے شبلی کے مخالفین نے چار پانچ کفر کے فتوے شبلی کے خلاف لکھ کر بھیج دیا تھا، اور شبلی نے مولانا ماجد کو خط لکھا اس خط کے ایک ایک جملے سے شبلی کے دردو کسک اور خلوص کا اظہار ملتا ہے۔ خط کا یہ حصہ نقل کیا جا رہا ہے۔

''مولویوں نے میرے کفر کے فتوے چار پانچ لکھ کر بھوپال بھجوائے ہیں اور اشاعت کفر میں سفرائے ندوہ سے کام لیا جا رہا ہے۔ آفتاب احمد اور علی گڑھ کی سخت پارٹی اصلاح ندوہ کی مخالفت اور حالات موجودہ کی حمایت پر جان لڑا دینے کے لیے آمادہ ہے۔ یہ ہے ہمارا خلوص خیر زمانہ گو حقیقت شناش نہیں ہے تاہم ہمیشہ نقاب میں نہیں رہے گا۔''[۱]

شبلی نعمانی جب یہ خطوط مولانا ماجد کو لکھ رہے تھے، اس وقت مولانا عقل پرست، مذہب بیزار ہو چکے تھے۔ کہیں کہیں ان خطوط میں مخلصانہ وحکیمانہ روش تبلیغ بھی نظر آتی ہے۔ مذہب بیزاری کے باوجود شبلی نعمانی نے مولانا ماجد کو ان کی لیاقت کی وجہ سے سیرۃ النبی کے اسٹاف میں شامل کر رکھا تھا۔ ندوۃ العلماء کے عالموں نے سخت مخالفت کی اور شبلی کو بددین، فاسد العقیدہ شخص قرار دے دیا۔ شبلی کے خط پر حاشیہ لکھ کر مولانا ماجد نے ان تمام باتوں کی وضاحت کی ہے۔ یہ خط اور مولانا ماجد کا حاشیہ نقل کیا جا رہا ہے۔

(خط) ''سر دشت آپ کوئی ترجمہ یا اقتباس نہ فرمائیں اور اس واقعہ کو بہ صیغہ راز رکھیں۔''

(حاشیہ) سیرت نبوی کی بھوپال سے گرانقدر مالی امداد ہو رہی تھی۔ اب مولانا کے خلاف علماء کے ایک طبقہ نے یورش کی کہ شبلی تو خود ایک بددین، فاسد العقیدہ شخص ہے اور اپنے اسٹاف میں بھی کھلے ہوئے بیدینوں کو رکھے ہوئے ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرا تعلق سیرت کے اسٹاف سے ختم ہو گیا۔''[۲]

مولانا ماجد نے شبلی کے لکھے ہوئے خطوط جو ایک ان کے والد صاحب اور دوسرا ان کے چچازاد بھائی ڈاکٹر محمد سلیم کے نام تھا اسے بھی ضمیمہ کے تحت شامل کیا ہے۔

۱۔ خطوط مشاہیر: مرتب مولانا عبدالماجد دریابادی: ص:۲۹

۲۔ ایضاً: ص:۳۱

خطوط مشاہیر میں دوسرے نمبر پر اکبرالہ آبادی کے خطوط کو شامل کیا گیا ہے۔ اکبرالہ آبادی اور مولانا ماجد کے درمیان مراسلاتی سلسلہ اگست ۱۹۱۳ء سے لے کر اکبر کی وفات اگست ۱۹۲۱ء تک جاری رہا۔ اکبر کی عمر ۶۶ سال تھی اور مولانا ماجد کی ۲۰ سال تھی۔ اکبر کے یہ خطوط اہمیت کے حامل ہیں مولانا کو اکبر سے قلبی محبت تھی اکبر سے وہ بہت متاثر تھے اکبرالہ آبادی کے متعلق مولانا ماجد دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

''اکبر نثر پر توجہ کرتے تو یقیناً ایک نامور ادیب ہوتے۔ ان کے حسن ادب اور شگفتہ نگاری کے نمونے ان اوراق میں شروع سے آخر تک بکھرے ہوئے نظر آئیں گے۔ چھوٹے چھوٹے جملے بات بات میں پیدا کرنا طوالت، ثقالت سے بچنا پیچیدہ ترکیبوں ۔مغلق لفظوں سے احتیاط۔ بیان کی صفائی، روانی سلاست یہ سب ان کے قلم کے خاص جوہر ہیں۔ پھر اسی کے ساتھ باتیں اتھلی نہیں، گہری، مطالب کی بلندی۔ خیالات کا عمق۔ اکبر نرے ادیب ہی نہیں اچھے خاصے مفکر اور فلسفی بھی تھے۔ مغربی فلسفے پر نظر رکھنے والے اکبر پڑھتے کم تھے سوچتے زیادہ تھے۔ دوسروں کے خیالات جذب کم کرتے خود انھیں کے خیالات ابلتے زیادہ رہتے تھے۔ فلسفہ خوان و فلسفہ دان کم تھے۔ دانش آموز، حکمت آفریں زیادہ تھے، اوران کی ذہانت بے پناہ تھی۔''[۱]

مکتوبات اکبر کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک مفکر اسلام، عشق رسول میں ڈوب کر اپنے چھوٹے کو مخلصانہ اور سرپرستانہ لہجوں میں مخاطب کرتا ہے، اوراس کے ذہن وفکر کی تعمیر واصلاح اسلام کی روشنی میں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مولانا ماجد کو اکبرالہ آبادی تلاوت کلام پاک اوراس کی تفہیم کا مشورہ دیتے ہیں۔ خط کا یہ حصہ نقل کیا جارہا ہے۔

''برادرم قرآن شوق سے دیکھیے ۔خوب دیکھیے ۔ یہاں تک کہ بلا مدد ترجمہ اس کے ظاہری معنی سمجھنے لگئے۔ تفسیر کی تو حد نہیں ۔ مذاق مفسرین کی بوقلمونی حیرت انگیز ہے۔ قرآن مجید کو بطور تلاوت پڑھا کیجیے۔ ایک سرے سے پڑھ جایئے اور پھر پڑھیے ۔ زیادہ نہ رکیے ۔ پڑھتے جایئے ۔ثواب کا عقیدہ نہ

---

[۱] دیباچہ خطوط مشاہیر: مرتب مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۳۵۔۳۶

سہی۔لٹریری لطف وذوق کا خیال کیجیے۔ ہر وقت طبیعت یکساں نہیں رہتی۔کسی وقت کوئی آیت دل کو متوجہ کرے گی۔مزا آئے گا یا کوئی مسئلہ منکشف ہوگا جو اس وقت یا ان روزوں ذہن میں رہے۔کسی وقت اسی طرح کوئی اور آیت دامن دل کو کھینچے گی۔غور اور اسٹڈی اور کریٹیسزم اور مضمون نگاری کے لیے قرآن مجید کو خاص طور پر جابجا حسب مرضی دیکھنے کا کوئی اور وقت نکالے۔''[۱]

نو دس سال تک قائم رہنے والے الحاد وتشکیک کا محل آخر مسمار ہونے لگا اور عقل پر عشق کا غلبہ ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ مسٹر عبدالماجد کا رجحان اسلامی ہوتا جارہا تھا۔ اکبر الہ آبادی نے اپنے ایک خط میں خوشی اور اطمینان کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔خط کا یہ حصہ نقل کیا جارہا ہے۔

''میں خوش ہوں کہ اس کی صداقت کے آثار آپ کی صاف اور بلند طبیعت سے نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔ ہمارے مکرم ڈپٹی صاحب مرحوم کو شاید شبہہ وافسوس تھا کہ لڑکا دین سے بیگانہ ہوتا جاتا ہے۔اب فرشتوں سے یہ سن کر ان کی روح خوش ہوگی کہ وہ لڑکا حقیقت آشنا ہوتا جاتا ہے۔اور انشا اللہ بہت جلد کہہ دے گا 'بمقام رسیدہ ام کہ مپرس'۔''[۲]

اکبر الہ آبادی کو مولانا ماجد سے بہت محبت وشفقت اور دلی وابستگی تھی جس کا ثبوت ان کا یہ خط ہے۔خط کا یہ حصہ نقل کیا جارہا ہے۔

''پیارے ماجد۔اللہ آپ کو جیتا رکھے۔آپ ایسی محبت میرے ساتھ رکھتے ہیں۔اگر افاقہ کیا معنی بے چینی میں ذرا کمی ہوجاتی اور لطف مکالمت کی امید ہوتی تو میں فوراً آپ کو لکھتا۔آپ تو میرے لیے روحانی قوت ہیں۔''[۳]

خطوط مشاہیر میں تیسرے نمبر پر مولانا محمد علی جوہر کے خطوط شامل ہیں۔ یہ خطوط مئی ۱۹۱۳ء سے ۱۹۳۰ء کے درمیانی وقفہ میں لکھے گئے ہیں۔مولانا محمد علی جوہر کے دو طویل خطوط ۱۹۱۶ء کے ایسے بھی ہیں جو انگریزی میں لکھے گئے تھے۔مولانا ماجد نے انھیں ترجمہ کر کے شامل کیا ہے۔ابتدائی خطوط محمد علی کی زندہ دلی اور شگفتگی کا مرقع ہیں اور آخری ایام کے خطوط میں مایوسی، حرماں نصیبی اور درد وغم وغیرہ کا اظہار ہوا ہے۔

---

۱ خطوط مشاہیر: مرتب مولانا عبدالماجد دریابادی: ص:۷۹-۸۰

۲ ایضاً: ص:۱۳۲ ۳ ایضاً: ص:۱۴۱

مولانا ماجد نے دیباچے میں مکتوب اور مکتوب نگار کے متعلق لکھتے ہیں۔

''خطوط اس مجموعہ میں تعداد میں زیادہ نہیں۔لیکن بعض بہت ہی مفصل ہیں گویا ایک رسالہ کے مساوی الحجم۔اور محمد علی کی روح کے ترجمان تو سب کے سب ہیں محمد علی کی خطوط نویسی کا طریقہ بھی یہی تھا۔وہ خط زیادہ نہیں کم لکھتے۔ زیادہ لکھنے کی انھیں فرصت ہی کب ملی؟ لیکن جب بھی لکھتے۔دل کھول کر رکھ دیتے دل کو بند رکھنا۔زبان کو روک رکھنے کی طرح تو وہ جانتے ہی نہ تھے۔محمد علی کی زندگی تاریخ امت کے حادثوں میں ایک حادثہ (ٹریجڈی) ہے۔موافق حالات اور سازگار فضا میسر آجاتی تو خدا معلوم وہ کہاں سے کہاں پہنچ جاتے۔کیا کچھ کر ڈالتے۔کیسا انقلاب برپا کر جاتے۔لیکن مشیت کہ یہ منظور نہ تھا۔کل ۵۳ سال کی عمر میں وہ ہر طرف سے مایوس ہر طرح سے دل شکستہ دنیا سے سدھار گئے یہ عمر بھی کوئی عمر ہے! قوم کے طنز وتعریض نے دل چھلنی کر ڈالا تھا کوئی الزام مشکل سے بچ رہا ہوگا۔جو اس غریب پر نہ تھوپ دیا گیا ہو۔غدار، قوم فروش، خائن، ہندو نواز، جاہ پرست، خوشامدی، غرض ہر تیر کا ہدف محمد علی کا دل وجگر تھا! یقین نہ آئے تو آج بھی اس وقت کے اخباروں کے فائل تلاش کر لیے جائیں۔مخالف ومعاند ماحول نے تو علی مرتضیٰ اور عثمان غنیؓ جیسے سرداران امت اور اجل صحابہ تک کو 'ناکام' رکھا تو محمد علی غریب کا کیا ذکر! پھر کہاں وہ زمانہ خیر القرون سے متصل۔اور کہاں یہ بیسویں صدی عیسوی کا عہد ظلمات۔''[۱]

محمد علی جوہر کے ان خطوط سے عشق رسول اور قرآن سے دلچسپی اور اسلام سے اٹوٹ محبت، اقبال اور ان کے کلام اور خاص طور سے ان کی فارسی مثنویات (اسرار ورموز) سے شدید لگاؤ کا بکثرت اظہار رہا ہے۔ خط میں جا بجا انھوں نے علامہ اقبال کے اشعار کو کوٹ کیا ہے۔ان خطوط میں محمد علی جوہر کا حکیمانہ طرز اور خطیبانہ انداز نظر آتا ہے۔انھوں نے اپنے ایک خط میں مولانا ماجد کی فلسفہ کے موضوع پر لکھی گئی کتاب 'سائیکالوجی آف لیڈر شپ' پر مفصل تنقید بھی لکھی ہے۔جوہر کے یہ خطوط زیادہ تر تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔

---

[۱] دیباچہ خطوط مشاہیر: مرتب مولانا عبدالماجد دریابادی: ص:۱۸۶۔۱۸۷

وہ خطوط بہت کم لکھتے تھے لیکن جب لکھتے تھے تو کئی کئی صفحات پر مشتمل ہوتے تھے۔ حالت اسیری اور نظر بندی کے بعض خطوط اس میں شامل ہیں۔ان زندانی خطوں میں محمد علی جوہر کی غزلیں بھی درج ہیں۔محمد علی جوہر کا بیشتر کلام قید و نظر بندی کے ایام کی یادگار ہیں۔ان خطوط کی بدولت مولانا محمد علی جوہر کی بعض زندانی غزلیں محفوظ ہوگئی ہیں۔محمد علی جوہر کے یہ خطوط ادبی، سیاسی، سماجی، معاشرتی اور ثقافتی اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں۔ان میں شامل محمد علی جوہر نے ایک خط میں اپنی سوانحی خودنوشت بھی لکھی ہے۔ان کی زندگی سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے مذکورہ خط بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتا ہے۔

مولانا محمد علی جوہر کے اکثر و بیشتر خطوط میں مولانا ماجد کو اسلام کی عظمت اور رسالت مآبؐ کی شوکت کا اعتراف کرانے کی کوشش ملتی ہے۔خطوط کے چند اقتباسات بطور نمونہ نقل کیے جا رہے ہیں۔

''کیا مسلمانوں کے لیے یہ بات مایہ ناز نہیں کہ تیرہ سو برس سے زیادہ عرصہ گذر گیا۔مگر مسلمانوں نے اس ام الکتاب کو اس احتیاط سے رکھا کہ آج تک ایک لفظ یا حرف تو کجا زیر و زبر کا بھی فرق نہیں ہونے پایا اور تمام فرقے اس پر اتفاق کلی کرتے ہیں۔قرآن پاک تو قرآن پاک دوسرے صحائف ہمارے کتب حدیث کی تحقیق و تدقیق اور صحت و حفاظت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔''[۱]

''غزالی کا فلسفہ مجھ سے زیادہ آپ نے پڑھا ہوگا۔اِن کی احیاء العلوم کا اگر ترجمہ فرانسیسی زبان میں ہوگیا ہوتا تو ڈیکارٹ کو دنیا چور سمجھتی۔مگر ان کی خود تصنیف کردہ سیرت بلکہ سوانح قلبی و دماغی کو ملاحظہ فرمایے۔آخر میں اس کا اعتراف ہے کہ اصل وہی مشاہدہ ہے جو حسیات ظاہرہ سے مستغنی اور استدلال و حجت سے بے نیاز ہے۔''[۲]

''آپ کو تو بہ فضلہ تعالیٰ خدا اور رسول کا انکار نہیں ہے۔ برائے خدا اور رسول اپنی عقل و تمیز علم و تحقیقات کو اسلام اور صرف اسلام کے لیے وقف کر دیجیے۔اور اس دانش حاضر کے حجاب اکبر میں مستور و محجوب نہ رہیے۔''[۳]

۱۔ خطوط مشاہیر: مرتب مولانا عبدالماجد دریابادی: ص:۲۰۸

۲۔ ایضاً: ص:۲۲۶ ؛ ۳۔ ایضاً: ص:۲۳۱

باب چہارم

عبدالماجد دریابادی بحیثیت سوانح نگار

اردو زبان وادب کی خمیر اور فطرت میں اسلامی فکر، خیالات اور سماجی وتہذیبی عناصر شامل ہیں۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ اردو زبان اسلامی معاشرت وثقافت کی آئینہ دار ہے۔ قرآن وحدیث کی تشریح وتعبیر کے ساتھ ساتھ بزرگان دین اور حضور پاکؐ کی ذات وصفات کا اظہار اردو زبان میں قدیم زمانے سے ہوتا آرہا ہے۔ مذہبی نقطہ نظر سے اردو زبان موضوع اور مواد کے اعتبار سے ہر زمانہ میں مالا مال ہے۔ اس کی سب سے عمدہ مثال سیرت نبوی ہے۔ جس کے ابتدائی نقوش تصوف اور تذکروں کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔

اردو میں سوانح نگاری کا آغاز سیرت نبوی کے زیر اثر ہوا۔ سرسید تحریک کی وجہ سے بامقصد اور اصلاحی ادب کا چلن عام ہوا، اور ضرورت محسوس کی گئی کہ عظیم شخصیات اور اسلاف کے حیات وکارنامے کو پیش کیا جائے، تاکہ قوم وملت میں اپنے بزرگوں کی تقلید اوران کے بتائے ہوئے راستوں پر چلنے کی خواہش پیدا ہو۔ سرسید تحریک کے ارکان شبلی نعمانی، الطاف حسین حالی نے اردو میں سوانح نگاری کی طرف توجہ کی، اور اسے بڑی ترقی دی۔ حالی کی لکھی ہوئی سوانح عمریاں مثلاً حیات سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید کو اچھی سوانح عمریوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ سوانح نگاری کو نئی سمت وجہت عطا کرنے والوں میں علامہ شبلی نعمانی کا شمار صف اول میں کیا جاتا ہے۔ شبلی کا سب سے بڑا سوانحی کارنامہ 'سیرۃ النبی' اور اس کے بعد خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق کی سوانح 'الفاروق' ہے۔ یہ سوانح قدیم وجدید سوانح نگاری کے اصول وضوابط کا حسین امتزاج ونمونہ پیش کرتی ہے۔ اس میں شبلی نعمانی کے فنی، ادبی اور سوانحی شعور کا اظہار بڑے کمال وتمام سے ہوا ہے۔ اس کے علاوہ شبلی نے اور بہت سی کامیاب سوانح عمریاں لکھی ہیں۔ مثلاً المامون، الغزالی وغیرہ لکھ کر ناموران اسلام سے اردو ادب اور قوم کو روشناس کیا۔ وہ صاحب طرز انشا پرداز اور شگفتہ زبان لکھنے پر قادر تھے۔ شبلی کے بعد ان کے شاگردوں، اور دارالمصنفین اعظم گڑھ نے بھی اس صنف کو ترقی دی۔ اس کے بعد

اس صنف نے ترقی وکامیابی کے کئی منازل طے کیے۔

شبلی کے حاشیہ نشینوں اور معنوی شاگردوں میں مولانا عبدالماجد دریابادی کا بڑا اہم درجہ ہے۔انھوں نے انشاپردازی اور تنقید میں شبلی کے اسلوب کو اپنایا۔تمام اصناف نثر کی طرح صنف سوانح نگاری کو بھی مولانا نے اپنی صلاحیت اور ہنر مندیوں سے خاص مقام عطا کیا ہے۔چونکہ مولانا کو مشرقی ومغربی علوم پر یکساں قدرت ومہارت حاصل تھی ،اسی وجہ سے انھوں نے فن سوانح کو نئی جہتوں سے آشنا کیا۔مولانا ماجد کی سوانح نگاری میں لطافت ،حسن بیان اور مہارت کا اندازہ ان کی سوانحی کتابوں سے لگایا جا سکتا ہے۔اپنی باقاعدہ تصانیف سے قبل مولانا نے کچھ مضامین اور خاکے بھی لکھے تھے۔لیکن مولانا کی بطور سوانح نگار شہرت وشناخت اس وقت ظاہر ہوئی ،جب ان کی لکھی ہوئی سوانح عمریاں کتابی شکل میں شائع ہوئیں۔ان سوانحی تصانیف میں مولانا کے اسلوب تحریر کی انفرادیت اور حالات وواقعات کو پیش کرنے کا خاص ڈھنگ پورے آب وتاب سے نظر آتا ہے۔مولانا ماجد کی حسب ذیل سوانحی کتابیں اردو کے ادب العالیہ میں شمار کی جاتی ہیں۔

(۱) حکیم الامت نقوش وتاثرات

(۲) محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق

(۳) آپ بیتی

(۴) سیرت نبوی قرآنی

(۵) ذکر رسول یا مردوں کی مسیحائی

(۶) معاصرین

(۷) وفیات ماجدی یا نثری مرثیے

(۸) اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں

حکیم الامت نقوش وتاثرات

سوانحی ادب میں مولانا کا یہ عظیم شاہکار بڑی اہمیت رکھتا ہے۔اس کتاب کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔'نقوش وتاثرات' مولانا اشرف علی تھانوی کے حیات وخدمات کا ایک ایسا مرقع ہے جس میں مولانا تھانویؒ کی زندگی کے اہم واقعات اور ان کے علمی وادبی کارناموں کو بڑے سلیس اور دلچسپ انداز میں

بیان کیا گیا ہے۔مولانا اشرف علی تھانوی کا شمار بیسویں صدی کے اہم عالموں، دانشوروں اور مصلحین میں کیا جاتا ہے۔علم وفضل کے ساتھ ساتھ عبادت اور تعلیم واصلاح کے میدان میں بھی مولانا تھانوی یکتائے روزگار تھے۔ وہ متنوع وکثیر الجہت شخصیت کے مالک تھے۔ بیک وقت عالم دین، مفسر قرآن حکیم دانشور، فقیہ ومتکلم، محدث، واعظ، عارف اور شیخ وطریقت تھے۔ایسی ہمہ گیر وہمہ جہت شخصیت کے تمام پہلوؤں سے انصاف کرنا بڑی فن کاری اور مہارت کی بات تھی۔مولانا دریابادی نے یہ کتاب لکھ کر اپنی ادبی عظمت وقدرت کا بہترین ثبوت پیش کیا ہے۔اگر کسی موضوع پر لکھنے والے کو اس سے ذہنی، قلبی وابستگی اور دلچسپی ہوتو اس کی تحریر میں بھی خلوص، دلکشی، روانی اور عرفان حقیقی کی جھلکیاں نظر آنے لگتی ہیں۔مولانا ماجد مولانا اشرف علی تھانوی کو اپنا پیرومرشد معلم اور مصلح مانتے تھے۔وہ بہت دنوں تک ان کی صحبت سے مستفید ہوئے اورانھوں نے ان کی زندگی کے ہر پہلو کا بغور مطالعہ کیا ان کی یہ تصنیف اپنے مرشد اشرف علی تھانوی کے انسانی عادات واطوار، رہن سہن، گھریلو اور نجی معاملات وغیرہ سے قاری کو بڑے دلچسپ انداز میں متعارف کراتی ہے۔مولانا اشرف علیؒ کے تصوف اور خانقاہی پابندیوں کی اتنی شہرت ہوگئی تھی کہ ان کی انسانی خوبیوں اور اوصاف کو لوگوں نے بھلا دیا تھا۔عام طور پر لوگ ان کو صاحب کرامت، ولی اللہ اور ایک جلالی بزرگ سمجھتے تھے۔لیکن من حیث الانسان ان کی زندگی کے عام حالات اور کردار کی عظمت سے لوگوں کی واقفیت بہت کم تھی۔مولانا ماجد نے 'نقوش وتاثرات' کے ذریعہ مولانا تھانوی کے تمام سوانحی پہلوؤں کو صفائی اور سلسلہ سے بیان کیا اور اسی کے ساتھ ساتھ قرآن وحدیث اور روحانیت کے اہم نکات کو قارئین کے سامنے اپنے قابل رشک انداز نگارش میں پیش کیا ہے۔اس کتاب کے بارے میں مولانا کتاب کے دیباچے میں خود فرماتے ہیں۔

> ''حکیم الامت امام اشرف علی تھانوی بزرگ کس مرتبہ اور ولی اللہ کس پایہ کے تھے۔اس کا حال تو وہی بتا سکتا ہے، جو خود بھی بزرگ، عارف اور ولی اللہ ہو۔اپنے کو تو اس کوچہ کی ہوا بھی نہیں لگی۔اس لیے اگر کسی صاحب نے کتاب کو اس ارادہ سے کھولا ہے کہ اس میں حضرت کے مرتبہ معرفت وولایت کی تفصیل درج ہوگی، یا ان صفحات میں حضرت کے مناقب عرفانی ومدارج روحانی کا بیان

ہوگا، تو خیر اس میں ہے کہ آگے وہ ورق گردانی کی زحمت ہی گوارا نہ فرمائیں اور کتاب کو بے پڑھے بند کی بند رہنے دیں۔ حضرت کے مریدین و مرشدین میں بڑے بڑے پایہ کے لوگ گذر چکے ہیں، اور ماشاءاللہ اب بھی سلامت باکرامت ہیں، بعض ان میں سے حضرت کی سوانح نگاری کا حق ادا کر چکے ہیں، اور بعض حضرت کی تعلیمات کی بہترین شرح و ترجمانی کر رہے ہیں۔ یہ مجموعہ اوراق نہ کتاب المناقب ہے، نہ ملفوظات مرشد، اور نہ سیرۃ الشیخ اس کا موضوع ان سب سے الگ ہی نہیں، سب سے پست بھی ہے۔''[۱]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا ماجد دریابادیؒ اپنے ۱۶/۱۵ سالہ تعلقات، تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں 'حکیم الامت نقوش وتاثرات' کو قلم بند کیا ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے مزید وضاحت اس طرح فرمائی ہے۔

''حضرت شیخ' کے کمالات وفضائل جو کچھ بھی ہوں، بہر حال اشرف علی تھانوی نامی ایک انسان بھی تو اسی صدی میں ہوئے ہیں۔ ان کی عمر کے آخری کے ۱۶/۱۵ سال کے زمانہ میں اس نامہ سیاہ کو ان سے نیاز اور گہرا نیاز حاصل رہا۔ اور اس نے اپنے لمبے تجربہ اور سابقہ میں انھیں ایک بہترین انسان پایا۔ بس ان کی اسی انسانی زندگی کا ہلکا عکس ان 'نقوش وتاثرات' کے اندر بند کر دینے کی کوشش الٹی سیدھی آپ کو یہاں ملے گی۔ اور چونکہ ان کی انسانیت ان کی مفسر وفقیہ و درویش ہونے سے الگ کی بھی نہیں جاسکتی، اس لیے ضمناً ذکر ان کے علم وفضل، تفقہ وسلوک کا لانا بھی ناگزیر ہوگیا۔

بنتی نہیں ہے بادہ وساغر کہے بغیر

ورنہ حقیقتاً مصوری صرف ان کی انسانیت کی کرنی تھی، وہ بھی اپنے ذاتی تجربات ومشاہدات کے حدود کے اندر۔ ان گذارشوں کے بعد اگر کوئی خوش عقیدہ بزرگ مطالعہ کتاب پر اصرار ہی جاری رکھیں اور آگے چل کر کہیں

---

[۱] دیباچہ حکیم الامت نقوش وتاثرات: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۱۵

اپنے جذبات عقیدت کو مجروح ہوتا ہوا پائیں، یا لاابالی مصنف کے انداز بیان میں انھیں کہیں سوء ادب کی جھلک نظر آئے تو اس کی ذمہ داری خود ان ہی بزرگوں پر رہے گی۔ ان اوراق کی ترتیب وتسوید سے فراغت، حضرت کی وفات کے دو سال بعد ۱۹۴۵ء میں ہوگئی تھی۔ مدتیں مسودہ کی صفائی میں گذر گئیں۔ اب وسط ۵۰ء میں نوبت نظر ثانی کے بعد اس دیباچہ نگاری کی آرہی ہے۔ طبع واشاعت کی منزلیں اب بھی بہت دور ہیں والامر بیداللہ۔''[۱]

دور الحاد سے اسلام کی طرف مراجعت کرنے کے بعد مولانا ماجد کو تصوف وسلوک اور روحانیت سے بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ عرصہ دراز تک مولانا ماجد پیر و مرشد کی تلاش میں سرگرداں رہے، اور اسی سلسلے میں انھوں نے صفی پور ضلع اناؤ کا سفر کیا۔ رفیق سفر وصل بلگرامی صاحب تھے۔ دوران سفر جب مرشد کے حوالے سے گفتگو ہوئی تو بلگرامی صاحب نے مولانا ماجد سے کہا کہ ایک بار ہمارے مرشد اشرف علی تھانوی صاحب کا بھی تجربہ کر لیجیے، اور انھوں نے تھانوی صاحب کی تصنیف کردہ کتاب 'قصد السبیل' مولانا ماجد کو مطالعہ کے لیے دیا، اس کتاب کے مطالعہ سے مولانا کو تصوف کے متعلق رموز واسرار سے آگاہی حاصل ہوئی اور صاحب کتاب کی عظمت و بزرگی ان کے دل میں پیدا ہوگئی۔ جس کا ذکر انھوں نے 'نقوش وتاثرات' میں کیا ہے۔ مولانا ماجد 'قصد السبیل' کے متعلق لکھتے ہیں۔

''اپنا جہل اپنے سامنے آئینہ! معلوم ہوا کہ اب تک، جو کچھ اس سلسلہ میں پڑھا تھا، سنا تھا، جانا تھا، وہ بس جھک ماری تھی، تصوف کی حقیقت، طریق کی تعریف، آج پہلی بار دل ودماغ کے سامنے آئی، قصد السبیل پڑھتا جاتا تھا، اور سطر سطر پر، پردے نگاہوں سے ہٹتے جاتے تھے۔ رہ رہ کر طبیعت اپنے ہی اوپر جھجھلاتی تھی کہ اب تک کیوں نہ پڑھا تھا۔ ۱۶ برس کی مدت کوئی تھوڑی ہوتی ہے، آج تک اپنے اس جہل کے انکشاف کی یاد تازہ ہے۔''[۲]

مولانا ماجد نے تھانوی صاحب سے بیعت ہونے کی غرض سے تھانہ بھون کا سفر شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی اور مولوی عبدالباری ندوی کے ہمراہ کیا تھا۔ تھانہ بھون میں اپنے تجربات ومشاہدات اور

۱۔ دیباچہ حکیم الامت نقوش وتاثرات: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۱۵-۱۶

۲۔ حکیم الامت نقوش وتاثرات: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۴

حضرت تھانوی سے اپنی ملاقات کے تاثرات اور شخصی احوال وکوائف، اخلاق، کردار وگفتار کی منظر کشی انھوں نے اتنے شگفتہ انداز میں کیا ہے کہ قاری کی نظروں کے سامنے پورا منظر آجاتا ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

''نماز ختم ہوئی، سلام پھیرا، دعا مانگ کر جوں ہی حضرت اٹھے ہیں نگاہ پہلی صف میں مولانا حسین احمد صاحب پر پڑ گئی، ان کی طرف خود ہی بڑے تپاک سے بڑھے، اور بڑے التفات سے ملے۔ لوگ تو کہتے تھے، بڑے خشک مزاج ہیں، خشک مزاج ایسے ہوتے ہیں؟ یہ نرم بشاش چہرہ، یہ ہنستا مسکراتا ہوا بشرہ کسی خشک مزاج کا ہوسکتا ہے؟ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ اِن کے اور اُن کے بے لطفی ہے، ناچاقی ہے، کانوں نے بے شک یہی سنا تھا، لیکن اس وقت آنکھیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ دو دشمن نہیں، دو دوست گلے مل رہے ہیں۔ تعظیم وتکریم مولانا حسین احمد صاحب کی طرف سے تو خیر ہوتی ہی، عادت طبعی ہونے کی بنا پر بھی اور سن میں چھوٹے ہونے کی بنا پر بھی، لیکن مشاہدہ یہ ہورہا تھا کہ ادھر سے بھی آداب ورواسم تکریم میں کوئی کمی نہ تھی۔ لاحول ولاقوۃ لوگ بھی کیسی کیسی بے پر کی اڑایا کرتے ہیں، اور لوگ بھی کون؟ عوام کالانعام نہیں، اچھے اچھے پڑھے لکھے، خاصے ثقہ راوی، خود ان ہی دونوں حضرات کے خدام ومریدین! بعض راوی زبان قال سے، اور بعضے راوی زبان حال سے، الحمد للہ کہ دونوں رواتیں غلط نکلیں، مولانا نے تعارف ہم دونوں کا کرایا، ہم دونوں سے بھی شگفتہ اخلاق والتفات اتفاق سے چند ہفتے قبل ٹائیفائڈ (معیادی بخار) میں مبتلا ہوا تھا۔ حضرت نے کمال شفقت سے اس کا حوالہ دے کر خیریت دریافت فرمائی، میں دنگ کہ اس کی انھیں کیوں کر خبر، علالت کی اطلاعیں تو بس ہمدرد دہلی، ہمدم (لکھنو) یا خود میرے سچ میں نکلتی رہی تھیں، ان اخباروں کا، یا ایسے اخباری لوگوں کا یہاں کہاں گذر۔ لیجیے نہ۔ لوگوں کی چلائی ہوئی اور پھیلائی ہوئی روایت اس باب میں بھی غلط یا کم از کم بہت مبالغہ آمیز نکلی۔ مجھے تو ہرگز یہ توقع

نہ تھی کہ میرا نام بھی، کبھی حضرت کے کان میں پڑا ہوگا، رہی دو ایک بار کی خط وکتابت تو ایسے خط تو خدا معلوم کتنے روز ہی آتے رہتے ہوں گے۔ کس کس کے نام ذہن میں رہ سکتے ہیں۔ لیکن نہیں نا واقفیت کیسی، یہاں تو میری تازہ علالت تک سے واقفیت و باخبری نکلی!''[۱]

مولانا ماجد اور اشرف علی تھانوی میں پیری مریدی کے رشتہ سے قطع نظر نجی اور ذاتی تعلقات اتنے بڑھ گئے تھے کہ وہ اپنے تمام مسائل، گھریلو معاملات، الجھنیں اور مشکلات ان کے سامنے زبانی یا تحریری شکل میں پیش کرتے تھے اور اشرف علی تھانوی کے حکیمانہ جوابات وعلاج سے پورے طور پر مطمئن ہو جاتے تھے۔ اس کے علاوہ مولانا ماجد فقہی وشرعی امور پر بھی مولانا تھانوی سے خط لکھ کر حل دریافت کیا کرتے تھے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ دونوں مفسرین، مفکرین کے مابین اس قدر پر خلوص اور دلی وابستگی کے باجود مولانا ماجد نے رسمی وروایتی طور پر دونوں میں پیر و مرید کا رشتہ نہ تھا۔ مولانا ماجد نے شیخ الحدیث حسین احمد مدنی کے دست مبارک پر بیعت کی تھی۔

مولانا ماجد نے تھانہ بھون کی اپنی پہلی حاضری اور حضرت تھانوی صاحب سے شرف ملاقات اور تفصیلی گفتگو اور وہاں کے روح پرور ماحول حضرت کی شخصیت، خانقاہ کے مناظر، وہاں کے نظم ونسق کو بڑے دلکش اور پر تاثیر انداز میں پیش کیا ہے۔ اپنے زور قلم سے اس خانقاہ اور مرشد کی ذات وصفات، کمالات، فضائل، درس وتدریس کو بڑے اچھے اور محاکاتی انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

''سوا نو، ساڑھے نو پر خانقاہ پہنچ جاتا، گھر سے دو قدم پر تو تھی ہی، حضرت سہ دری میں تشریف فرما ہوتے، ہاتھ میں تسبیح کبھی ہوتی، کبھی نہ ہوتی، بائیں طرف دیوار میں، دھوپ گھڑی کے حساب سے وقت بتانے والی بڑی گھڑی لگی ہوئی، اس کے نیچے بیٹھنے کا ایما فرمایا جاتا، ایک جیبی گھڑی کھلے ہوئے کیس میں حضرت کے سامنے ڈسک پر رکھی رہتی، دو چار لوگ اور آجاتے، عموماً اہل تخصیص ہی ہوتے، بڑا مجمع کبھی نہ ہوتا، نشست کوئی ڈیڑھ، گھنٹہ رہتی، باتیں ہر قسم کی ہوتی رہتیں، گفتگو کا بیشتر حصہ مولانا خود فرماتے، لیکن

---

[۱] حکیم الامت نقوش وتاثرات: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۱۶۔۱۷

ہم لوگوں کو بھی بے تکلف بولنے چالنے پوچھنے جاچنے، سوال و جواب کرنے کی اجازت تھی، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کسی مسائل کے سوال پر، یا خود ہی، مولانا کسی فقہی، کلامی، تفسیری، سلوکی مسئلہ پر کوئی مستقل و مسلسل تقریر ذرا لمبی فرمادیتے، جسے حاضرین بڑے انشراح قلب کے ساتھ سنتے، لیکن ایسا بہت کم ہوتا، عموماً اور بیشتر یہ تھا کہ معمولی طرز پر دوستوں کے درمیان جیسے گفتگو ہوا کرتی ہے، یہی رہتی ہے اور بغیر اس کے سننے والوں کے دماغ پر کسی قسم کا بار پڑے اور بغیر اس کے کہ وہ اسے محسوس بھی کرنے پائیں کہ انھیں کوئی خاص تعلیم دی جارہی ہے، خدا جانے کتنے مسائل کتنی کام کی باتیں، باتوں باتوں میں، ان کے کان میں پڑ جاتیں۔ مقرر اور بزرگ صحابیوں کو بھی، تعلیم کیا اصطلاحی قسم کی، کتابوں اور مقالوں کے ذریعہ ملا کرتی؟ ثقہ راویوں سے بعد کو سننے میں آیا کہ اس مجلس چاشت کا دستور اس سے قبل نہ تھا، اور اس بدعت حسنہ کی بنیاد، اسی تباہ کار کی حاضری کے وقت سے پڑی، یہ اگر صحیح ہے تو حضرت نے حد کردی، ذرہ نوازی اور ایک خاکسار کی سرفرازی کی۔''[۱]

مولانا ماجد 'نقوش وتاثرات' کو رسمی یا روایتی قسم کی سوانح عمری تصور نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ان کا خیال تھا کہ اس کتاب میں انھوں نے مولانا تھانوی کی شخصیت سے متعلق اپنے تجربات، مشاہدات اور اہم واقعات کو دیانت داری سے من وعن پیش کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ حضرت تھانوی کی شخصیت وصفات اور اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں۔

''اپنی اس ۵۶/سال کی زندگی میں اللہ والے متعدد دیکھ ڈالے اور اللہ والیوں میں خود اپنی والدہ اور ہمشیرہ کو دیکھا۔ بڑے بڑے عابد، زاہد، متقی، تہجد گزار نظر سے گزرے، یہاں تک کی سرسری زیارت مکہ مکرمہ میں وقت کے مجاہد اعظم شیخ سنوسی ثانی کی بھی نصیب رہی۔ لیکن اصلاح وارشاد کی مسند نشینی کا حق دار ۱۵/۱۶ سال کے تجربہ میں، جیسا حضرت تھانویؒ کو پایا، کسی اور کو نہ

---

[۱] حکیم الامت نقوش وتاثرات: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص:۸۴-۸۵

پایا!....حضرت کی سوانح نگاری کا حق اور لوگ ادا کریں گے، حضرت کی مجددانہ ومصلحانہ حکیمانہ تعلیم وتربیت پر بھی وہ لوگ لکھیں گے جو اس کے اہل ہیں۔ان صفحات میں تو اس نامہ سیاہ نے صرف وہی لکھا ہے، جو کچھ اپنے تجربہ میں براہ راست آیا، یا دو چار ایسے واقعے جو شنیدہ مثل دید کے تھے۔اس ظلوم جہول کے حق میں تو حضرت ایک معظم ترین بزرگ ہی نہیں، شفیق ترین مخلص، دانا ترین مشیر، محبوب ترین، عزیز سب کچھ تھے۔''[۱]

'نقوش وتاثرات' کے متعلق مولانا ماجد کے بھتیجے اور داماد عبدالعلیم قدوائی صاحب لکھتے ہیں۔

''مولانا تھانوی کے بہترین معالج نفس ہونے اور فطرت بشری کے باریک پہلوؤں کی رعایت رکھنے، فقہی وتفسیری اور حیرت انگیز حقیقت پسندی اور نفسیاتی دقیقہ رسی کی بنیاد پر مولانا نے ان کو حکیم الامت قرار دیا اور ان کے حکیم ومصلح ہونے کا بار بار ذکر اپنی تحریروں اور زبانی گفتگوؤں میں کیا۔باوجود اس کے یہ کتاب باضابطہ سوانح کے اصولوں پر پوری نہیں اترتی لیکن اپنے بے مثال اور منفرد اسلوب، شگفتگی اور دلآویزی کی بنا پر اردو ادب کی موثر اور اعلی کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔''[۲]

'نقوش وتاثرات' میں مولانا ماجد نے حکیم الامت اشرف علی تھانوی کی سیرت وسوانح مروجہ اصول وضوابط سے ہٹ کر ایک نئے انداز میں لکھی ہے۔تفصیل اور غیر ضروری باتوں کے بیان سے مولانا ماجد نے پرہیز کیا ہے۔اس کتاب کا بیشتر حصہ ان کے باہمی خط وکتابت پر مشتمل ہے۔مولانا ماجد نے اپنے ذاتی ملاقات تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں اس کتاب کو مرتب کیا ہے۔اس کی پہلی اشاعت ۱۹۵۶ء میں دارالمصنفین اعظم گڑھ سے ہوئی۔دوسری مرتبہ ۱۹۶۷ء میں لاہور سے شائع ہوئی، اور تیسری مرتبہ سعدی بکڈ پو الہ آباد سے سعادت علی قاسمی نے شائع کرائی، اور یہی تیسرا ایڈیشن میرے پیش نظر ہے۔

محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق

مولانا کی سوانحی تصنیفات میں یہ کتاب سب سے دلچسپ اور منفرد، اور معلومات سے بھرپور ہے۔

۱۔ حکیم الامت نقوش وتاثرات: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص:۶۲۔۶۳

۲۔ مولانا عبدالماجد دریابادی حیات وخدمات: عبدالعلیم قدوائی: ص:۱۱۵۔۱۱۶

محمد علی جوہر مولانا کے محبوب اور رفیق خاص تھے اس لیے یہ کتاب محمد علی کے کردار اور کارناموں کو سمجھنے کے لیے بہت اہم ہے۔ 'محمد علی ذاتی ڈائری' کو مولانا نے سن کے ترتیب کے اعتبار سے مختلف ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب کی ابتدا پہلی بالمشافہ ملاقات ۱۹۱۲ء سے ہوتی ہے، اور آخری باب ۱۹۳۱ء تک کے حالات پر محیط ہے۔ مولانا نے سنہ وار ترتیب کے ساتھ ہر باب کا ایک ذیلی عنوان بھی رکھا ہے، اور یہ عنوانات زیادہ تر اشعار سے ماخوذ ہیں۔ چند عنوانات اس طرح ہیں۔ چوں یہ توافتدم نظر، مستحق دار کو حکم نظر بندی ملا، تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں، الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا، یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے، ایک مرگ ناگہانی اور ہے، وغیرہ ابواب کی کل تعداد ۸۸ ہے۔ اس کے علاوہ اس میں ۱۴ ضمیمے بھی شامل ہیں۔ ان میں مولانا محمد علی جوہر کی وفات کے بعد ان کے متعلق شائع ہونے والے 'صدق' اور 'سچ' کے مضامین کو شامل کیا گیا ہے۔ 'ذاتی ڈائری' کی ادبی وسوانحی اہمیت اور اس کی متعدد اشاعت کے متعلق نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی اپنی شائع کردہ کتاب میں 'پیش گفتار' کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

''یہ 'ڈائری' ماجدی اسلوب کا شاہکار ہے۔ یاد آفرینی، سلاست بیانی اور شگفتہ نگاری کے سبب یہ کتاب اردو کے سوانحی ادب میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ مولانا جوہر کی وفات (جنوری ۱۹۳۱ء) کے بعد ہی مولانا دریابادی نے اپنے ہفتہ وار اخبار سچ لکھنو میں یہ 'ڈائری' لکھنا شروع کی تھی جو ۷ اقسطوں کی شکل میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد اسی کو بنیاد بنا کر مولانا دریابادی نے ازسرنو کتاب لکھنا شروع کی اور ۸۸ ابواب اور متعدد ضمیموں کے ساتھ دو جلدوں میں مکمل کی۔ جس کی پہلی جلد ۵۴ء میں اور دوسری جلد ۱۹۵۶ء میں دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوئی۔ عرصہ دراز سے یہ 'ڈائری' نایاب تھی ابھی کچھ مدت قبل مولانا دریابادی کے ایک معتقد جناب محمد راشد صاحب (کراچی۔ پاکستان) نے دونوں جلدوں کو یکجا کر کے شائع کیا تھا۔ زیرنظر اڈیشن اسی پاکستانی نسخہ کا عکس ہے۔ جس کی اشاعت میں مولانا دریابادی ہی کے ایک نادیدہ مخلص جناب الحاج سعید حسن دامودی بھٹکلی کی خصوصی دلچسپی اور

تعاون شامل ہے اس سے قبل بھی وہ مولانا دریابادی کی کئی کتابوں کی اشاعت
میں خصوصی تعاون کر چکے ہیں۔ اللہ تعالی ان کی خدمت قبول فرمائے اور ان کو
اس کا بہترین بدلہ عطا فرمائے آمین۔''[۱]

مولانا کا سوانحی وادبی شاہکار 'محمد علی ذاتی ڈائری' ہے۔ اس کتاب میں مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت، حیات اور کارناموں کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر (۱۸۷۸ء، ۱۹۳۱ء) جنگ آزادی کے جاں باز سپاہی تھے۔ ملک وقوم کی ترقی کے لیے ان کی قربانیوں سے قومی تاریخ کے صفحات روشن ہیں۔ ۳۰ رسالوں تک علی برادران (مولانا جوہر اور مولانا شوکت علی) قومی جدوجہد اور حصول آزادی کے لیے سرگرم رہے۔ خطابت، صحافت کا استعمال انھوں نے ایک موثر حربے کے طور پر ملک کی آزادی کے لیے کیا۔ اپنے شعلہ بیان خطابت اور صداقت پسند صحافت کی وجہ سے مولانا کو کئی سالوں تک قید فرنگ کی صعوبتوں کو برداشت کرنا پڑا۔ خلافت تحریک، ستیہ گرہ، عدم موالات، جمیعتہ العلماء، جامعہ ملیہ جیسی اہم تحریکات کے سرخیل اور روح رواں تھے۔ قومی وملی قیادت کا تصور علی برادران کے بغیر ممکن نہ تھا۔ محمد علی کی شہرت ومقبولیت کا سورج نصف النہار پر تھا۔ اس عظیم شخصیت سے مولانا ماجد کو دلی وابستگی، ذہنی وفکری ہم آہنگی تھی، مولانا ماجد اور محمد علی جوہر کے مابین تقریباً ۱۸ سالوں تک قلبی تعلق اور ایک خاص رشتہ قائم رہا۔ یہ سوانحی تصنیف انھیں ایام کی یادداشتوں، اور باہمی مکتوبات، مشاہدات، تجربات کی بنیاد پر لکھی گئی ہے۔ مولانا ماجد نے جن عظیم شخصیات سے اثرات قبول کئے تھے ان میں علامہ شبلی نعمانی، اکبرالہ آبادی، اشرف علی تھانوی کے ساتھ مولانا محمد علی جوہر کی ذات والا صفات بھی تھی۔ محمد علی جوہر سے اپنے تعلقات اور اپنی ذات پر ان کی شخصیت کے اثرات کے بارے میں خودنوشت میں مولانا ماجد لکھتے ہیں۔

''یہ میرے گویا محبوب تھے ان کا نام بچپن سے سننے میں آرہا تھا، اور
ان کی انگریزی مضمون نگاری اور انشا پردازی کی دھاک شروع سے دل میں
بیٹھی ہوئی تھی۔ عمر میں مجھ سے ۱۴ سال بڑے تھے، شخصی تعارف اخیر ۱۹۱۲ء میں
ہوا، محبت وعقیدت دور ہی دور سے بڑھتی رہی۔ ستمبر ۲۱ء میں جب یہ دوبارہ

---

[۱] محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۱۴

اسیر فرنگ ہوئے اور کراچی میں سزا یاب، تو زبان و دماغ پر ان کی اخلاقی و روحانی عظمت کا کلمہ رواں تھا۔ اور ان کی ذات سے شیفتگی درجہ عشق تک پہنچ چکی تھی، ۲۳ء کے آخر سے ختم ۳۰ء تک قرب و اتصال کے مواقع کثرت سے حاصل رہے اور عشق میں ترقی بھی ہوتی رہی، ان کی نہ کوئی بات دل کو بری لگتی نہ ان پر کسی حیثیت سے بھی تنقید کرنے کو جی چاہتا، یہی جی میں رہتا تھا کہ ان کے قلم اور ان کی انگلیوں کو چوم چوم لوں۔ اسلام اور رسول اسلام سے اس درجہ شیفتگی، اللہ کے وعدوں پر اس شدت سے اعتماد، یہ اخلاص، یہ للّٰہیت، تصنع و منافقت سے اس درجہ گریز، حق کے معاملے میں عزیزوں، قریبوں، بزرگوں تک سے بے مروتی اور پھر ایسی فہم و ذکا، علم و آگہی، غرض میرے لیے تو ایک بے مثال شخصیت تھی۔''[۱]

مولانا ماجد اور محمد علی جوہر کی پہلی ملاقات ۱۹۱۲ء میں راجہ محمود آباد کی کوٹھی میں ہوئی، اور اس کے بعد دونوں میں خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا جو محمد علی جوہر کے انتقال تک قائم رہا۔ مولانا ماجد نے محمد علی جوہر کی صحبت اور سر پرستی میں متعدد علمی، ادبی اور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ مولانا ماجد سے بہتر ان کی شخصیت اور کارناموں کو سمجھنے اور پیش کرنے والا کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا، کیوں کہ انھوں نے مولانا جوہر کی صحبت میں رہ کر ان کی شخصیت کے اہم پہلوؤں کا عمیق نظروں سے مشاہدہ کیا تھا۔ 'ذاتی ڈائری' میں محمد علی کی شخصیت کے اہم پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ سوانح کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ صاحب سوانح کی زندگی کے اصل خد و خال سامنے آجائیں، اور مولانا ماجد کی یہ کتاب اس مقصد کو پورا کرتی ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں، کہ مولانا ماجد نے اپنی جدت طبع اور صلاحیت سے اردو زبان و ادب کو ایک نئی قسم کی سوانح عمری کا تحفہ پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں مروجہ سوانح نگاری کے اصول و آداب سے کسی قدر انحراف کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ مروجہ سوانح عمریوں میں حسب نسب، خاندان، ابتدائی تعلیم و تربیت، حالات و واقعات کو خاص طور پر پیش کرنے کا رواج رہا ہے، اور اس کتاب میں ان باتوں کا پورے طور پر پاس و لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ اس لیے اس کو باضابطہ سوانح عمری کے زمرے میں شمار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ مولانا ماجد بھی اس

---

[۱] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۳۵۷۔۳۵۸

کتاب کو سوانح عمری قرار نہیں دیتے ہیں وہ لکھتے ہیں۔

''رئیس الاحرار مولانا محمد علی ماضی قریب میں (یہ 'قریب' 'بعید' اضافی ہی مفہوم رکھتے ہیں) مسلمانان ہند کے سب سے بڑے سردار تھے۔ مجھے ان سے شرف نیاز وسط ۱۹۱۲ء سے ان کی آخری عمر یعنی ختم ۱۹۳۰ء تک، کہنا چاہیے کہ ۱۷/۱۸ سال کی مدت تک حاصل رہا۔ آئندہ صفحات میں میں نے اپنے اتنے دن کے تاثرات و مشاہدات کو یکجا اور قلم بند کر دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کی مستقل سیرت یا سوانح عمری ایک بالکل الگ چیز ہے۔ کوئی صاحب اس 'ذاتی ڈائری' کو اس کا بدل یا قائم مقام نہ خیال فرمالیں۔''[1]

مولانا ماجد نے راجہ محمود آباد کی کوٹھی میں مولانا محمد علی جوہر سے اپنی ملاقات کا منظر اور ان کی سیرت، خصائل، عادت و اطوار اور اخلاق و گفتار کی منظر کشی و ترجمانی جس انداز میں کی ہے، اس انداز نگارش کی توقع مولانا ماجد ہی کے قلم سے کی جاسکتی ہے۔ اس اقتباس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سوانحی قسم کی تحریر نہیں بلکہ انشاء و خاکہ کی آمیزش سے ایک جہان دیگر تخلیق کیا گیا ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

''کمیٹی کے سامنے وقت کے بڑے بڑے اہم اور نازک مسئلے چھڑے ہوئے۔ اور ملت کے دل و دماغ کا عطر جیسے کھنچ کر آ گیا ہے۔ سر راجہ صاحب (نام، جس سے کم ہی لوگ واقف و مانوس تھے، علی محمد خان) وسیع ڈرائنگ روم کے صدر میں تشریف فرما۔ سامنے ایک بڑی لمبی میز، دورویہ کرسیوں کی قطار۔ میز کے ایک سمت میں ایک جوان رعنا، تندرست و تنومند کوئی ۳۳، ۳۴ سال کی عمر کا، اعلیٰ درجہ کے انگریزی سوٹ میں ملبوس بیٹھا ہوا۔ داڑھی تازی منڈھی ہوئی، مونچھیں ذرا گھنی اور نوکیلی۔ ذہانت بشرہ سے ٹپکتی ہوئی، شوخی و ذکاوت چہرہ سے برستی ہوئی۔ ممبروں میں ایک سے ایک قابل و فاضل۔ اس کے بڑے اور مخدوم بھی۔ لیکن نظریں بار بار اسی کی طرف اٹھ رہی ہیں، اور کان اسی کی آواز پر لگے ہوئے۔ وہ بولا تو سب سننے لگے۔ وہ اٹھا تو کوئی ہنسا اور کوئی بگڑا،

---

[1] دیباچہ محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۱۵

مگر متوجہ سب ہی ہوگئے ۔ یہ تھا کامریڈ کا شہرہ آفاق ایڈیٹر محمد علی، رامپور کا
باشندہ اور علی گڑھ اور آکسفورڈ کا گریجویٹ ۔جس کی جادونگاری اور انگریزی
انشاء پردازی کا سکہ اس وقت بھی دلوں پر بیٹھ چکا تھا، حالانکہ کامریڈ کو نکلے
ہوئے ، ابھی سال ڈیڑھ سال کا ہی عرصہ ہوا تھا۔ اور اردو روزنامہ ہمدرد کا
ابھی وجود بھی نہ تھا۔''[1]

'ذاتی ڈائری' کے مطالعہ سے گر ایک طرف مولانا محمد علی جوہر کی سیرت وسوانح اور ان کی صحافتی وسیاسی زندگی سے آگاہی حاصل ہوتی ہے تو دوسری جانب ان کے گھریلو اور نجی قسم کے واقعات وحالات، ان کی والدہ محترمہ بی اماں اور بیگم کی پرعزم شخصیت اور کوہ پیکر مشرقی خواتین کی سیرت وسوانح سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

''بیگم محمد علی رہیں ہمیشہ برقع میں اور پورے شرم ولحاظ کے ساتھ ۔
چہرہ نقاب سے چھپا ہوا۔لیکن رہتیں ہر جلسہ میں، ہر سفر میں، ہر مجمع میں، خلافت
کانفرنس میں، برابر ساتھ ساتھ اور جلسوں کی کارروائیوں میں بھی تھوڑا بہت
حصّہ لے لیا کرتیں ۔عورتوں کے مجمع میں تقریریں بھی کبھی کبھی کر دیتیں اور دو
ایک بار مردوں کے جلسوں میں بھی بول دیں۔تجدد کے رو میں بہی ہوئی 'روشن
خیال' بیویاں کاش بی اماں مرحومہ، مولانا کی والدہ ماجدہ اور ان امجدی بیگم
صاحبہ کی مثالوں سے سبق لیتیں کہ قومی کاموں کے لیے بے حیائی کیا معنی بے پر
دگی بھی ہرگز لازمی نہیں ۔آئین حجاب کی پابندیوں کے ساتھ بھی سارے قومی
کام بے تکلف انجام پاتے رہتے۔محمد علی کی مہمان داری بھی قابل دید تھی ۔
میں جب کبھی مہمان ہوتا، خاطر داریوں کو حد اسراف تک پہنچا دیتے، کھانے
ضرورت سے بھی زائد ہوتے میری حیثیت سے بھی زائد، اور ان کی جیب کی
گنجائش سے بھی زائد۔حق گوئی وحق نگاری میں تو محمد علی اپنی نظیر آپ تھے ہی،
مہمان نواز اور سیر چشم بھی اس درجہ کے کم دیکھنے میں آئے ہیں۔کھانا اکیلے کھانا

---

[1] محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۱۷۔۱۸

تو جانتے ہی نہ تھے، اور پھر کھانا بھی 'نان جویں' اور 'نمک طعام' نہیں، دسترخوان اچھا خاصہ چھوٹے موٹے رئیس کا معلوم ہوتا تھا۔ اچھے سے اچھے سالن، قورمہ، قلیہ، کباب کی متعدد پلیٹیں، طرح طرح کے لذیذ و پرتکلف نمکین اور میٹھے کھانے، کبھی مرغ کبھی مچھلی، خشک میوے، تازہ پھل، خود کھاتے اور دوسروں کو زبردستی کر کر کے کھلاتے۔''[۱]

مولانا محمد علی جوہر کی سوانح اور کارناموں کے متعلق کئی لوگوں نے لکھا ہے۔ لیکن 'ذاتی ڈائری' کئی اعتبار سے عام سوانح عمریوں سے منفرد و ممتاز ہے۔ محمد علی کی شہرت و مقبولیت ملکی اور عالمی سطح پر ایک قومی قائد اور بے باک صحافی کی حیثیت سے تھی۔ لیکن شاعر محمد علی جوہر سے لوگوں کو متعارف کرانے میں مولانا ماجد اور ان کی 'ذاتی ڈائری' کا بہت بڑا کردار ہے۔ محمد علی جوہر کی قید و بند اور نظر بندی کی زندگی سے متعلق واقعات وحالات اور حالت اسیری میں لکھی گئی، زندانی تخلیقات و نگارشات سے واقفیت کا ایک اہم ذریعہ 'محمد علی ذاتی ڈائری' ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کو جنگ آزادی میں شرکت کی وجہ سے چھنڈواڑہ، سی. پی میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ حالت نظر بندی میں مولانا ماجد اور مولانا محمد علی کے درمیان مکتوبات کا سلسلہ قائم رہا، انھیں مکتوبات کے ذریعے زندان فرنگ میں لکھی گئی ان کی شاعری سے ہماری واقفیت ہوتی ہے۔ چونکہ یہ ڈائری یادداشتوں اور خطوط کو بنیاد بنا کر تحریر کی گئی ہے، اس لیے اس ڈائری کی بڑی اہمیت ہے۔ جب مولانا جوہر قید و بند میں تھے تو مولانا ماجد صاحب نے ان کو خط لکھ کر اس بات کی خواہش ظاہر کی تھی کہ آپ تاریخ کے موضوع پر کوئی علمی کتاب تصنیف فرمائیں، تاکہ اس جبریہ تعطیل کا صحیح استعمال ہو سکے۔ اس کے جواب میں مولانا محمد علی جوہر نے جو کہا تھا وہ یقیناً سنہرے حروف میں لکھے جانے کے لائق ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کا یہ جوابی خط اور حالت اسیری میں لکھے ہوئے بعض اشعار یہاں نقل کیے جا رہے ہیں۔

''آپ نے مجھے رائے دی کہ میں ان جبریہ تعطیل کے زمانہ میں کوئی کتاب لکھنا شروع کر دوں اور مجھ سے اس کی توقع بھی کی جارہی ہے، اگر یہ صحیح ہے تو جن لوگوں نے مجھ سے اس کی توقع قائم کی ہے، وہ مجھ سے واقف نہیں ہیں۔ اولاً تو مجھ میں وہ صبر و تحمل اور استقلال ہی نہیں ہے جو ایک عالم محقق میں ہونا

---

۱ محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۳۴۶۔۳۴۷

چاہیے۔ دوسرے جو کچھ علم و عقل رکھتا بھی ہوں، اس پر میرے جذبات کہیں زیادہ غالب ہیں۔ رہی یہ جبریہ فرصت سو مجھے یہ فرصت ملنے ہی کیوں پاتی، اگر میرے جذبات اس قدر ضعیف ہوتے کہ جس وقت اغیار تاریخ سازی میں مصروف ہیں، میں تاریخ نویسی میں لگا رہتا۔ نہیں میرے عزیز دوست نہیں۔ میرا دماغ، میرا دل، دونوں اس وقت جس عالم میں ہیں، وہاں تصنیف و تالیف جیسی 'تفریحات' کی گنجائش کہاں؟ البتہ کبھی کبھی دل کے ایماء سے دماغ دو چار شعر موزوں کر لیتا ہے۔ اگر آپ کو اس کا ذوق ہو تو میں ایک آدھ غزل آپ کو بھیج سکتا ہوں۔ یہ وہ غزلیں ہیں جو ۱۵ مہینے کے زمانہ فرصت میں مہلت کے لمحے نکال نکال کر ضبط تحریر میں لا سکا ہوں۔ یہاں کے ایک حاکم صاحب نے وہی رائے دی جو آپ نے پیش فرمائی، یعنی تصنیف و تالیف۔ میں نے جواب دیا کہ اس وقت تو میرا موضوعِ تصنیف دو ہی چیزیں بن سکتی ہیں، ایک 'کربلا' دوسرے 'قبل ہجرت'۔ اپنے چند شعر اسی وقت پیش کیے دیتا ہوں۔ میری ترجمانی کسی قدر ان ہی سے ہو سکے گی۔

دور حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اس طرح سے جینے میں بھی مرنے کا مزہ ہے
قسمت میں یہی ہے کہ ابھی راہ قضا دیکھ
اللہ کے بانکوں کا بھی ہے رنگ نرالا
اس سادگی پہ شوخی خون شہدا دیکھ
ہے سنت ارباب وفا صبر وتوکل
چھوٹے نہ کہیں ہاتھ سے دامان خدا دیکھ
تو طیر ابابیل سے ہر گز نہیں کمزور
بیچارگی پر اپنی نہ جاشان خدا دیکھ

آساں نہ تھا تقرب شیریں تو کیا ہوا تیشہ کو کوئی رکھ نہ سکا کوہکن سے دور
تم تک جو دور جام پھر آئے تو کیا عجب یہ بھی نہیں ہے گردش چرخ کہن سے دور

خوف غماز ،عدالت کا خطر ،وار کا ڈار ہیں جہاں اتنے وہاں خوف خدا اور سہی
عہد اول کو بھی اچھا ہو جو پورا کر دو تم وفادار ہو، تھوڑی سی وفا اور سہی''[۱]

'ذاتی ڈائری' سے یہ اقتباس نقل کیا جا رہا ہے تا کہ اس کی سماجی ،سیاسی ، ثقافتی اور ادبی قدر و قیمت کے ساتھ ساتھ مولانا کے اسلوب نگارش کا اندازہ لگایا جا سکے یہ اقتباس محمد علی جوہر کی قید و بند اور حالت اسیری میں ان کی معمولات زندگی کے متعلق ہے۔

''چھنڈواڑہ ،سی. پی کا 'شہر' جغرافی حیثیت سے ہوتو ہو،اس وقت ملک میں کسی گاؤں یا دیہات ہی کی طرح گمنام تھا۔لوگوں کے کان میں پہلی بار اس کا نام جبھی پڑا، جب علی برادران وہاں نظر بند کیے گئے ۔ یوسف علیہ السلام نہ ہوتے تو آج کنعان کی یہ شہرت شعرو ادب کی دنیا میں کہاں سے ہو گئی ہوتی ؟اب چھنڈواڑہ کا نام ایک ایک کی زبان پر تھا۔ اور عوام تو نہیں، لیکن پڑھے لکھوں اور خواص میں جسے دیکھیے ،علی برادران کی زیارت کے لیے کھنچا ہوا چھنڈواڑہ پہنچ رہا ہے۔ اور پھر خالی ہاتھ بھی نہیں دل کی عقیدت واخلاص کے نذرانہ کے ساتھ ساتھ، مادی اعتبار سے بھی کوئی پھلوں کی ٹوکری ساتھ لیے اور کوئی مٹھائی کی ہانڈی ،کوئی ٹوپی یا چھڑی پیش کر رہا ہے،اور کوئی پاتابہ اور جوتا۔ چھنڈواڑہ کیا ہوا، گویا ویرانہ میں کسی بزرگ کی درگاہ ،خلقت کے لیے زیارت گاہ،اور محمد علی اوران کے بھائی زندہ پیر! محمد علی کا خاص مشغلہ اس وقت تلاوت قرآن مجید تھا۔حافظہ ماشا اللہ یوں بھی بہت قوی تھا، پھر قرآن کو جو بار بار پڑھا اور جھوم جھوم کر ذوق وشوق کے ساتھ پڑھا ،تو قرآن مجید ایک بڑی حد تک انھیں حفظ ہی ہو گیا ،اور محمد علی کہنا چاہیے کہ نیم حافظ ہو ہی گئے ۔یعنی جس طرح

---

[۱] محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص:۵۰۔۵۱

مبتدی کو حافظہ کرنے کے دوران میں قرآن کچا کچا یاد رہتا ہے، انھیں بھی برزبان ہی سا ہوگیا تھا، اوراس دورِ زندانی کی یہ برکت اخیر عمر تک قائم رہی۔''[۱]

مولانا محمد علی جوہر کی سیاسی مخالفت اور ان کے عزم و استقلال اور ملک و قوم کے لیے قربانی دینے کے جذبوں کا اظہار مولانا ماجد نے اس طرح کیا ہے۔

''صحابیوں کے سرتاج عمر فاروق سے متعلق جب حدیث نبوی میں یہ مضمون نظر سے گزرا تھا کہ عمر کی حق گوئی نے ان کا کوئی دوست باقی نہ رکھا تو دل پر بڑا اثر پڑا تھا، اور حیرت بھی ہوئی تھی۔ قدرت حق نے اُس کا ایک ہلکا سا نمونہ آنکھوں کو دکھا دیا۔ محمد علی اس آفتاب کے سامنے ایک ذرہ سہی، لیکن بہر حال اس ذرہ پر بھی آفتاب کا پرتو پڑ رہا تھا، یہ مخالفت، وہ مخالفت، عمر بھر کے دوست رفیق، عزیز مخالف، جو اپنے خاص دست و بازو تھے وہ مخالف۔ اب کارٹون ان کے نکل رہے ہیں، ہجویں ان کی چھپ رہی ہیں اور مخالفانہ مضمونوں اور تقریروں کی تو حد ہی نہیں۔ اور یہ ساری یورش اس محمد علی پر، جس کی بائیں آنکھ تو بالکل ہی جا چکی اور داہنی آنکھ کے بھی چلے جانے کا ہر وقت خطرہ۔ زور سے بات کرنا تک منع تھا! عجب تماشہ تھا۔ کل تک عین مرکزی خلافت کمیٹی کے جلسوں میں یہ الزام بعض مقدسین کی زبان سے لگایا جا رہا تھا کہ محمد علی تو بالکل ہندؤں کے ہاتھ بک چکے ہیں۔ برابر مسلمانوں پر ظلم اور زیادتی ہوتے دیکھتے ہیں اور کچھ نہیں بولتے۔ اور آج جب محمد علی کانگرس میں اندھا دھند شرکت سے روکنے لگے تو خود ہی لوگ پلٹ پڑے اور کہنے لگے کہ عین انگریز پرستی ہے۔ یہ ہمیں آزادی کی راہ سے روک رہے ہیں۔

میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہوگیا!''[۲]

'ذاتی ڈائری' محمد علی جوہر کی زندگی کے اہم ۱۸ رسالوں کی مکمل روداد ہے۔ اس میں جوہر کی صحافت، سیاست، مذہب، فکر و عمل، مخالفت، شاعری، نظر بندی، اسیری، اور زندانی تخلیقات کے علاوہ خلافت تحریک،

---

[۱] محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۳۶

[۲] ایضاً: ص: ۵۱۲

کانگرس تحریک۔ جمعیۃ العلماء وغیرہ جیسی اہم تحریکات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ذاتی ڈائری میں اس زمانے کے ہندوستان کا سیاسی، سماجی، معاشرتی، ثقافتی منظرنامہ اور محمد علی جوہر کی آخری وصیت، انتقال وغیرہ کے احوال بڑے دلکش اور معروضی انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ اس اعتبار سے 'ذاتی ڈائری' کو ایک ایسا نگارخانہ کہا جا سکتا ہے جس میں مولانا محمد علی کی ذات وشخصیت کے ساتھ ساتھ پورے ہندوستان کا سیاسی مدوجزر موجود ہے، زندگی کی پوری حرکت وتابش کے ساتھ۔

آپ بیتی

مولانا ماجد دریابادی کی زندگی کی آخری یادگار اور شاہکار اور پائدار تخلیق ان کی خودنوشت 'آپ بیتی' ہے۔ اس کی پہلی اشاعت مولانا کے انتقال کے بعد ۱۹۷۸ء میں عمل میں آئی۔ فنی وادبی نقطہ نظر سے 'آپ بیتی' کا شمار کامیاب خودنوشت سوانح میں کیا جاتا ہے۔ اس میں فنی وادبی تقاضوں کا پاس ولحاظ رکھا گیا ہے۔ اس کے ابتدائی صفحات میں مولانا ماجد نے 'ایک ضروری تمہید' کے عنوان سے اپنے معاصر سیاسی، سماجی، تہذیبی، ادبی منظرناموں، رہن سہن، جاگیرداری، رسم ورواج، توہمات اور عقائد وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے۔ تاکہ آپ بیتی کی تفہیم میں آسانی ہوجائے، اور قاری تمام واقعات اور حالات کو اسی سیاق وسباق کے تناظر میں سمجھنے اور پڑھنے کوشش کریں، اس تحریر کو محاکے کی حیثیت حاصل ہے۔ 'آپ بیتی' سے مولانا ماجد کی متنوع شخصیت کے تمام پہلوؤں سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ مولانا نے اپنے حالات وواقعات کے بیان میں جرات اور دیانت داری کا ثبوت پیش کیا ہے۔ بچپن، جوانی، کالج کی زندگی، دورالحاد اور اپنے علمی وادبی مشغلوں وغیرہ پر بڑی بے باکی سے اظہار خیال کیا ہے۔ مولانا نے اپنی آپ بیتی آخری عمر میں لکھنی شروع کی تھی، اور آخری مسودہ ۱۹۶۷ء میں تیار کرلیا تھا۔ اس وقت وہ ایک ممتاز عالم، مفسر قرآن اور صاحب طرز انشاپرداز کی حیثیت سے معروف ہوچکے تھے۔ زندگی کے اس موڑ پر بھی مولانا کی یادداشت اور قوت حافظہ قابل تعریف تھا۔ بچپن کی چھوٹی چھوٹی باتوں اور جوانی کی حکایتوں وغیرہ کے من وعن بیان کرنے کا ہنر اور ملکہ مولانا کو حاصل تھا۔

مولانا کی اس خودنوشت کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اسلامی اور مشرقی روایات واقدار، ماضی کے صالح اور حسین یادوں سے محبت اور لگاؤ اور وابستگی پائی جاتی ہے۔ بچپن کی اپنی زیادتیوں اور نازیبا

حرکات کے لیے اپنی پشیمانی کا اعتراف کیا ہے، اور جن شخصیات کی شان میں مولانا سے گستاخی ہوئی تھی ان مرحومین سے مولانا نے معذرت بھی کی ہے۔ مشہور و معروف شخصیات کے ساتھ ساتھ اس میں گم نام اور بے حیثیت لوگوں کا بھی تذکرہ مولانا نے بڑے احترام و اہتمام سے کیا ہے۔ صداقت کے اظہار کی جرات اور اسلامی و مشرقی اخلاق و اقدار کی تبلیغ اس میں بکثرت پائی جاتی ہے۔ بعض مقامات پر واقعات کی تکرار کی وجہ سے خفیف سقم پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے باوجود یہ خودنوشت فن کے تمام لوازمات کو پورا کرتی ہے۔ 'آپ بیتی' کا 'پیش لفظ' مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے لکھا ہے۔ جس میں اس کتاب کے ادبی و تصنیفی محاسن کا اعتراف کرتے ہوئے انھوں نے بجا طور پر مولانا دریابادی کو اردو ادب کے صاحب قلم ہونے کا خطاب دیا ہے۔

'آپ بیتی' کی تقسیم مولانا نے ۵۳ رذیلی ابواب میں کی ہے۔ مثلاً، ماحول و اجداد، والدین، دوسرے اعزہ و اقرباء، پیدائش بسم اللہ، خانگی تعلیم و تربیت، اسکولی زندگی میں داخلہ، کالجی زندگی، ازدواجی زندگی، مضمون نگاری و صحافت، انگریزی مضمون نگاری، آغاز الحاد، اسلام کی طرف بازگشت، سیاسی زندگی، بیعت و ارادت، تصنیف و تالیف، معاشی و مالی زندگی، شاعری یا تک بندی، سفر، صحت جسمانی، عام معیشت، چند مخصوص عادات و معمولات، موثر عزیز محسن شخصیتیں، چند مظلوم و مرحوم شخصیتیں، اولاد، مخالفین و معاندین، عام نتائج و تجربات زندگی کا نچوڑ، زندگی کا زبردست حادثہ جیسے اہم موضوعات پر مفصل طور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

یہاں 'آپ بیتی' پر تفصیلی بحث اس لیے نہیں کی جا رہی ہے کیونکہ 'باب اول' میں مولانا ماجد کی سوانح کے حوالے سے 'آپ بیتی' کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا جا چکا ہے۔ اس مستقل آپ بیتی کے علاوہ مولانا نے اپنے ذاتی حالات آج کل دہلی، نقوش لاہور اور دیگر رسائل میں قلم بند کیے ہیں جو اپنی ادبی شگفتگی اور سلاست کے لیے مشہور ہیں۔

سیرت نبوی قرآنی

مولانا ماجد نے حضور پاکؐ کی حیات طیبہ کو آیات قرآنی کی روشنی میں بڑی محنت و عرق ریزی سے مرتب کر کے اردو سیرت نگاری کو ایک نئے طرز اور جہت سے آشنا کیا ہے۔ قرآن کی مدد سے سیرۃ النبی کی ترتیب عرب عالموں کی ایجاد ہے، اور اس نوع کی کتابوں میں سیرت ابن ہشام، قاضی عیاض مالکی کی

الشفا وغیرہ بہت مشہور ہیں، جس میں حضرت محمد مصطفیؐ کی سیرت کو بڑی تفصیل سے قرآنی آیات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اردو میں اس طرز کی سیرت نگاری کا آغاز مولانا ماجد ہی کی جدت ہے۔

مولانا ماجد نے 'سیرت نبوی قرآنی' کی تالیف تقریباً ساڑھے چھ ہزار آیات کو بنیاد بنا کر حضور پاکؐ کی ذات وصفات پر کسی نہ کسی زاویے سے روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے 'سیرت نبوی قرآنی' کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

> ''ماجد نے قرآن حکیم کی سوا چھ ساڑھے چھ ہزار آیات سے ایک ثلث یا اس سے کم ایسی آیات بہرحال نکال لیں جن سے سیرت نبوی پر کسی نہ کسی زاویے سے روشنی پڑتی ہے۔ ماجد کو اس سلسلے میں سیرت ابن ہشام، قاضی ایاز مالکی کی الشفا، شبلی وسلیمان کی سیرت نبوی اور مولانا عبدالشکور لکھنوی کی 'سیرت الحبیب الشفیع من الکتاب العزیز الوقیع' سے بہت مدد ملی۔ عربی میں اس موضوع پر ایک مفصل کتاب محمد عزۃ دروزہ کی ہے، لیکن یہ کتاب ماجد کی نگاہ میں اس وقت نہ تھی جب وہ زیر کتاب لکھ رہے تھے۔ یہ کتاب انھیں اپنی کتاب کی تسوید وتبییض کے کئی سال بعد ملی لہٰذا وہ اس سے استفادہ نہ کر سکے۔ سیرت نبوی قرآنی کا ایک امتیاز یہ ہے کہ یہاں ماجد کا اسلوب تحریر لفظی وفنی تزئین کاری اور جوش خطابت سے بالکل الگ تمام تر ترسیل مطالب کا حق ادا کرتا ہے۔ پھر وہ 'واقعۂ اِفک' یا حضورؐ کے مسئلہ تعدّد ازدواج جیسے نازک مقامات سے بڑی کامیابی سے گزر گئے ہیں۔''[۱]

سیرت نبوی قرآنی میں مولانا ماجد کے بیان کردہ حالات وواقعات بڑے دلچسپ، تحیر انگیز اور دلکش ہیں۔ سیرت نبوی کا ایک امتیاز یہ ہے کہ اس کا اسلوب نگارش بالکل مختلف ہے۔ یہاں خطابت، جوش کے بجائے مولانا نے تشریحی واستدلالی انداز اختیار کیا ہے۔ سیرت نبوی کے چند اہم عنوانات یہ ہیں۔ ظہور کی پیش خبریاں، نام، نسب، وطن، زمانہ، فضائل، خصائص، مشاغل، رسالت وبشریت، ہجرت، غزوات ومحاربات، معاصرین، مشرکین، یہود ونصاریٰ، منافقین، مومنین معجزات ودلائل اور خانگی وازدواجی زندگی،

۱؎ مولانا عبدالماجد دریابادی احوال وآثار: ڈاکٹر تحسین فراقی: ص: ۳۸۱۔۳۸۲

وغیرہ۔ تحسین فراقی کی کتاب 'مولانا عبدالماجد دریابادی احوال و آثار' سے سیرت نبوی کے چند تراشے بطور نمونے نقل کیے جا رہے ہیں۔

''قرآن مجید کوئی بات بلا مقصد نہیں بیان کرتا۔ اس تمام تر خانگی قصہ کے لے آنے سے سبق ایک نہیں کئی کئی نکلتے ہیں۔ چنانچہ پہلی تو یہی نکلی کہ آپ کی معیشی اور خانگی زندگی جنت کی نہیں، اسی خاکی دنیا کی زندگی تھی جو نوع بشری کے ہر ہر فرد کے لیے نمونہ کا کام دے سکتی ہے۔ پیچیدگیاں اس میں وہی پیش آتی تھیں جو ہر انسان کو اپنی ازدواجی زندگی میں پیش آسکتی ہیں اور علاوہ ملکی انتظامات اور اجتمائی معاملات میں امت کی رہنمائی و پیشوائی کے آپ کو خانگی معیشت کے مرحلوں سے گزرنا تھا کہ بغیر اس کے اسوۂ حسنہ کے کامل و جامع ہونے کی کوئی صورت نہ تھی۔ دوسرا سبق یہ ملا کہ حسن معاشرت و معیشت گویا آپ پر ختم تھا۔ عین ناگواری کے عالم میں بھی رفق و ملاطفت کا سر رشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنے پایا۔ تیسرا پہلو یہ ملاحظہ ہو کہ زبان سے یہ نہ ارشاد ہوا کہ خبر مجھے کیوں نہ ہو جاتی۔ سبب نہ اپنی فراست کو پیش فرمایا نہ اپنے اشراق و کشف کو۔ فرمایا تو ایک عبد کامل کی طرح یہ فرمایا کہ اس خدائے علیم و خبیر نے مجھے خبر فرما دی۔.....''[1]

سورۃ الضحیٰ کی آیت **الم یجدك یتیما فآوی** کے الفاظ کی تشریح اس طرح کی ہے۔

''یتیم اس کو کہتے ہیں جس کے باپ کا انتقال اس کے بلوغ سے قبل ہی ہو جائے اور قبل بلوغ شامل ہے قبل ولادت کو، اور تاریخ کا بیان ہے کہ آپؐ کے والد ماجد کی وفات آپؐ کی پیدائش سے بھی قبل ہو گئی تھی۔ 'پھر قرآن ہی کے لفظ 'فآوی' سے یہ بھی نکلتا ہے کہ یتیمی کا باعث آپ بے گھر ہو گئے تھے۔''[2]

سیرت نبوی قرآنی ۱۹۶۳ء میں صدق ایجنسی لکھنو سے شائع ہوئی تھی۔ لیکن یہ کتاب نایاب ہو چکی ہے، تلاش بسیار کے باوجود اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہ ہو سکا۔ اس لیے مجبوراً ڈاکٹر تحسین فراقی کی کتاب

---

[1] بحوالہ مولانا عبدالماجد دریابادی احوال و آثار: ڈاکٹر تحسین فراقی: ص: ۳۸۰۔۳۸۱

[2] ایضاً: ص: ۳۸۱

'مولانا عبدالماجد دریابادی احول و آثار' سے استفادہ کر کے سیرت نبوی قرآنی کے متعلق چند اہم حقائق کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

ذکر رسول یا مردوں کی مسیحائی

حضور پاکؐ کی حیات وصفات مقدسہ پر لکھے گئے مضامین کا یہ مجموعہ 'ذکر رسول یا مردوں کی مسیحائی' کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں شامل تمام مضامین اخبار 'سچ' اور 'صدق جدید' میں شائع ہو چکے تھے۔ کل مضامین کی تعداد ۱۸ ہے۔ پہلی بار ۱۹۴۳ء میں حیدرآباد سے ڈاکٹر غلام دستگیر رشید حیدرآبادی نے 'مردوں کی مسیحائی' کے نام سے شایع کیا تھا۔ اس کی دوبارہ اشاعت مولانا ماجد کے بھتیجے اور داماد حکیم عبدالقوی صاحب مرحوم نے 'ذکر رسول' کے نام سے ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ سے کرائی۔ اس کی تیسری اشاعت صدق فاؤنڈیشن کے جنرل سکریٹری جناب نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی کی کاوشوں سے ۲۰۰۷ء میں عمل میں آئی۔ اس وقت تک اس مقبول کتاب کے چار ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ ذکر رسول کی زبان و بیان، ترتیب واشاعت سے متعلق نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی 'پیش گفتار' میں لکھتے ہیں۔

> ''ذکر رسول' نامی سیرت کی اس کتاب میں شامل مقالات کا طغرائے امتیاز مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے قلم صدق رقم کا وہ مسحور کن اسلوب ہے جس میں عشق رسولؐ، حب نبیؐ اور شمع رسالت کے پروانوں سے والہانہ عقیدت کے جذبات کے ساتھ ساتھ خطیبانہ حرارت، حکیمانہ بصیرت، منطقی طرز استدلال اور تجزیہ نگاری کی ایسی آمیزش نظر آتی ہے جو اس مجموعہ کو دیگر کتابوں کی موجودگی میں 'تو چیزے دیگری' کا درجہ دلاتی ہے۔ 'نثری نعت' کے اس البیلے مجموعے کو پڑھتے جایے اور مولانا دریابادیؒ کے وجد آگیں اسلوب کا لطف اٹھاتے جایے۔ مولاناؒ کے یہ بیش قیمت سیرتی مضامین ان کے شہرہ آفاق صحیفے ہفتہ وار سچ لکھنو میں شائع ہوئے تھے۔ سیرت پاک جیسا پاکیزہ اور محبوب موضوع اس پر مستزاد مولانا دریابادیؒ کا شگفتہ اور پختہ قلم، منظر نور علی نور! یہ مضامین ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ بعد ازاں جنوری ۱۹۴۳ء میں ڈاکٹر غلام دستگیر رشید حیدرآبادی نے

ادارہ اشاعت اردو حیدرآباد سے ان مضامین کو 'مردوں کی مسیحائی' کے نام سے کتابی شکل میں شایع کیا۔ کتاب خوب مقبول ہوئی۔ ۱۹۸۴ء میں مولانا دریابادی کے برادرزادہ اور خویش حکیم عبدالقوی دریابادیؒ (مدیر صدق جدید لکھنو) نے اسی کتاب کو 'ذکر رسول' کے نام سے مولانا دریابادیؒ کے ایک نادیدہ مخلص معتقد الحاج منظور علی لکھنوی کے اشاعتی ادارے ادارہ انشائے ماجدی کولکاتہ سے شایع کرایا۔ حکیم صاحبؒ نے اس ایڈیشن کے لیے جو دیباچہ تحریر کیا تھا وہ شامل کتاب ہے۔ اس کے بعد حاجی صاحب موصوف نے اس میں ایک مضمون 'آستانہ نبوت' جو مولانا دریابادیؒ کی کتاب 'سفر حجاز' سے لیا گیا ہے۔ موضوع کی مناسبت سے شامل کر کے کتاب کا خوبصورت اور حسین ایڈیشن شایع کیا۔ کتاب کی مقبولیت کے پیش نظر اب چوتھا ایڈیشن صدق فاؤنڈیشن کی جانب سے شایع ہو رہا ہے۔ رب ماجد سے دعا ہے کہ ہمارے اس عمل کو قبول فرمائے۔''[1]

ذکر رسول میں شامل مضامین کے چند عنوانات اس طرح ہیں۔ مردوں کی مسیحائی، یتیم کا راج، سیرت نبوی اور علمائے فرنگ، میلادی روایات، اسوہ حسنہ، ولادت باسعادت، رحمتہ للعالمین، یتیموں کا والی غلاموں کا مولی، وغیرہ 'ذکر رسول' کے شروع میں مولانا کی تخلیق کردہ ایک نعت بھی شامل ہے۔ مولانا ماجد کے سیرت نبوی پر لکھے ہوئے یہ مضامین اسلوب، طرز ادا اور لب ولہجہ کے اعتبار سے دوسرے سیرت نگاروں کے مضامین سے منفرد و ممتاز ہیں۔ مولانا کا سحر انگیز اسلوب اور محبت و عقیدت کا جذبہ ان عبارتوں کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہوتا ہے، اور اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ عشق رسول میں ڈوب کر ایک سچا عاشق رسول اپنی عقیدت ومحبت کے نذرانے شان اقدس میں پیش کر رہا ہے۔ سیرت نگاری جیسے مقدس صنف میں بھی مولانا کے اسلوب نگارش کا خاص انداز وآہنگ، خطیبانہ جوش ولولہ، سلاست وروانی پوری آب وتاب کے ساتھ برقرار ہے۔ منطقی واستدلالی انداز اور قرآن پاک کی آیتوں کا برمحل استعمال اس کتاب کی خاص شناخت ہے۔ بعض آیتوں کی تشریح وتوضیح مولانا ماجد نے اس انداز سے کی ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی آیت کو بنیاد بنا کر پورا مضمون لکھا گیا ہے۔

---

[1] ذکر رسول یا مردوں کی مسیحائی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص:۶-۷

اسلام سے قبل سرزمین عرب میں کفر و شرک ،ظلم و ستم ، جہالت ،استحصال وغیرہ کا بول بالا تھا۔دور جہالت کی برائیوں اور اسلام کی آمد، بعثت نبیؐ کی ترجمانی ومنظر کشی مولانا نے اپنے خاص انداز میں کی ہے۔

''یہ سرزمین جس طرح مادی حیثیت سے بنجر ہے، شاید اسی طرح اب تک فطرت کی روحانی بارشوں اور بخششوں سے بھی محروم ہے ۔اس کی تباہ کاریاں اور تیرہ بختیاں سارے عالم کے لیے ایک نمونہ عبرت ہیں ۔ بیمار کل دنیا ہے ،لیکن عرب کا مریض ،دق میں مبتلا ہے۔ خشک سالی سب کہیں ہے، لیکن یہاں قحط شدید پڑا ہوا ہے۔اس کی اخلاقی پستی حد سے گزر چکی ہے،اس کی روحانی بیماریاں تقریباً لاعلاج ہو چکی ہیں ۔.... یہ فضا ہے، جس میں ایک بے کس وبے یاور ،یتیم اوران پڑھ بچہ اپنی آنکھیں کھولتا ہے۔ کارساز فطرت کی مشیت یہ ہوتی ہے، کہ اسی بے کس وناتواں کے ذریعہ سے، ایک قبیلہ کی نہیں ،ایک قوم کی نہیں ، ایک ملک کی نہیں ،سارے عالم ، بلکہ سارے عالموں **لیکون للعالمین نذیرا** ۔کی اصلاح کا کام لیا جائے اور اسے سارے جہانوں کی جانب یہ پیام دے کر بھیجا جائے ،کہ فطرت سے بغاوت کرتے رہنے والوں کا بالآخر کیا انجام ہونے والا ہے۔ پیامبر اپنا پیام پہنچاتا ہے،اور اس کے گرد وپیش کی ساری شیطانی قوتیں دولت وقوت کے سایہ میں جمع ہوکر اس کی مخالفت وعداوت پر کمر بستہ ہو جاتی ہیں ۔اس عالی ظرف کا ظرف، سالہا سال تک، ہر قسم کی تکلیف وتوہین ،اذیت ورسوائی کے مقابلہ میں سپر بنا رہتا ہے۔....لیکن دنیا میں یہ انقلاب روحانی پیدا کر دینا کہ کل تک جو رہزن تھے، وہ آج اچھے رہرو ہی نہیں ، بلکہ بہترین رہبر بھی ہو جائیں ،کل تک جن کی زندگی فسق وفجور کی نذر تھی ،آج وہ اتنے بلند ومقدس مرتبہ پر پہنچ جائیں ، کہ صداقت وپاکیزگی کو ان کے انتساب سے شرف ہو جائے ،کل تک جو مردہ تھے، وہ آج زندہ ہی نہیں ، بلکہ دوسروں کو زندہ کر دینے والے بن جائیں ،

ایسے آفتاب کا طلوع جو ہر ذرہ کو آفتاب بنادے، ایسے مسیح کا نزول جو مردہ کو مسیح بنادے۔ اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں بجز سرور عالمؐ کے صحابیوں، بجز محمدؐ کے غلاموں، کے اور کہیں بھی مل سکتی ہے؟ نادانوں کا قول ہے، کہ خاتم النبینؐ نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا، حالانکہ یہ پاک زندگی شروع سے آخر تک خود ایک معجزہ تھی، اور اس کا کوئی جز ئیہ ایسا نہ تھا، جو اپنے اندر ایک اعجازی رنگ نہ رکھتا ہو! اس 'زندہ فرقان' کے ان زندہ معجزوں کے ہوتے ہوئے، کشتی نوحؑ، گلزار خلیلؑ، عصائے موسیٰؑ، تخت سلیمانیؑ، حسن یوسفؑ، دم عیسیٰؑ، کسی محدود، وقتی ومقامی معجزہ کی کچھ بھی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی نہ اس وقت راز تھی، نہ آج راز ہے۔ ابولہب وابوجہل اور ان کے سارے ہم نشینوں نے اس وقت دیکھا، کہ بدبودار اور پر عفونت کھاد، گملے میں پڑی، اور ان کی آنکھوں کے سامنے، شاداب وخوش رنگ مہکتے ہوئے گلاب کے پھول میں تبدیل ہوگئی، حق کی قوت، ہر تردید وتغلیط کے خطرے سے بے پروا ہے، زندہ معبود کے زندہ رسولؐ، کے زندہ معجزہ کا جواب نہ اس وقت بن پڑا، نہ آج حق کے جھٹلانے والوں، محمدؐ کے دشمنوں، اور ابولہب وابوجہل کے موجودہ جانشینوں میں سے کسی کے بس کی بات ہے!''[1]

اس میں شامل مضمون 'میلادی روایات' میں مولانا نے قرآن کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے، کہ برگزیدہ اشخاص کی ولادت سے قبل یا بعد خلاف عادت یا فطرت واقعات ہو چکے ہیں ان خوارق یا خلاف فطری واقعات کا تذکرہ مولانا نے اس طرح سے کیا ہے۔

''کلام مجید میں ذکر متعدد انبیاء کرام کا آتا ہے، لیکن صرف چند انبیاء کرام اور ان کے متعلقین ہیں، جن کی پیدائش یا ولادت کا بھی ذکر آیا ہے۔ اس مختصر فہرست میں سب سے پہلے نام حضرت آدم علیہ السلام کا ہے۔ آپ کی پیدائش خوارق عادت کا ایک مجموعہ تھی، اور فطرت کے عام دستور کے بالکل

---

[1] ذکر رسول یا مردوں کی مسیحائی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۱۱۔۱۴۔۱۹۔۲۰

مخالف ہوئی۔ اول تو آپ کو بغیر ماں اور بغیر باپ کے پیدا کیا گیا، پھر فرشتوں سے آپ کی تعظیم کرائی گئی، اور جس مخلوق نے آپ کو سجدہ کرنے سے انکار کیا وہ ہمیشہ کے لیے ملعون ہوگیا۔ آپ کو تمام اسماء کا علم کرا دیا گیا، آپ کی پیدائش سے قبل فرشتوں سے خاص طور پر گفتگو فرمائی گئی۔ اور پیدائش کے بعد ہی فرشتوں کے علم کا آپ کے علم کے مقابلہ میں امتحان لیا گیا، جس میں آپ کو کامیابی ہوئی۔ ظاہر ہے کہ یہ سارا سلسلہ واقعات عام انسانوں کی پیدائش کے قبل وبعد وجود میں لاتے رہنے کا دستور نہیں۔ ..... حضرت اسحٰقؑ کی ولادت کے سلسلہ میں کلام مجید سے ثابت ہے، کہ بشارت دینے فرشتے انسان کی صورت میں مرئی ہوکر آئے، جنھیں آپ کی والدہ نے، جو نبی نہ تھیں دیکھا، اور ان سے گفتگو کی، اور ان فرشتوں نے انھیں حضرت اسحٰق کے علاوہ حضرت یعقوب کی بھی بشارت دی، اور ان کے دل کو تسلی اور ڈھارس دی، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت پر، ان کی والدہ پر، باوجود ان کے نبی نہ ہونے کے، وحی نازل ہوئی۔ ان کے دل کو تسلی و تشفی دی گئی، حضرت موسیٰؑ کی حفاظت کا ایک خاص طریقہ بنایا گیا، ان کے محفوظ رہنے اور آئندہ پیمبر بننے کا علم جواب تک پردۂ غیب میں تھا، ان کی والدہ کو عطا کیا گیا۔ پھر سمندر میں ڈالے جانے کے بعد معجزانہ انداز سے آپ کی پرورش فرعون واہل فرعون سے کرائی گئی، اور رضاعت پر آپ کی والدہ ماجدہ ہی کو مقرر کرایا گیا۔ یہ ساری تصریحات کلام مجید ہی میں ہیں، احادیث میں اور زائد تفصیلات موجود ہیں۔ یہ سارے واقعات خوارق عادت ہیں یعنی فطرت کے عام دستور کے خلاف ہیں۔ حضرت یحیٰؑ کی ولات اس وقت ہوئی، جب آپ کے والد ماجد اپنے کو بوجہ ضعیفی تولید کے ناقابل اور آپ کی والدہ کو عقیمہ سمجھ چکے تھے۔ پھر اس مبارک ولادت کی بشارت فرشتوں نے پکار پکار کر دی۔ اور حضرت عیسیٰ کی

ولادت تو ایک مجموعہ عجائب ہے۔آپ کی والدہ ماجدہ حضرت مریمؑ کا بغیر کسی مرد کے حاملہ ہوجانا باوجود نبی نہ ہونے کے فرشتوں کا آپ سے گفتگو کرنا، اور اپنے بطن سے ایک نبی مرسل کے تولد ہونے کی بشارت ملنا، وضع حمل کے وقت ایک چشمہ کا جاری ہوجانا، تازہ پھلوں کا خود بخود آکر گرنا، پھر حضرت مسیحؑ کا بچپن ہی میں بولنے لگنا، اور اپنی والدہ مکرمہ کی پاک دامنی کی شہادت دینا۔ ہر واقعہ بجائے خود ایک معجزہ ہے۔.....بحر حال اللہ کے جتنے نیک اور برگزیدہ بندوں اور بندیوں کی پیدائش کا ذکر کلام مجید میں ہے، ان سب میں یہ امر مشترک ہے، کہ ان میں سے ہر ایک کی پیدائش کے وقت، یا قبل، یا بعد، کچھ خوارق عادت کا ظہور ہوا ہے،.....پھر اگر رسولوں کے سردارؐ اور پیمبروں کے سرتاج کی ولادت کی بشارتیں فرشتوں نے پکار پکار کر دی ہوں، اگر اس آفتاب کے طلوع پر عالم ملکوت میں غلغلہ شادمانی و مسرت برپا ہوا ہو، اگر اس نور چشم کی والدہ ماجدہ کے لیے انوار غیب مرئی ہوگئے ہوں، اگر اس خوش نصیب و قابل رشک خاتون کے شہود میں بعض لطائف ملکوت لے آئے گئے ہوں، تو کیا کسی مسلمان کو اس پر حیرت ہونی چاہیے؟''[1]

'مردوں کی مسیحائی' کے متعلق اس کے مرتب ڈاکٹر غلام دستگیر صاحب 'عرض نیاز' کے عنوان سے اپنے مضمون میں لکھتے ہیں۔

''ایک سچے سیرت نگار کی طرح آپ کا مطالعہ سیرت نبوی بڑا گہرا ہے۔ صاحب سیرت کے ظاہر و باطن کے مشاہدہ اور احساس میں آپ نے کمال پیدا کیا ہے۔ علم دین اور معرفت کا یہی منتہائے مقصود ہے۔ سیرت مبارک کے جن پہلوؤں پر آپ نے قلم اٹھایا ہے ان سے آپ کی دقت نظر اور عمق فکر صاف ظاہر ہے تلاش و تحقیق کا کمال آئینہ ہے۔''[2]

---

[1] ذکر رسول یا مردوں کی مسیحائی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۹۱۔۹۲۔۹۳

[2] عرض نیاز (مضمون) ڈاکٹر غلام دستگیر: فروغ اردو: (عبدالماجد دریابادی نمبر) اگست تا اکتوبر ۱۹۷۱ء لکھنو: ص: ۱۹۲

معاصرین

چونکہ زیر بحث باب کا عنوان 'عبدالماجد دریا بادی بحیثیت سوانح نگار' ہے۔اس لیے موضوع کی مناسبت اور یکسانیت کی وجہ سے اس باب میں مختصر طور پر مولانا کے لکھے ہوئے خاکوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ان کے تحریر کردہ خاکوں کے دو مجموعے 'معاصرین' اور 'وفیات ماجدی یا نثری مرثیے' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔یوں تو سچ ،صدق اور صدق جدید کے مقالات اپنے پیامات اور مکتوبات میں مولانا نے بے شمار خاکے تحریر فرمائے ہیں جن کی ادبی عظمت اور چاشنی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔لیکن ان دونوں کتابوں میں جو خاکے شامل ہیں بہت اہم ہیں۔ان کی مقبولیت اور طرز نگارش کی تعریف پورے طور پر کرنا آسان نہیں،اس لیے ان کا مختصر جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

معاصرین میں مختلف شخصیات پر لکھے گئے خاکوں کی تعداد ۸۰ ہے۔اس میں شامل خاکے ۱۹۷۴ء سے 'صدق جدید' میں قسط وار شایع ہونے شروع ہوئے تھے۔لیکن افسوس کہ اس کتاب کی اشاعت مولانا ماجد کی زندگی میں نہ ہو سکی۔معاصرین کی ترتیب وتدوین کی ذمہ داری ان کے بھتیجے اور داماد حکیم عبدالقوی مرحوم نے بحسن خوبی ادا کی۔اس کی پہلی اشاعت کلکتہ کے باذوق علم دوست حاجی منظور علی مرحوم نے ۱۹۷۹ء میں اپنے ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ سے کی۔اس کے متعلق حکیم عبدالقوی دریابادی لکھتے ہیں۔

> ''معاصرین' مولانا عبدالماجد دریا بادی مرحوم نے اپنی علالت (فالج) کے دوران اردو اکاڈمی یوپی کو اشاعت کی غرض سے حوالہ کی تھی اور اس کی کمیٹی نے اس کی اشاعت کو منظور کر لیا تھا توقع تھی کہ چند ماہ میں وہ اس کے زیر اہتمام شایع ہو جائے گی۔مولانا کی وفات ۶ جنوری ۱۹۷۷ء تک اس کی طباعت کیا معنی کتابت کا بھی آغاز نہ ہو سکا۔اس کے بعد اکاڈمی نے اپنے اشاعتی پروگرام میں اسے شامل کرنے کا اعلان کیا لیکن بعض وجوہ کے پیش نظر مولانا کے ورثا کو کتاب کا مسودہ اکاڈمی سے واپس لینا پڑا اور اس کی اشاعت کا بیڑا.....حاجی منظور علی صاحب پر آپڑا، انھوں نے اپنی انتہائی کاروباری مصروفیتوں کے باوجود اس کام کو باحسن وجوہ انجام دیا۔''[1]

---

[1] معاصرین: مولانا عبدالماجد دریابادی:ص:۷

جس طرح وقت اور حالات کے تقاضوں کے تحت داستان کے بطن سے ناول اور ناول سے افسانہ کا جنم ہوا۔ اسی طرح تذکروں سے سوانح اور سوانح کے بعد خاکوں کا چلن عام ہوا۔ خاکہ میں خاکہ نگار جس شخص کا خاکہ لکھتا ہے۔ اس کی شخصیت کے اہم پہلوؤں کو دلچسپ اور دلکش انداز میں اختصار کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ دریا کو کوزے میں بند کرنے کی عمدہ مثال بہترین خاکے کہے جاسکتے ہیں۔ خاکوں میں خاکہ نگار اپنی پسند و دلچسپی کے پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔ خاکوں کی کامیابی اس پر منحصر ہوتی ہے، کہ جس کا خاکہ لکھا جارہا ہے اس کی شخصیت کے کسی ایک پہلو یا چند پہلوؤں کو اس انداز میں پیش کیا جائے کہ قاری کے ذہن و دماغ پر اس شخصیت کی اہمیت واضح ہو جائے اور وہ مزید مطالعہ کا خواہش مند ہو جائے۔

معاصرین مولانا ماجد کے خاکوں کا مجموعہ ہے۔ چونکہ خاکہ کی فنی خصوصیات میں اختصار جامعیت شامل ہے، اس لیے مولانا نے ایک دو صفحات پر مشتمل سوانحی نوعیت کے خاکے لکھے ہیں۔ ان خاکوں میں ذاتی تاثرات، مشاہدات، فنی چابک دستی کا ثبوت پیش کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے معاصرین میں شامل خاکوں کی فنی و ادبی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔

مولانا ماجد نے ۱۴۳ اپنے سے بڑی شخصیات، ۲۹ ہم عصر اور ۱۸ اپنے سے چھوٹے لوگوں کا خاکہ 'معاصرین' میں لکھا ہے۔ بڑوں میں چند اہم شخصیات اس طرح ہیں۔ والدین، حکیم الامت، محمد علی، گاندھی جی، حسرت موہانی، ریاض خیرآبادی، اقبال، شبلی، بوڑھا کنوارا، مرزا رسوا، خواجہ حسن نظامی، صاحب زادہ آفتاب احمد خاں، راجہ محمود آباد، عبدالحلیم شرر، خواجہ غلام الثقلین وغیرہ۔ برابر والوں میں چند اہم شخصیات یہ ہیں۔ مولانا عبدالباری ندوی، پریم چند، مودودی، ابوالکلام، ظفر حسین، نیاز فتح پوری، مولانا سید سلیمان ندوی، تین شفاء الملک، وغیرہ۔ چھوٹوں میں علی میاں، شوکت تھانوی، عبدالرحمٰن ندوی نگرامی، سراج الحق مچھلی شہری، وغیرہ۔

مولانا کے لکھے ہوئے سوانحی خاکوں میں معاصر سماجی و ادبی اور سیاسی رویوں اور معاشرتی ثقافتی رجحانات و نظریات کی ترجمانی و عکاسی اس طور پر کی گئی ہے کہ اس زمانے کے تمام احوال سے واقفیت ضمنی طور پر ہو جاتی ہے، اور شخصیت کے اہم ترین نقوش کو بڑی بے باکی اور ایمان داری سے مولانا نے واضح کیا ہے۔ صداقت اور ایمان داری کا دامن مولانا نے کبھی نہیں چھوڑا۔ خواہ مولانا اپنے عزیز ترین شخصیت کا خاکہ لکھ

رہے ہوں یا اپنے سخت مخالف کا ہر جگہ انھوں نے پوری ایمان داری کا ثبوت پیش کیا ہے۔ 'معاصرین' سے چند اقتباسات بطور نمونہ ملاحظہ ہوں۔

حسرت موہانی کی شخصیت اور ان کے ادبی و سیاسی نظریات، خصائل و عادات کو چند جملوں میں مولانا ماجد نے اس طرح بیان کیا ہے۔

''ذاتی زندگی میں بڑے بےنفس، لیکن سیاسی خیالات میں ویسے ہی کٹّرے اور متشدد تھے۔ انگریزی حکومت کی مخالفت میں شاید ہر چیز جائز ہی سمجھتے تھے، یہاں تک کہ ریل پر بے ٹکٹ سفر کرنا۔ خفیہ پولیس کا آدمی جو ہر وقت نگرانی پر تعینات رہتا تھا، اسے ہر طرح غچا دینا جائز سمجھتے۔ سیاسیات میں مقلد گاندھی جی کے آخر تک نہ ہوئے۔ پہلے مہاراشٹر کے تلک مہاراج کے پیرو رہے۔ پھر خود ہی مجتہد بن گئے۔ جیل گئے، بار بار گئے اور اس وقت جیل جانا شروع کر دیا تھا جب گاندھی جی نے اسے آسان اور داخل فیشن نہیں کیا تھا۔ ذاتی زندگی میں سادگی وقناعت کے پیکر مجسم تھے، اور قابل رشک۔ عقائد میں 'اہل بدعت' کے ہم نوا تھے۔ یعنی درگاہی وخانقاہی رنگ سے رنگیں۔ عرسوں کے شیدا۔ اخیر عمر میں حج بیت اللہ بھی ہر سال کرنے لگے تھے۔ لوگ پھبتی کستے کہ اللہ میاں کا عرس منانے جا رہے ہیں۔ فرنگی محل میں قادری رزاقی سلسلے میں مرید تھے اور اسی مناسبت سے درگاہ بانسہ (بارہ بنکی) کے بھی بڑے معتقد تھے۔ غزل گو اور شاعر اعلی درجے کے تھے، اور اسی درجے کے نثار وسخن فہم بھی اپنے لیے شاعری میں راہ مومنؔ ونسیمؔ دہلوی کی اختیار کر رکھی تھی۔ اور خود شاگرد امیر اللہ تسلیمؔ کے تھے۔ زبان کے فاضل بلکہ محقق۔ کئی کئی چھوٹے دیوانوں کے مصنف ہونے کے علاوہ معائب سخن ومتروکات وغیرہ پر بھی کئی رسالے لکھے ہیں۔''[1]

مولوی عبدالحق کا خاکہ مولانا نے 'بوڑھا کنوارا' کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس خاکے میں بابائے

---

[1] معاصرین: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۵۶۔۵۷

اردو مولوی عبدالحق کی سیرت و کردار کے متعلق لکھتے ہیں۔

''عمر بھر شادی نہ کی تجرد میں گزاری، سالہا سال ایک محبوبہ دل نواز کی چاہت میں گزار دیے۔ زندگی اس پر تج دی، دن رات اس کے فراق میں گرفتار، نہ یہاں قیام نہ وہاں قرار۔

دن کہیں، رات کہیں صبح کہیں شام کہیں

کا مصداق۔ بہ قول کسی عامی سیلانی کے۔

سالہا سال ہوئے ہیں ترے پیچھے پھرتے

جنوری تو ہے تو اے ماہ دسمبر ہم ہیں!

اس بے پناہ عشق و اشتیاق و الفت کی دھن میں ایجاب و قبول کی فکر کے اور قاضی اور شاہدین کا ہوش کہاں! محبوبہ کا نام ہے زبان اردو، اور اس پر دل دینے والے کا نام عبدالحق بوڑھا کنوارا۔ بس نام ہی کا 'کنوارا' نکلا۔ عبدالحق نے جتنی گہری اور جتنی وسیع خدمت اردو کی کی، اگر اس کا جائزہ لینے پر آیئے تو خود ایک عمر کی چھان بین اور برسوں کی مشقت کی ضرورت ہے۔ دیکھیے کب اور کون اتنی ہمت کر پائے! دوستوں بلکہ دشمنوں تک کے کام آنے والا، غیروں اور اجنبیوں کو نفع پہنچانے والا، خود اچھا کھانے والا۔ اس سے بڑھ کر دوسروں کو اچھا کھلانے والا، بے غرض خدمت گذاری کا پتلا خدمت خلق ہی کو اپنا مذہب بنا لینے والا، کوئی شریف انسان عبدالحق کا سا کم ہی دیکھنے میں آیا ہے اور یقین ہے کہ جب دنیا میں اس کا وقت موعود آیا تو توحید اور رسالت کی گواہی دیتا ہوا دنیا سے رخصت ہوا۔''[۱]

مولانا ابوالحسن علی ندوی مرحوم کا خاکہ مولانا نے ان کے گھریلو نام 'علی میاں' کے نام سے لکھا ہے اس خاکے میں علی میاں ندوی کے علم و ادب اور فضائل و کمالات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے۔

''ندوہ اور دیوبند ماشاءاللہ دونوں کے اکابر سے علم دین حاصل کیا اور اپنے خاندان کے بزرگوں سے (اور انھیں میں مائیں اور دادیاں بھی شامل ہیں)

---

[۱] معاصرین: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۸۹-۹۰

اخلاق وروحانیت کا سبق لیا۔ ذکاوت وفطانت کے پتلے پہلے سے تھے، چندے آفتاب چندے ماہتاب بن کر رہے۔ انگریزی بھی بقدر ضرورت تحصیل کر لی۔ اور عربی ادب وانشاء میں تو ہندوستان اور عالم اسلام میں نام پیدا کرلیا ہے۔ خود اردو شعر وادب کا اعلیٰ مذاق رکھے ہوئے۔ شامی ومصری صحافت پر بھی سیر حاصل نظر کر لی۔ تقریر وحکایت میں ملکہ روانی تحریر سے بھی زائد۔ میری طرح کاہل اور جامد نہیں، ندوے کے سے بڑے دار العلوم کا انتظام بھی کرتے ہیں، اور سارے ہندوستان کا دورہ الگ۔ ابھی یہاں ابھی وہاں، اور مقالات وتصانیف ہیں کہ ساتھ ہی ساتھ کھٹا کھٹ نکلتی چلی آ رہی ہیں۔ اردو اور عربی کے علاوہ انگریزی میں بھی بلکہ کسی حد تک ترکی میں بھی۔ زندگی قابل داد بھی اور قابل رشک بھی۔ .....دنیا انھیں مولانا ابوالحسن علی ندوی کہہ کر پکارتی ہے، ہم لوگوں کی زبانوں پر خالی علی میاں ہیں، عزیزوں سے بڑھ کر عزیز۔''[۱]

'معاصرین' میں شامل خاکوں کی ادبی وفنی عظمت کا اعتراف ڈاکٹر تحسین فراقی نے بھی کیا ہے۔

''معاصرین' میں شامل ماجد کے بیشتر خاکے شگفتہ اور علمیت کی بوجھل فضا سے آزاد ہیں۔ ان کے فلسفہ نفسیات اور ٹھوس علمی کاوشوں کے منظر نامے سے نکل کر قاری جب 'معاصرین' کے سرسبز وشاداب میدان میں سانس لیتا ہے تو اسے اپنا قد نکلتا ہوا اور خون بڑھتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ان خاکوں میں ماجد نے کہیں کہیں سراپا نگاری اور کردار نگاری کی مہارت بھی دکھائی ہے، اور تاثر میں شدت پیدا کرنے کے لیے سراپا نگاری اور کردا نگاری کی اہمیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ ہمارے خیال میں تو کامیاب خاکے کے لیے سراپا نگاری ویسی ہی ضروری ہے جیسے کامیاب غزل کے لیے توانا مطلع۔''[۲]

وفیات ماجدی یا نثری مرثیے

مولانا ماجد کا دوسرا سوانحی خاکوں کا مجموعہ 'وفیات ماجدی یا نثری مرثیے' ہے۔ نثری مرثیے قسم کی یہ

---

[۱] معاصرین: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۲۱۷۔۲۱۸

[۲] مولانا عبدالماجد دریابادی احوال وآثار: ڈاکٹر تحسین فراقی: ص: ۴۰۹

تحریریں صدق اور صدق جدید میں ۱۹۴۱ء سے ۱۹۷۶ء کے درمیانی عرصے میں لکھی گئی ہیں۔ اس میں نثری مرثیوں کی تعداد ۶۲ ہے۔ وفیات ماجدی میں شخصیات کو مختلف ذیلی عنوان مثلاً خاندان والے، علماء کرام وبزرگان طریقت، سیاسی لیڈر، شاعرادیب وصحافی، ڈاکٹر وطبیب، دیگر حضرات، کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ اس میں شامل چند اہم شخصیات کے عنوانات اس طرح ہیں۔ ماں کے قدموں پر، ناز بردار بھائی، ہمشیر کی رخصتی، بوڑھی محبوبہ، ایک خدمت گار کی یاد میں، سیدالطائفہ مولانا سلیمان ندوی، محقق گیلانی، مولانا صدر یار جنگ، مولوی عبدالحلیم صدیقی، شیخ التّفسیر کی وفات، شہید حق پرستی، حسرت موہانی، جواہر لال نہرو، رفیع احمد قدوائی، خوش نصیب گول کیپر، عبدالمجید خواجہ، ڈاکٹر ذاکر حسین، چودھری خلیق الزماں، پروفیسر احتشام حسین حمید نظامی مرحوم، شوکت تھانوی، ڈاکٹر انصاری مرحوم، شفاء الملک حکیم شمس الدین، مولوی مسعود علی ندوی، ایک قوال، وغیرہ۔

وفیات ماجدی کی پہلی اشاعت ۱۹۷۸ء میں عبدالماجد دریابادی اکاڈمی لکھنو سے حکیم عبدالقوی دریابادی مرحوم کی ترتیب وتدوین کے بعد ہوئی تھی۔ اس کی دوسری اشاعت عبدالعلیم قدوائی صاحب کی ترتیب وتدوین اور تصحیح کے بعد ۲۰۰۲ء میں ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ سے ہوئی۔ 'عرض مرتب' کے عنوان سے حکیم عبدالقوی دریابادی ان مضامین کے متعلق لکھتے ہیں۔

> ''مولانا عبدالماجد دریابادی کے قلم سے تعزیتی مقالے اور شذرے، سچ، صدق اور صدق جدید میں صدہا کی تعداد میں نکلے۔ ان میں سے صرف ۶۲ منتخب کر کے اس مجموعہ میں شایع کیے جا رہے ہیں۔ پہلا بڑا تعزیتی مضمون مولانا عبدالرحمٰن ندوی نگرامی مرحوم پر ہے اور آخری تعزیتی مضمون ایک دوسرے ندوی نگرامی محمد اویس پر۔ ندوۃ العلماء سے مولانا کا جو خصوصی تعلق تھا وہ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ انشائے ماجدی کے جوہر اور موضوعوں کی طرح ان تعزیتی مضامین میں بھی خوب نمایاں ہیں۔ اور ان میں وہ ایک صاحب طرز کی حیثیت رکھتے ہیں۔''[1]

مولانا ماجد کے یہ نثری مرثیے ان کی اعلیٰ ظرفی، وسیع المشربی اور دیانت داری کا ثبوت پیش

---

[1] وفیات ماجدی یا نثری مرثیے: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص:۱۱

کرتے ہیں۔حقائق اور خوبیوں کے اظہار میں مولانا ماجد ذاتی پسند و نا پسند، تعصب و ترجیحات سے بلند ہوکر ایک سچے صحافی اور حق پرست دانشور کا فریضہ انجام دیتے نظر آتے ہیں۔زبان و بیان، طرز ادا، منظر کشی، واقعات کی ترتیب کے لحاظ سے بھی یہ نثری مرثیے بڑے اہم ہیں۔علمی، ادبی، تاریخی، صحافتی اور مذہبی اعتبار سے ان مرثیوں کی حیثیت ایک ایسے دستاویز کی ہے جس میں ہندوستان کی عظیم شخصیات اور مشاہیر علم و فن کی ذات و صفات کو اختصار و جامعیت کے ساتھ سپرد قلم کیا گیاَ ہے۔مولانا کو چونکہ انسانی نفسیات اور شخصیات کے اسرار و رموز سے واقفیت تھی اسی وجہ سے انسانی جذبات کے اظہار پر انھیں قدرت حاصل تھی۔جس کی بدولت یہ نثری مرثیے حقیقت و فطرت سے قریب تر ہوگئے ہیں۔وفیات ماجدی سے چند حصے ملاحظہ ہوں۔

مولانا ماجد نے اپنے بڑے بھائی کا تعزیتی مرثیہ ’ناز بردار بھائی‘ کے عنوان سے لکھا ہے۔اس مرثیے میں مولانا کے ذاتی غم اور دلی جذبات کا اظہار ہر لفظ سے ہو رہا ہے۔اس مرثیہ کا ایک حصہ نقل کیا جا رہا ہے۔

”حقیقی بھائی میرے ایک ہی تھے۔سن میں مجھ سے آٹھ سال بڑے، نام عبدالمجید، سال ولادت غالباً آخیر ۱۸۸۴ء۔...۲۰ دسمبر (دوشنبہ) کو انھیں اچھا خاصہ چھوڑ کر دو پہر کی گاڑی سے میں دریاباد واپس آیا۔حسب معمول خدا حافظ کہہ کر مجھے رخصت کیا (کون جانتا تھا کہ اس عالم ناسوت میں ان کی زبان سے یہ بالکل آخری لفظ میرے کان میں پڑیں گے؟) شب تک اپنے معمولات روز مرہ کے مطابق پورے ہوا کیے۔ایک پاکستانی عزیز رخصت ہونے آئے۔آٹھ بجے تک ان سے گفتگو کی۔نو بجے حسب معمول سونے لیٹے۔ڈھائی بجے شب کو متصل لیٹے ہوئے منجھلے لڑکے کو اٹھا کر کہا اس وقت سانس کی تکلیف زیادہ ہے۔اس کے بعد کہا ’یا اللہ رحم‘ (لفظ اللہ کو تکلیف کی حالت میں خوب کھینچ کر ادا کرتے تھے) انھوں نے دوا پلائی۔اس کے بعد نیم سجود کی حالت میں تکیہ پر سر رکھ کر لیٹ گئے یہ سمجھے کہ شاید سو گئے جب کچھ منٹ

تک کراہنے اور سانس لینے کی آواز نہ آئی تو انھیں فکر ہوئی اور انھوں نے جا کر اپنے بڑے بھائی حکیم عبدالقوی کو جگایا انھوں نے آ کر دیکھا تو نبض ڈوب چکی تھی ہل چل مچ گئی دوسرے لوگوں نے بھی آ کر دیکھا ایک دوسرے طبیب کو بھی لا کر دکھایا گیا وہاں اب کیا تھا۔ بندہ اپنے مولا کے پاس پہنچ چکا تھا۔....دو بجے کے بعد جنازہ اٹھا اور راہ میں صدہا مومنین نے کاندھا بدلتے ہوئے عیش باغ کے مشہور قبرستان میں پہنچا دیا.....ہر علمی کام کے لیے بڑی ضرورت خانگی سکون کی ہوتی ہے اور میں شہادت دیتا ہوں کہ میری خانگی زندگی کے سکون میں بڑا دخل میرے اس مرحوم و ناز بردار بھائی کو تھا۔''[1]

مولانا ماجد نے اپنی بہن کے موت پر 'ہمشیر کی رخصتی' کے عنوان سے مرثیہ لکھا ہے۔ جس میں ان کا لہجہ درد و غم میں ڈوبا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ایک ایک جملے سے خلوص دلی وابستگی اور جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔

''ماں کی خالص بے غرض و بے لوث محبت کا اگر کہیں نشان ملتا ہے، تو بہن ہی کی ذات میں ہر بہن رکھنے والا اس کا تجربہ رکھتا ہے۔ اللہ نے آج وہ نعمت واپس لے لی۔ نعمت کا حق اتنے دنوں کب ہوا تھا جو اب کبھی آئندہ اس کی امیدیں قائم کی جاتیں۔ ہمشیر کی رخصتی ایک شادی کے وقت ہوئی ہے اور ایک یہ۔ وہ مجاز اور یہ حقیقت! عقلاً صبر کے کیا معنی، تسلیم و رضا داخل ایمان ہے لیکن طبعی حزن و غم پر بس نہیں زندگی میں جو مستقل خلا پیدا ہو گیا ہے وہ زندگی بھر کے لیے ہے۔ صدق کے پڑھنے والے بھائی اور بہن اگر کوئی ہمدردی محسوس کریں تو بجائے تعزیت نامہ پر وقت صرف کرنے کے، وہیں اپنی جگہ دعائے خیر فرمائیں اور اگر ہو سکے تو کچھ قرآن پاک جس قدر بھی آسانی سے پڑھ سکیں مرحومہ کو بخش دیں۔ غم اور طبعی غم میں، غم آفریں نے لذت بھی بلا کی رکھ دی! اور قلب کی قساوت کا تو اس سے بڑھ کر کوئی علاج ہی نہیں۔ کاش اسی کے اثرات میں پائیداری ہوتی! عجب شان حکمت ہے، اور جمال میں کمال، کہ نعمت دیتے

---

[1] وفیات ماجدی یا نثری مرثیے: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۲۶-۲۹-۳۰-۳۱

ہیں تو ہنسا کر اور عارضی طور پر واپس لیتے ہیں تو رلا کر۔ جسم کی لذت اس میں، روح کی حلاوت اس میں!''[۱]

اپنی اہلیہ کے انتقال پر مولانا نے 'بوڑھی محبوبہ' کے عنوان سے بہت ہی پر درد مرثیہ لکھا ہے۔ مولانا کی ذہنی، فکری و قلبی کیفیت کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے۔

''جون ۱۹۱۶ء میں اس تباہ کار کے عقد ازدواج میں آئی تھی۔ ۵۲ر سال کی مدت رفاقت کچھ تھوڑی نہیں ہوتی جب کہ رفاقت محض رسم و ضابطہ کی نہ ہو بلکہ اس کی بنیادیں الفت و محبت پر قائم ہوئی ہوں! پیمان وفا عمر بھر کا تھا لیکن خود عمر کی پائیداری کتنی!.... خدمت قرآن یا خدمت صدق وغیرہ کے سلسلہ میں اگر کوئی بھی خدمت دین کسی درجہ میں بھی قابل قدر تیری نظر میں مجھ بے مایہ و تباہ کار سے بن پڑی تو وہ ہرگز مجھ سے نہ بن پڑتی اگر وہ خانگی سکون قلب مجھے حاصل نہ ہوتا جو تیری اس بندی کے طفیل میں مجھے نصیب ہوا۔ .... اس بندی کے اٹھ جانے سے مجھے یقیناً قدرۃً متعدد تکلیفیں اور بے چینیاں ہیں اور میں اس پر ہرگز خوشی سے آمادہ نہیں، لیکن اگر تیری مرضی اسی میں ہے تو میں ایک بار نہیں ہزار بار اس پر راضی اور عقلاً وارادتاً شائبہ بھی کسی ناخوشی اور ناگواری کا اپنے دل میں نہیں لاتا۔''[۲]

مولانا نے اپنے ایک نوکر محبّ علی کا مرثیہ 'ایک خدمت گار کی یاد میں' لکھا ہے۔ اس مرثیہ سے مولانا کی اعلیٰ ظرفی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

''پیدائش ۱۹۰۱ء کی عمر کے ۵ر سال ہماری ڈیوڑھی پر ادنی معاوضہ پر گزار دیے۔ انتہائی اخلاص، دیانت داری، وفاداری، ہوا خواہی اور نمک حلالی' کے ساتھ (یہ آخری لفظ بھی آقاؤں اور آقازادوں کے لغت کا ہے) جان ۲۱ رمضان (۲۷ جون) یوم چہار شنبہ کی شام کو ساڑھے آٹھ بجے جب مسلمان عشاء کی اذانیں دینے اور تراویح میں قرآن سنانے میں لگے ہوئے تھے، جان

---

۱ وفیات ماجدی یا نثری مرثیے: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص:۳۳

۲ ایضاً: ص:۳۴۔۴۱

آفرین کے سپرد کردی۔ خدمت گار کا آقا صرف ایک نہیں ہوتا۔ گھر کی مالکہ، آقازادوں اور آقازادیوں ان کے بھائی بھتیجوں سب کی رضا جوئی یکساں اس پر واجب ہوتی ہے اس امتحان میں پورا اترنا پہاڑ سے دودھ کی نہر کاٹ کر لانا ہے۔
.....ساری رات کسی طرح گزری غسل وغیرہ کا انتظام صبح شروع ہوا جب تختہ پر لٹایا اور سب کپڑے اتار لیے گئے تو آنکھوں نے اس جسم کا نظارہ کیا جو سوکھ کر محض ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا (جیسا کہ ڈاکٹری کتابوں میں اٹانومی کے نقشے ہوتے ہیں) اور زبان اپنے کو نہ روک سکی پکار کر آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز میں کہا کہ ''یہ وہی چہرہ ہے جو ابھی کل تک ساری قوتیں ساری توانائیاں ایک میری خوشنودی کے لیے وقف کیے ہوئے تھا خود بڑی بڑی بےچینی اٹھائی کہ میں نہ بے چین ہونے پاؤں یہ ہاتھ وہ ہیں جو چوبیس گھنٹے میری ہی خدمت کے لیے وقف رہتے تھے ان پر بچپن میں خدا معلوم کتنی بار قمچیاں پڑی ہوں گی اور آج بھی کتنی بار ان کا بیجا استعمال میری ذات سے ہوا ہوگا اور یہ سوکھی ہوئی ٹانگیں اور پنڈلیاں اور یہ متورم پیر خدا معلوم کتنی بار میری وجہ سے دوڑے ہوں گے تھکے ہوں گے۔''[1]

سید سلیمان ندوی کا مرثیہ 'سید الطائفہ' کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس میں مولانا ماجد نے سید سلیمان ندوی کے آخری ایام کی ذہنی وفکری حالات اور مصروفیات کو بیان کرتے ہوئے ان کے انتقال پر ملال پر اشک بار قلم سے لکھا ہے۔

''آخر آخر میں تصوف بہت غالب آگیا تھا حکیم الامت امام طریقت تھانویؒ کا آخری زمانہ تھا کہ ان سے عقیدت پیدا ہوئی اور والہانہ حد تک پہنچ گئی۔ بیعت ہوئے اور مرشد انور میں ایسا جذب ہوئے کہ ایک لفظ فنا فی الشیخ جو مدت سے سننے میں آرہا تھا اس کا عملی نمونہ پیش کر دیا۔ تصنیفی، تحریری، تقریری یہ سارے ذوق کم ہوتے گئے اور اسی نسبت سے وقت اوراد واذکار کی نذر ہونے لگا۔ نیند طبعی طور پر زائد تھی لیکن ہم بےتکلف قدیم نیازمندوں کو دیکھ کر حیرت

---

[1] وفیات ماجدی یا نثری مرثیے: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۵۵-۵۶

ہوگئی کہ اسی سن کو پہنچ کر اس پر پوری طرح قابو پالیا اور شب بیداری کوئی بات ہی نہ رہ گئی۔ خدا ترسی، نرم مزاجی، تواضع، فروتنی پہلے ہی سے تھی اور مروت کے تو گویا پتلے ہی تھے۔ تصوف کے اثر نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ آخر عمر میں صدمات بھی کچھ ایسے برابر پہنچتے رہے جن کا مقصود تکوینی انانیت شکنی اور نفس میں شکستگی، تضرع وابتہال کی کیفیت پیدا کر دینا تھا اور اس پر حیرت ذرا بھی نہ کیجیے کہ رسولؐ کا یہ سیرت نگار اور دین کا دیرینہ خادم جب ۶۸ رسال کی عمر میں ۲۲ رنومبر ۵۳ء کو اپنے وطن حقیقی کو روانہ ہوا ہے تو نماز مغرب پڑھے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی اور عالم ناسوت میں جو بالکل آخری عمل، قصد واختیار سے ہوش وحواس میں صادر ہوا ہے وہ عمل نماز ہی تھا۔'' [۱]

بابائے قوم مہاتما گاندھی کا مرثیہ 'شہید حق پرستی' کے عنوان سے لکھا ہے۔ گاندھی جی پر لکھا گیا مولانا کا یہ مرثیہ مختصر مگر جامع ہے۔ اس میں بابائے قوم کی سیرت وشخصیت، نظریات وخیالات اور شہادت کو پرخلوص اور پرتاثیر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ زبان وبیان اور مہاتما گاندھی کی شخصی عظمت کا اعتراف مولانا نے اس طرح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

گاندھی جی رخصت ہوگئے، دنیا جنھیں مہاتما اور دیوتا سروپ اور خدا معلوم کن کن تعلیمی ناموں سے پکارتی تھی، اپنے ملک، اپنی قوم سے دم کے دم میں ہمیشہ کے لیے جدا ہوگئے۔ وہ کسی گورے کے سنگین سے نہیں، کسی پاکستانی کی تلوار سے نہیں، ایک ہندوستانی ننگ ہندوستان، ہندوستانی ہی گولی کے فیر سے ہلاک ہوگئے، ایسی موت کو موت نہیں شہادت کہتے ہیں۔ شہادت اصطلاحی نہیں، شہادت جو حق پرستی کی راہ میں مظلوموں کی حمایت ونصرت کی راہ میں نصیب ہوتی ہے! سفاک قاتل کی گولی اس مشت خاک کے جسم پر نہیں چلی،

---

[۱] وفیات ماجدی یا نثری مرثیے: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۸۵۔۸۶

عین انسانیت کے سینے کو چھلنی کر گئی۔! .....مسلمانوں کی جان، ایمان اور عزت، مال سب کی حفاظت وہ اپنا دھرم سمجھے ہوئے تھے۔ بے گھر مسلمانوں کو پھر سے وہ گھروں میں آباد کرا رہے تھے۔ ہزارہا لاکھوں نیم جان مسلمانوں میں از سر نو جان وہی ڈال رہے تھے جان انھیں مسلمانوں کی ہمدردی میں اور مسلمانوں ہی کی جانیں بچاتے ہوئے انھوں نے دے دی، اپنے کو قربان کر دیا تا کہ مسلمان محفوظ رہیں۔ آج جب وہ اپنے خون بہتے ہوئے جسم اور فاقہ سے زارو نزار بدن کے ساتھ اپنے مالک و مولی کے حضور میں حاضر ہوں گے تو عجب نہیں کہ فرشتوں نے بہ ادب بارگاہ قدس میں عرض کی ہو کہ دل کے اندر کے عقائد کا حال تو حضور والا ہی جانیں اتنی شہادت ہم اور ہمارے ساتھ ناسوت کے بے شمار بندے بھی دے رہے ہیں کہ اس وقت آپ کی توحید کے پرستاروں اور آپ کے حبیبؐ کی امت کا سینہ سپر سب سے بڑھ چڑھ کر یہی بندہ تھا۔ اور جس جرم میں یہ قتل ہو کر آیا ہے، وہ بجز مسلم دوستی کے اور کچھ نہ تھا۔''[1]

ڈاکٹر سالم سندیلوی نے اپنے مضمون بعنوان 'مولانا عبدالماجد دریابادی کے نثری مرثیے' میں مولانا کے نثری مرثیوں کے متعلق اس طرح اظہار خیال کیا ہے۔

''مولانا عبدالماجد دریابادی کے مرثیے مختلف خصوصیات کے حامل ہیں۔ سب سے نمایاں خصوصیت ان مرثیوں کی یہ ہے کہ ان میں رثائی کیفیات بھرپور طریقے سے موجود ہیں اور یہی عناصر ان مرثیوں کی کامیابی کے ضامن ہیں۔ اس کے علاوہ یہ مرثیے !انشا پردازی کے بھی اعلی نمونے ہیں۔ ان میں کہیں کہیں منظر نگاری بھی اپنی ساری رعنائی اور دلربائی کے ساتھ موجود ہے۔ بہر حال مولانا عبدالماجد صاحب نے نثر میں بہت کامیاب مرثیے لکھے ہیں جن کو ہم اردو کے ادب العالیہ میں اعلی مقام دے سکتے ہیں۔''[2]

---

[1] وفیات ماجدی یا نثری مرثیے: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۱۴۲۔۱۴۳

[2] مولانا عبدالماجد دریابادی کے نثری مرثیے (مضمون) سلام سندیلوی: فروغ اردو: (عبدالماجد نمبر) اگست تا اکتوبر ۱۹۷۱ء لکھنو ص: ۲۱۳

اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں

مولانا ماجد دریا بادی نے اردو کے باکمال اور مصلح شاعر ظریف حضرت اکبر الہ آبادی کے فکر و فن پر تنقیدی مضامین لکھ کر ان کے کلام کی قدر و قیمت کا اعتراف کیا ہے اور ان کی ادبی عظمت کو ظاہر کیا ہے۔ یہ مضامین 'اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں' کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ مولانا ماجد اور اکبر الہ آبادی کے درمیان خلوص و محبت کا رشتہ تقریباً دس سالوں تک قائم رہا۔ مولانا نے اکبر کی صحبت اور تربیت سے کسب فیض کیا تھا۔ الحاد سے مذہب کی طرف واپس لانے میں اکبر کی کاوشوں اور محبتوں اور سرپرستیوں کا بڑا دخل ہے۔ مولانا ماجد نے کلام اکبر کو زبان اکبر سے سنا اور سمجھا تھا، اس اعتبار سے مولانا ماجد کلام اکبر کے معتبر و مستند ناقد و شارح ہیں۔ اکبر پر لکھے گئے مولانا ماجد کے یہ مضامین ادبی اور تنقیدی نوعیت کے ہیں۔ بعض مقامات پر مولانا نے اپنے باہمی تعلق اور رشتے کو تاثرات، تجربات کی روشنی میں بیان کیا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ حصہ سوانح سے قریب تر معلوم ہو گیا ہے۔ گرچہ اکبر نامہ کو با قاعدہ سوانحی تصنیف نہیں قرار دیا جا سکتا ہے، پھر بھی اس میں جا بجا اکبر کے سوانحی خاکے اور گھریلو اور نجی حالات کا تذکرہ ملتا ہے۔ جس کی وجہ سے اکبر کی شخصیت اور سیرت پر روشنی پڑتی ہے۔ مولانا ماجد کے یہ مضامین اکبر کی شخصیت اور ان کے فن کی تفہیم میں کلیدی حیثیت کے حامل ہیں۔ چونکہ اکبر نامہ تنقیدی نوعیت کی تصنیف ہے، اس لیے اس کا مفصل تذکرہ باب سوم میں مولانا ماجد کی تنقید کے حوالے سے کیا جا چکا ہے۔ اس لیے اس باب میں 'اکبر نامہ' پر اظہار خیال نہیں کیا جا رہا ہے۔

باب پنجم

عبدالماجد دریابادی کی صحافتی خدمات

مولانا عبدالماجد دریابادی ہمہ جہتی صفات وشخصیات کے مالک تھے۔ انشاوادب کے ساتھ ساتھ انھوں نے صحافت کے میدان میں بھی اپنے تابندہ ودرخشندہ نقوش چھوڑے ہیں۔ مولانا کا صحافتی نقطہ نظر پیشہ وارانہ یا تجارتی ہونے کے بجائے اصلاحی وتبلیغی تھا۔ ان کی صحافتی زندگی کا باقاعدہ آغاز ۱۹۲۵ء سے ہوا، اور انتقال سے چند ماہ قبل تک جاری رہا۔ تقریباً نصف صدی تک مولانا کا بے باک صحافتی قلم اپنے جوہر دکھاتا رہا، اور ملک وقوم کی تعمیر وترقی میں مصروف رہا۔ صحافت گرچہ حصول زر کا ذریعہ بھی ہے۔ لیکن مولانا نے اپنے قلم اور ضمیر کا سودا کبھی نہیں کیا۔ بلکہ بلا خوف وتردد حقائق کی پاسداری کرتے رہے، اور دنیاوی نقصانات اور لعن وطعن کو برداشت کرتے رہے۔ انھوں نے بہت سی علمی وفکری لڑائیاں بھی لڑیں، اور معاصرین سے قلمی معرکے بھی کیے۔ مشرقی تہذیب وتمدن کی بازیافت اور تبلیغ کا فریضہ بھی انجام دیتے رہے، اور مغربی تہذیب کی ناپائداری، سطحیت اور نقائص کو بھی عوام کے سامنے اجاگر کرتے رہے۔ ان کے نزدیک صحافت خدمت خلق اور عبادت کی ایک قسم تھی۔

مولانا ماجد کو مضمون نویسی سے دلچسپی بچپن ہی سے تھی۔ معاصر اردو اخبارات ان کے گھر میں آتے تھے، جس کی وجہ سے ان کی اردو صحافت اور مضمون نگاری سے دلچسپی روز بروز بڑھتی گئی۔ مولانا کا پہلا مضمون ۱۱ رسال کی عمر میں فرضی نام سے شائع ہوا۔ مولانا اپنی خودنوشت میں اپنے زمانے کے اخبارات کی صورت حال اور اپنے ابتدائی مضامین کی اشاعت کے متعلق لکھتے ہیں۔

> ''اخباروں رسالوں کے نام سے اس سن میں بھی ناآشنا نہ تھا، پیسہ اخبار (ہفتہ وار) اودھ اخبار (روزنامہ) ریاض الاخبار (سہ روزہ) اودھ پنچ (لکھنو) ماہنامہ معارف (علی گڑھ) ماہنامہ دلگداز (لکھنو) علی گڑھ میگزین اور انگریزی کے ایڈوکیٹ (لکھنو) پنجاب آبزرور (لاہور) اور پانیر (الہ آباد) میں سے بعض گھر ہی میں آتے تھے، اور بعض کی شکلیں دیکھ چکا تھا

سن ۱۹۰۰ء کا اخیر سن ۱۹۰۱ء کا شروع تھا کہ اردو اخباروں میں مضمون علی گڑھ کے 'روشن خیالوں' کی طرف سے مسائل اسلام کی ترمیم وتصحیف میں چھپنے شروع ہوگئے ، کسی نے کہا کہ عورتوں کو بھی پورے حق مرد کے برابر ملنے چاہیے کسی نے کہا کہ قانون وراثت قابل ترمیم ہے، ساری جائداد اولاد اکبر کو ملنا چاہیے۔ کسی نے کہا قرآن کے احکام معاملات کو حصہ عقائد سے بالکل الگ کر دیا جائے ، اس وقت تجدد کی یہ پیش قدمی بڑی ہی 'سنسنی خیز' اور صبر آزما تھی ، مذہبی دنیا میں ایک ہلچل سی مچ گئی ، لیکن جواب لکھنے کی ہمت کمتر ہی کسی کو ہوئی ۔ میں ساتویں کا طالب علم تھا، اور عمر کے گیارہویں بارہویں سال میں ، جوں توں کر کے خود ہی جواب لکھا اور کسی فرضی نام سے 'اودھ اخبار' میں (کہ وہی اس وقت صوبہ کا سب سے نامور اردو روزنامہ تھا) چھپنے کو بھیج دیا۔ اور اب کیا بیان ہو کہ کتنی خوشی اس وقت (سن ۱۹۰۱ء میں) اپنا پہلا مضمون چھپا ہوا دیکھ کر ہوئی۔ .... پہلے مضمون کا نکلنا تھا کہ جھجک مٹ گئی اور ہیاؤ کھل گیا ، سال چھ مہینے کے اندر اندر دوسرا نکلا ، اور پھر تیسرا ، سلسلہ قائم ہوگیا۔ زیادہ تر اسی اودھ اخبار میں مضمون بالعموم 'نیچریوں' کے رد میں ہوتے ، والد صاحب مرحوم انجمن اسلامیہ سیتا پور کے صدر بھی تھے ، ایک بار کسی نے ان پر اعتراض جڑ دیا میں نے اس کا جواب تڑ سے دیا اور جواب الجواب کا لمڈ ورا فریقین کی طرف سے ہفتوں مہینوں بڑھتا رہا۔ مضمون بدستور گمنام ہی رہتے اور لوگوں کو حیرت رہتی کہ لکھنے والا ہے کون؟ عجب تماشہ ہوتا کہ ادھر والد صاحب اور ان کے ہم نشین گمنام مضمون نگاری کی داد دے رہے ہیں ، اور ادھر میں کواڑ کی آڑ سے کان لگائے سن رہا ہوں ، اور اندر ہی اندر نہال ہوا جا رہا ہوں ! ہائے وہ کم سنی کی معصومانہ خوشیاں !''[1]

مضمون نگاری ، ترجمہ نگاری اور تصنیف وتالیف کے بعد مولانا نے صحافت کے میدان میں قدم

---

[1] آپ بیتی : مولانا عبدالماجد دریابادی : ص : ۲۰۶ ۔ ۲۰۷ ۔ ۲۰۸

رکھا، اوراس میں اپنے لیے ایک نمایاں مرتبہ حاصل کیا۔انھوں نے ہمدرد، حقیقت وغیرہ کی نگرانی کی۔
پھراپنے تین ہفتہ واراخبار نکالے جن کا تعارف پیش کیا جارہا ہے۔

سچ

جنوری ۱۹۲۵ء میں مولانا نے باقاعدہ طور پر اپنی صحافت کا آغاز کیا، اور لکھنو سے ایک اردو ہفت روزہ 'سچ' نام سے ظفرالملک علوی، مولانا عبدالرحمٰن ندوی نگرامی کے ساتھ مل کر جاری کیا۔ سچ اخبار کے منیجر ظفرالملک تھے، اور اڈیٹری میں پرچہ پر نام ان کا بھی نکلتا تھا۔لیکن عملا ادارت عبدالرحمٰن نگرامی اور مولانا دریابادی کے ہاتھ میں تھی۔عوام وخواص میں شہرت ومقبولیت کے باوجوداس پرچے کے خریداروں کی تعداد اطمنان بخش نہ ہوسکی کچھ عرصہ کے بعد مختلف وجوہ سے ظفرالملک صاحب نے اڈیٹری سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور ہفتہ وار سچ کی ترتیب کی پوری ذمہ داری مولانا ماجد صاحب کے سرآ گئی، اوراگست ۱۹۳۵ء سے صرف ان کا نام مدیر کی حیثیت سے شائع ہونے لگا۔اس پرچے کی ادارتی ذمہ داری قبول کرنے کے بعد مولانا نے اسے اپنے طرز پر نکالنا شروع کردیا۔انگریزی اخبارات مانچسٹر گارجین، ویسٹ منسٹر گزٹ وغیرہ سے بھی مدد لیتے تھے، یہ اردو اخبارات اور صحافت کی دنیا میں ایک نئی چیز ثابت ہوئی۔یہ اخبار عام فہم زبان اور مضامین کے اعلی معیار وتنوع کی وجہ سے جلد ہی مشہور ومقبول ہوگیا۔شروع شروع میں اس پرچے نے اصلاح معاشرہ اور رسوم وبدعات وغیرہ کے خاتمے پر خاص توجہ دی جس کی وجہ سے اہل بدعت نے اس اخبار کی مخالفت کی۔اس کے علاوہ بعض دوسرے طبقوں کی مخالفت اور دشمنی کا سامنا بھی اس اخبار کو کرنا پڑا۔لیکن یہ پرچہ ہمیشہ صداقت اور ایمانداری اور غیر جانب داری کا علم بردار رہا۔
مولانا ماجد ہفتہ وار سچ کے متعلق لکھتے ہیں۔

> ''سچ کو اپنی زندگی میں بڑی بڑی لڑائیاں لڑنا پڑیں۔آج اس سے جنگ ہے تو کل اس سے۔شروع شروع توجہ اصلاح ورسوم ورد بدعات پر زیادہ تھی۔اس لیے قدرۃ اہل بدعات بھی زیادہ ناخوش رہے، پھر بعض اور طبقوں کی بھی دشمنی مول لینا پڑی۔پھر ستمبر ۲۵ء میں شریفی سعودی آویزش سرزمین حجاز میں شروع ہوئی سچ نے سعودیوں کی پہلے تو حمایت کی، اور کئی مہینہ بعد ان پر نکتہ

چینی شروع کی، پہلے وہ وہابیوں کا ترجمان سمجھا گیا، بعد کو 'بدعتیوں' کا پشت پناہ۔
ایک مدت تک شیعہ حضرات اسے اپنا حریف ومعاند سمجھتے رہے، تجدد 'ترقی
پسندی' کا مقابلہ وہ ہر محاذ پر کرتا رہا، اور جمود کا بھی حامی وہ کبھی نہ رہا، فتنہ انکار
حدیث کا مقابلہ اس نے مدتوں کیا اور ۳۱ء و ۳۲ء میں تو اس نے نیاز فتح پوری
کے الحاد اور فتنہ نگار کے مقابلہ کے لیے مہینوں اپنے کو وقف رکھا۔ نظریات
خلافت کی بھی تبلیغ وہ مدت دراز تک کرتا رہا، حالانکہ خود تحریک خلافت ۲۵ء ہی
میں بالکل مردہ و بے جان ہو چکی تھی۔ زبان شروع شروع میں 'عوامیت' کی سطح
پر قصداً لے آئی گئی تھی، یہاں تک کہ اس کی اردو پر لوگوں نے پھبتی 'کانگریسی
اردو' کی کس ڈالی، بعد کی زبان شستہ و نستعلیق اختیار کر لی گئی۔''[1]

مولانا ماجد اپنے آبائی وطن دریاباد میں رہ کر سچ کی ترتیب دیا کرتے تھے۔ اس اخبار کی پیشانی پر
شیخ سعدی کا یہ شعر۔

راستی موجب رضائے خداست
کس ندیدم کہ گم شدا راہ است

درج ہوتا تھا کچھ دنوں کے بعد یہ آیت ربانی بھی پہلے صفحے پر نقل کی جانے لگی۔ '**الذی جاء بالصدق وصدق به اولئك هم المتقون**' اس اخبار کے پہلے صفحے پر 'سچی باتیں' کے
عنوان سے ایک مستقل کالم شایع ہوتا تھا۔ جس کی حیثیت اداریہ کی تھی۔ اس کالم کا سلسلہ بعد کے اخبارات
صدق اور صدق جدید میں بھی جاری رہا۔ سچی باتیں میں دینی، علمی سماجی، ثقافتی اور عصری موضوعات پر
شگفتہ اور سلیس انداز میں موعظت وحکمت کے سبق آموز واقعات وحکایات عام فہم الفاظ میں بیان ہوتے
تھے۔ ہندو پاک کے متعدد اخبارات وجرائد میں سچی باتیں نقل کی جاتی تھیں، اور مذہبی و دینی حلقوں میں
بھی اس کالم کو پڑھ کر سنایا جاتا تھا۔ مولانا کا یہ کالم موضوع اور مواد کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ 'سچی
باتیں' کا انتخاب پہلی مرتبہ کتابی شکل میں دکن پبلشرز حیدرآباد نے ۱۹۴۲ء میں شایع کیا۔ اس کالم کو کتابی
شکل میں دوسری مرتبہ 'سچی باتیں' (جلد اول) کے عنوان سے نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی صاحب نے

---

[1] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۲۲۱۔۲۲۲

ترتیب دے کر صدق فاؤنڈیشن لکھنو سے ۲۰۰۰ء میں شایع کرایا۔ 'عرض مرتب' کے عنوان سے سچی باتیں کی علمی وادبی اہمیت وافادیت کا اعتراف نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

''سچ کے دوسرے شمارے (۹ جنوری ۱۹۲۵ء) ہی سے مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے شہرہ آفاق کالم 'سچی باتیں' کا آغاز کیا۔ مولانا کا یہ افتتاحی کالم اتنا مقبول اور مشہور ہوا کہ بلاشائبہ تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ بیسویں صدی کی اردو صحافت میں اس کی مثال نایاب تو نہیں کمیاب تو ضروری ہے۔ اس کالم کا سلسلہ مولانا کی وفات (٦ جنوری ۱۹۷۷ء) سے کچھ عرصہ قبل تک جاری رہا۔ مولاناؒ کی یہ سچی باتیں دینی، اخلاقی، علمی ادبی، فکری، تہذیبی، تاریخی، سیاسی اور معاشرتی موضوعات کی جامع ہوتی تھیں۔ ان میں فکروتدبر اور تذکیر وموعظت کے ایسے بیش قیمت عناصر شامل ہوتے تھے کہ اس زمانے کے موقر اخبارات وجرائد، بڑی اہمیت کے ساتھ انھیں اپنے ہاں نقل کرتے تھے۔ مختلف زبانوں میں ان کا ترجمہ ہوتا تھا، مسجدوں میں اور اصلاحی جلسوں میں انھیں پڑھ کر سنایا جاتا تھا، مولانا دریابادیؒ قرآن مجید، سیرت نبوی، اسوہ صحابہ اور حالات صوفیہ سے عموماً وہ گوشے منتخب کر کے 'سچی باتوں' میں شایع کرتے تھے جن کی روشنی میں عہد حاضر کے مسلمانوں کی رہبری کا فرض انجام دیا جاسکے۔ مولاناؒ کی یہ 'سچی باتیں' ان کے کردار اور رجحانات ومیلانات کی عکاس ہوتی تھیں۔''[۱]

'سچی باتیں' سے چند اقتباسات نقل کیے جارہے ہیں تاکہ اندازہ کیا جاسکے کہ مولانا نے کس طرح صحافت کے ذریعہ اصلاح معاشرہ اور قوم وملت کی تعمیر وترقی کا کارنامہ انجام دیا ہے۔

''آپ کو تارک الدنیا زاہد بن جانے کی ہرگز ضرورت نہیں۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ جب شب کو آپ نرم وگداز بستر پر آرام فرمانے کے لیے لیٹیں، تو ذرا اس کا بھی خیال کریں کہ آپ کی بستی میں کتنے اللہ کے بندے ایسے بھی ہوں گے، جنھیں رزق کا ایک دانہ بھی نصیب نہ ہوا ہوگا، اور جو بھوک کی

---

۱ سچی باتیں (جلد اول): مرتب نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی: ص: ٦۔٧

شدت سے ساری رات کروٹیں لے لے کر صبح کر دیں گے! نئی اور پر تکلف پوشاک جب آپ زیب تن کرنے لگیں تو ذرا یہ بھی سوچ لیں کہ آپ ہی کے بھائی بند کتنے ایسے بھی ہوں گے، جنھیں اپنے جسم کو ڈھکنے کے لیے، آپ کے جسم کی اتارن بھی نصیب نہیں! جب آپ اپنے بچوں کو ہنستے کھیلتے دیکھ کر خوش ہو رہے ہوں، اس وقت ذرا یہ بھی یاد کر لیں، کہ آپ کے پڑوس میں کوئی ایسا بے کس یتیم تو نہیں، جو ماں باپ کے سایہ سے محروم ہو کر ہر شخص کی جانب حسرت سے منھ تکنے ہی میں اپنی زندگی کے دن کاٹ رہا ہے! بستی کے ایک فرد کی بھی خدمت، محلّہ کے ایک محتاج کی بھی حاجت روائی، برادری کے ایک دکھیارے کی بھی اشک شوئی اگر قبول ہو گئی تو آپ کی دنیا و عقبیٰ دونوں سدھر گئیں۔''[۱]

''یقین رکھیے اور بلا شائبہ شک یقین رکھیے، کہ کوئی غیر مذہب والا آپ کے ہاں کی کتابوں کی الٹ پلٹ اس غرض سے نہیں کرے گا۔ وہ آپ کی لکھی ہوئی کتابوں کو نہیں، خود آپ کو پڑھے گا۔ وہ مطالعہ کتابوں کا نہیں، زندہ کتابوں کا کرے گا۔ درخت کے بیج کو اس کے پھل سے پہچانا جاتا ہے، تخم کی تحقیق کے لیے کوئی ماہر فن باغبانی کے پاس نہیں جاتا رسولؐ کی سیرت کا اندازہ امت کی حالت سے کیا جاتا ہے، اور کیا جائے گا۔ اب ارشاد ہو، اور ارشاد کسی دوسرے سے نہیں، خود اپنے ہی دل سے ارشاد ہو، کہ آپ کی زندگی، آپ کا طرز عمل، آپ کا کردار، آپ کی عادتیں اور خصلتیں، آپ کے مشغلے اور دلچسپیاں، آپ کا مذاق طبعیت، آپ کی سیرت، منکروں کے دل میں آپ کے رسول پاکؐ کی بابت رائے قائم کرائے گی؟ دوسرے اگر اپنی بے بصری کے باعث اس نور مجسم سے انکار کر رہے ہیں، تو کہیں خدانخواستہ خود آپ تو ان کے جرم میں اعانت کے مجرم نہیں بن رہے ہیں۔''[۲]

''آج آپ خوش ہو رہے ہیں، کہ آپ کی رسائی لاٹ صاحب کے

---

۱ سچی باتیں (جلد اول): مرتب نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی: ص:۱۱۶

۲ ایضاً: ص:۱۸۹۔۱۹۰

دربار تک ہے۔ وزیر صاحب آپ کے دوستوں میں ہیں ،کلکٹر صاحب آپ کو چائے پر مدعو کرتے ہیں ،حکیم صاحب اپنے مدرسہ طبیہ کے جلسوں کا صدر آپ ہی کو بناتے ہیں ،مولوی صاحب جمعہ کے واعظ میں آپ کی فیاضیوں کی تعریف کر چکے ہیں ،شاہ صاحب اپنے حلقہ میں آپ کے صاحب دل ہونے کو تسلیم فرما چکے ہیں ،ایڈیٹر صاحب آپ کی قومی خدمات کا اعتراف کر چکے ہیں، شاعر صاحب اپنے قصیدوں میں ،آپ کو حاتم دوراں ورسم وقت ،علامہ زماں ونوشیروان زمانہ ،سب کچھ ایک ہی وقت میں بنا چکے ہیں ۔'آج' آپ ان سب باتوں سے خوش ہور ہے ہیں ،لیکن 'کل' جب آپ کا معاملہ خلق سے نہیں خالق سے ،انجان سے نہیں ، جاننے والے سے پڑے گا ،اس وقت ان میں سے کسی سے بھی آپ کی بابت ووٹ طلب کیے جائیں گے؟ اس وقت آپ کے راز دار دوست آپ کے نوکر چاکر ،آپ کے بیوی بچے ، بلکہ خود آپ کے دل ودماغ ، ہاتھ پیر ،کان آنکھ ،سب بجائے 'اپنے' ہونے کے 'پرائے' نظر آنے لگیں گے ،اور آپ کے خدمت گزار نہیں ، بلکہ فطرت کی جانب سے آپ پر جاسوس ثابت ہوں گے !اس وقت پڑوس کی اندھی بیوائیں اور دکھیاری رانڈیں ،محلّہ کے ننگے اور بھوکے یتیم ،بستی کے گھناونے اپاہج اور کوڑھی ،شاید ایسے حقیر وذلیل نہ نکلیں ،جیسے آج معلوم ہور ہے ہیں!''[1]

ہفتہ وار سچ کے بیشتر مشمولات مولانا ماجد ہی کے لکھے ہوا کرتے تھے۔ جن میں حالات حاضرہ پر رائے اور مسائل وحقائق پر تبصرہ ہوا کرتا تھا۔ ان اخبارات کے شذروں کی سرخیاں بڑی منفرد اور جاذب نظر ہوا کرتی تھیں ،اوران میں اہل علم کے مقالے اور مراسلے بھی شایع ہوتے تھے۔ مذہبی اور ادبی کتابوں پر تبصرے اور دوسرے اخبارات کے منقولات بھی کبھی کبھی شامل اشاعت ہوتے تھے۔ کاروباری اشتہارات شایع نہیں ہوتے تھے۔'سچ' کا سب سے بڑا کارنامہ یہ مانا جاتا ہے کہ اس نے تعلیم یافتہ لوگوں کے دلوں میں مغربی تہذیب وتمدن کی سطحیت ، بے وقعتی اور تحقیر پیدا کی ۔جس کی وجہ سے قومی تحریکات اور ملی مفادات کو بڑا

---

[1] سچی باتیں (جلد اول) :مرتب نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی :ص:۱۹۸

فائدہ ہوا۔ سچ اور صاحب سچ اپنی بے باکی، حق گوئی اور ملی وقومی مفادات کے تحفظ اور پاسداری کی وجہ سے برطانوی حکومت کی نظروں میں کھٹکتے تھے۔ اسی وجہ سے جولائی ۱۹۳۰ء میں بعض مضامین کی اشاعت پر یوپی حکومت نے 'سچ' سے ضمانت طلب کرلی، جس کے جمع نہ کرنے کی وجہ سے تقریباً چار مہینے تک اس کی اشاعت موقوف رہی۔ اور نومبر ۱۹۳۰ء سے اس کی دوبارہ اشاعت شروع ہوئی۔ عوام وخواص کے اس محبوب پرچے کی اشاعت ملتوی آخر ۱۹۳۳ء میں اس وقت کی گئی، جب مولانا قرآن مجید کی انگریزی تفسیر نویسی میں مصروف ہوگئے تھے۔ تقریباً ایک سال کے توقف کے بعد جب ۱۹۳۴ء میں مولانا نے اس کی اشاعت کی کوشش کی، تو ظفرالملک صاحب اس کی اشاعت پر راضی نہ ہوئے، اس طرح یہ پرچہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ بنیادی طور پر سچ ایک علمی، مذہبی نوعیت کا پرچہ تھا، جس کا مقصد ومسلک کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی تبلیغ اور نشر واشاعت کرنا تھا۔ ہندو مسلم اتحاد اور مسلمانوں میں باہمی اخوت ومحبت پیدا کرنا اور ان کی اصلاح وتعمیر کے لیے یہ پرچہ ہمیشہ کوشاں رہا۔

بالعموم 'سچ' کی اشاعت جمعہ کو ہوتی تھی۔ کاغذ اور طباعت معمولی درجہ کی ہوتی تھی۔ حسن انشا، مواد اور فکری معنویت کی وجہ سے اس کو بڑی مقبولیت حاصل تھی۔ نو سال تک یہ پرچہ اپنے پورے آب وتاب اور آن بان کے ساتھ شایع ہوتا رہا۔ سچ کی تمام جلدیں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری، خدابخش پٹنہ لائبریری اور مولانا ماجد کے بھتیجے اور داماد عبدالعلیم قدوائی صاحب کے پاس محفوظ ہیں۔ نہرو میموریل تین مورتی ہاؤس نئی دہلی میں اس کی تمام جلدوں کی مائکروفلم موجود ہے۔ اس کے علاوہ کسی مخلص ومعتقد شائقین ادب اور بعض لائبریریوں میں بھی اس کی جلدیں موجود ہوسکتی ہیں۔ خدابخش لائبریری نے ہفتہ وار سچ کے توضیحاتی اشاریہ کو عبدالعلیم قدوائی صاحب سے مرتب کراکے شایع کیا ہے۔ قدوائی صاحب نے بڑی عرق ریزی اور جانفشانی سے اس کام کو بحسن خوبی انجام دیا ہے۔

سچ میں انشائے ماجدی کی دلآویزی کے ساتھ ساتھ مذہب اسلام کی صحیح تعلیم، وطن دوستی اور غیر جانب دارانہ تنقیدی نظریے موجود ہیں۔ سچ میں مشرقی ومغربی اخبارات ورسائل اور مفکرین وعلماء کی کتابوں سے ماخوذ صحیح معلومات قاری کے صحیح علم ودلچسپی کے لیے بڑے اہتمام سے شایع ہوتی تھیں۔ تعصّبات، ترجیحات اور ذاتی پسند وناپسند سے اوپر اٹھ کر حقائق وانصاف پسندی کے ساتھ مناقشوں اور مباحثوں کو شایع

کیا جا تا تھا۔اس پرچے کے متعلق عبدالعلیم قدوائی کی رائے بڑی مستند اور معقول معلوم ہوتی ہے۔

''سچ میں انشاء ماجدی کی دلآویزی کے ساتھ صحیح مذہب، وطن دوستی اور علم واخلاق کی مستند قدریں ملتی ہیں۔اس پرچہ نے اردو صحافت میں حق گوئی علم دوستی اور حقیقی تنقید کی نظیر قائم کی۔سلیس وعام فہم عبارت، بلیغ و برجستہ سرخیوں اور مصرعوں کے استعمال سے اس کا علمی واونچا رتبہ بہت بلند ہوگیا تھا۔اس کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ولایتی اخبارات ورسائل اور مذہبی وعلمی کتابوں سے اخذ کردہ صحیح معلومات پڑھنے والوں کوفراہم کی جاتیں تھیں اور ذاتیات وشخصیات سے الگ رہ کر انصاف وتوازن سے مباحثوں اور مجادلات میں حصہ لیا جاتا تھا۔''[۱]

جس زمانے میں 'سچ' کا اجراء ہوا اس وقت شمالی ہندوستان میں محرم، شب برات، زیارت قبور کے سلسلے میں بدعات اور خرافات کا عام چلن تھا۔تعلیمی تہذیبی اور اخلاقی اعتبار سے مسلم قوم پسماندگی اور جہل مرکب کا شکار تھی۔عورتوں کے شرعی حصہ دینے، عقد بیوگان اور تعدادازدواج کو معیوب سمجھنے اور شادی بیاہ فاتحہ وغیرہ میں فضول خرچی کے ساتھ غیر شرعی رسوم وروایات پر عمل کیا جاتا تھا۔'سچ' نے بڑی جرات مندی سے ان خرابیوں کے خلاف آواز بلند کیا، اور مسلمانوں کو صحیح راستہ دکھانے کی کوشش کی۔'سچی باتیں' سے ایک اقتباس جس میں مولانا نے شادی بیاہ کے فضول خرچی سے بچنے کی تاکید بڑے ہی نصیحت آمیز انداز میں کی ہے، ملاحظہ ہو۔

''اسراف کے پہلو کو چھوڑ کر بھی دیکھیے، تو کسی حیثیت سے ان رسموں کو آپ مفید پائیں گے؟ سرمایہ کی فراہمی میں کس قدر دقتیں اٹھانا پڑتی ہیں، کتنا ضروری کاموں کا ہرج ہوجاتا ہے، خواہ مخواہ قرض لینا پڑتا ہے، گھر کی جائیداد خطرہ میں پڑتی ہے، سودی دستاویز لکھ کر خدا کی سخت ترین نافرمانی کا عذاب مول لینا پڑتا ہے اور ان تمام زحمتوں اور گناہوں کے باوجود مہمان اور اہل برادری پھر بھی خوش نہیں ہوتے۔کوئی صاحب کھانے میں نقص نکالتے ہیں، کسی کو کپڑے زیور کی کمی پر اعتراض ہوتا ہے، کوئی صاحب بد انتظامی پر اعتراض کرتے ہیں۔'نقصان

---

[۱] مولانا عبدالماجد دریابادی حیات وخدمات: عبدالعلیم قدوائی: ص:۱۵۲

مایہ تو پوری طرح ہوتا ہی ہے ساتھ ہی ’شماتت ہمسایہ‘ کا بھی پورا حصہ مل جاتا ہے۔
کیا ایسی شادیاں کبھی آئندہ چل کر باعث برکت ثابت ہو سکتی ہیں؟‘‘[۱]

شریعت وطریقت فقہ وتفسیر کے ساتھ مولانا مناظر قدرت اور دنیائی خبروں سے حکمت ودانائی کی باتیں اخذ کر کے قاری کے لیے موعظت وبصیرت کی راہیں شگفتہ انداز میں پیش کرتے تھے۔ ایک اقتباس جس میں دلکش منظر کشی اور مولانا کے مخصوص اسلوب نگارش کا جوہر پورے طور پر ظاہر ہو رہا ہے، ملاحظہ ہو۔

’’آفتاب جب چھپ جاتا ہے تو زمین پھر بے نور ہو جاتی ہے اور سارا منظر بے روپ، بھیانک اور بے رونق ہو جاتا ہے۔ جب آسمان پر چاند اور تارے طلوع ہوتے ہیں تو یہ بدمنظری پھر دور ہو جاتی ہے..... درخت جب خشک ہو جاتے ہیں، سبزہ جل جاتا ہے، زمین جب پیاسی ہو کر تپنے لگتی ہے، دریاؤں کے لبوں پر پپڑیاں جم جاتی ہیں تو آسمان ہی کی بارش اپنے فیض وکرم سے ان سب کو سیراب، سب کو تروتازہ اور سب کو شاداب کر دیتی ہے۔ اگر آسمان کی دستگیری قدم قدم پر سہارا نہ دیتی رہتی تو آج نہ زمین موجود ہوتی نہ زمین کی دلچسپیاں اور خوش نمائیاں، نہ زینتیں، نہ آرائشیں، نہ آسائشیں۔‘‘[۲]

مولانا ماجد کا حلقہ احباب خاصا وسیع تھا۔ اس حلقے میں شامل سبھی کا مولانا کی نظر میں منفرد اور جداگانہ مقام تھا۔ ان کی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انھوں نے ذاتی مفاد اور تعلقات کو کبھی قومی وملی مفادات پر ترجیح نہیں دی۔ حقائق کے اظہار میں دوست اور دشمن کسی کی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ خواجہ حسن نظامی مولانا ماجد کے بہت اچھے دوستوں میں تھے۔ لیکن جب انھوں نے محمد علی جوہر کو نمرود، فرعون، یزید کہا، اور اپنے پرچے میں ان کے خلاف لکھنا شروع کیا، تو مولانا ماجد نے ’سچ‘ میں اس کی سخت گرفت کی، اس کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔

’’ادھر دو مہینوں سے ان کا قلم کس قدر بہکا ہوا ہے بے ضرورت خدا معلوم کتنے حلف نامے شایع کر رہے ہیں، لیکن کاش وہ صرف ایک حلف اٹھا سکتے کہ محمد علی کی مخالفت میں ان کا قلم جس بے تکان اور بے تحاشا تیز خرامی میں

---

۱ سچی باتیں (جلد اول): مرتب نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی: ص: ۳۴

۲ ہفتہ وار سچ: ۲؍ اگست ۱۹۲۶ء: ص: ۱

مصروف ہے، اس سے خود ان کا ضمیر مطمئن ہے اور جو باتیں وہ دوسروں کو یقین دلانا چاہتے ہیں، انھیں پوری طرح نہ سہی، ان کے بڑے حصہ کو بھی وہ خود صحیح سمجھ رہے ہیں.....ایک خادم اسلام اور عاشق اسلام کو فرعون، نمرود، اور یزید کے نام سے یاد کرنا نہ حضرت باوا فرید کا طریقہ تھا نہ حضرت محبوب الٰہی کا۔ اللہ کا راستہ بتانے والوں کو انتہائی اشتعال کے عالم میں بھی اتنی پست سطح پر بہر حال نہ اتر آنا چاہیے کہ ہم دنیا کے کتے انھیں دیکھ کر اپنے ظرف پر مغرور ہونے لگیں۔''[۱]

مولانا اپنے معاصر اخبارات ورسائل اور شائع شدہ کتابوں پر گہری نظر رکھتے تھے، اور اگر مذہب اسلام یا حضور پاکؐ کے خلاف کوئی مضمون یا کتاب شائع ہوتی مولانا اس کی تردید کرتے اور اس کے خلاف اس وقت تک مہم چلاتے رہتے جب تک وہ معافی نامہ لکھ کر آئندہ اس قسم کے مضامین چھاپنے سے باز رہنے کا وعدہ نہ کر لے۔ مولانا نے جن رسالوں یا کتابوں کے خلاف 'سچ' میں مہم چلائی تھی ان میں سے چند کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

نیاز فتح پوری نے اپنے رسالہ 'نگار' میں مذہب، آخرت، ملائکہ یہاں تک کہ ذات باری تعالیٰ پر بھی نازیبا حملے کیے، اور سوقیانہ عبارت میں مسلمانوں کے اعتقاد کا مزاق اڑایا تھا۔ مولانا ماجد نے سچ میں اس کی زبردست گرفت کی۔ بلکہ ۲۵ ستمبر ۱۹۳۱ء کے سچ میں پورے آٹھ صفحات کو انھوں نے 'نگار' کے وضع کردہ فتنہ کی مخالفت کے لیے وقف کر دیا، اور ایک طویل مضمون 'ایک دشمن اسلام مسلمان' کے عنوان سے اور ایک ذیلی سرخی 'اسلام اور مسلمانوں پر جگر خراش حملے' مولانا نے اپنے قلم سے لکھا، اور پورے ملک کے مسلمانوں کو اس مذموم حرکت کے خلاف بیدار کیا، جس کی وجہ سے ملک بھر میں احتجاجی مظاہرے کیے گئے اور نیاز فتح پوری پر اہانت مذہب اور دل آزاری کے مقدمے دائر کیے گئے۔ بالآخر نیاز فتح پوری کو معافی نامہ داخل کرنا پڑا۔

اسی طرح عظیم بیگ چغتائی نے 'حدیث اور پردہ' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی تھی جس میں کلام مجید اور حدیث پر بے جا اعتراضات کیا گیا تھا، اور امت کے فقہاء اور علماء کے خلاف بھی بدزبانی کی گئی تھی۔ مولانا ماجد نے 'امر عظیم' کے عنوان سے ٦ جنوری ۱۹۳۱ء کے 'سچ' کے شمارے میں چغتائی کے عائد کردہ بے بنیاد اور لغو الزامات کی پرزور الفاظ میں مذمت اور تردید کی، اور عوام کے ذریعہ بھی اس کی مخالفت ہوئی۔ احتجاج اور

---

[۱] ہفتہ وار سچ: ۲۴ر جنوری ۱۹۲۷ء: ص: ۳

مخالفت سے مجبور ہو کر چغتائی نے معافی مانگی اور کتاب کی اشاعت روک دی۔ مولانا ماجد نے عظیم بیگ چغتائی کے اس معافی نامہ کو سراہا اور 'اجر عظیم' کے عنوان سے ۲۰ جنوری ۱۹۳۳ء کے 'سچ' میں عظیم بیگ کے اعتراف اور آمادگی کی داد دی۔

دسمبر ۱۹۳۲ء میں ترقی پسند مصنفین سجاد ظہیر، رشید جہاں، احمد علی محمود الظفر کے افسانوی مجموعے 'انگارے' کی اشاعت ہوئی۔ جس میں فحش الفاظ استعمال کیے گئے تھے، ذات باری تعالیٰ اور فرشتوں اور مذہب وغیرہ کی شان میں گستاخی کی گئی تھی۔ مولانا ماجد نے ۲۴ فروری ۱۹۳۳ء کے سچ میں 'ایک شرم ناک کتاب' کے عنوان سے ایک شذرہ لکھا۔ مذہب پر حملہ کو دیکھ کر سرفراز، خلافت، معارف اور لکھنو کے بہت سے اخبارات نے اس کتاب کے خلاف لکھنا شروع کر دیا، اور حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ یہ کتاب مذہبی حیثیت سے نہایت دلآزار ہے، اس کو ضبط کیا جانا چاہیے، بالآخر یوپی حکومت نے اس کتاب کو ضبط کر لیا۔

اسی طرح مولانا ماجد ہمیشہ معاصر رسالوں، اخباروں، کتابوں پر گہری نظر رکھتے اور مذہب اسلام یا غیر اخلاقی مضامین کے شایع ہونے پر اس کی گرفت کرتے اور منظم مہم چھیڑ دیتے جس سے ملک بھر میں رائے عامہ کے خلاف ہو جانے کی وجہ سے مدیر یا مصنف کو معافی نامہ داخل کرنا پڑتا۔ اس طرح کے تقریباً سبھی معرکوں میں مولانا کو کامیابی حاصل ہوتی۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ مولانا نے قرآن مجید کی انگریزی ترجمہ وتفسیر کی بے پناہ مصروفیت کی وجہ سے چند مہینوں کے لیے سچ کی اشاعت بند کر دی تھی کچھ عرصہ کے بعد جب مولانا نے اس کی دوبارہ اشاعت کا ارادہ کیا تو ظفر الملک صاحب اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ مولانا نے پہلے خط پھر ان کے عزیزوں دوستوں کے ذریعہ کوشش کی مگر ساری کوششیں ناکام رہیں۔ بالآخر مولانا عنایت اللہ مرحوم فرنگی محلی کو مولانا ماجد نے حکم بننے پر آمادہ کیا، تو معلوم ہوا کہ ظفر الملک پرچہ کی ملکیت کے ساتھ ساتھ اخبار کے نام کو بھی اپنی ملکیت سمجھ رہے ہیں، اور مولانا ماجد کو اس کے نام کے استعمال کی بھی اجازت دینے کو تیار نہ تھے۔ عنایت اللہ مرحوم نے مولانا کو سچ کا خیال چھوڑنے اور نیا پرچہ نکالنے کا مشورہ دیا۔ اور نام بھی انھیں نے 'صدق' تجویز کر دیا۔

صدق

مولانا ماجد کو انتظامی امور اور کاروباری معاملات سے دلچسپی نہ تھی۔ظفر الملک سے قطع تعلق کے بعد مولانا کو ایک ایسے شخص کی تلاش ہوئی جو اخبار کے انتظامی امور اور پریس کے معاملات کا تجربہ رکھتا ہو حسن اتفاق سے اسی زمانے میں مولانا کی ملاقات عبدالرؤف عباسی سے ہوگئی، جو روزنامہ 'حق' کے مدیر اور ایک پریس کے مالک تھے، اور مولانا کی لکھنوی قیام گاہ خاتون منزل کے پڑوسی تھے ان کے اشتراک سے مولانا نے 'صدق' کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا۔مولانا ماجد نے اس واقعہ کو آپ بیتی میں اس طرح بیان کیا ہے۔

> ''مجھ میں پرچہ چلانے کی کوئی انتظامی صلاحیت بھلا کہاں تھی، اور ظفر الملک صاحب میری اس کمزوری سے پورا فائدہ اٹھا رہے تھے، بہر حال اب نئے منیجر اور پبلشر کی تلاش شروع ہوئی، اور اتفاق سے جلد ہی ایک دوسرے کاکوری صاحب خوش خوش اس کام کے لیے آمادہ ہو گئے، اپنی برادری کے ہوتے تھے، اور کاکوری کے عباسی خاندان کے تھے، بہ حیثیت ایک جونیر یا خرد کے، سالہا سال سے مجھ سے مل رہے تھے، خود بھی اپنا ایک اخبار 'حق' کے نام سے نکال رہے تھے۔ایک بڑے پریس کے مالک تھے، اور بڑی بات یہ کہ میرے لکھنوی مکان خاتون منزل سے بالکل متصل مرشد آباد ہاؤس میں اپنا کاروبار رکھتے تھے، انھوں نے خود ہی مجھے نفع میں دس فی صدی کا شریک کیا، اور پہلا پرچہ مئی ۳۵ء میں نکل آیا۔''[۱]

صدق کی پیشانی پر بھی یہ آیت قرآنی **'الزی جاء بالصدق وصدق به اولئك هم المتقون'** (اور وہ جو سچی بات لے کر آیا اور جس نے اس کو سچ مانا وہی پرہیز گار ہیں) پابندی سے شائع ہوتی تھی۔مولانا کی پوری صحافتی زندگی جو تقریباً نصف صدی پر محیط ہے۔اسی آیت قرآنی سے عبارت ہے۔

مشمولات اور سائز میں 'صدق'، 'سچ' کا نقش ثانی اور نعم البدل تھا۔لیکن 'صدق' میں چند سالوں کے بعد تفسیر قرآن کے کالم اور مشورے وگذارشیں کے کالم کا اضافہ کر دیا گیا تھا۔اس کالم میں مختلف قسم کے سوالات کے جواب اور مسائل کے ممکنہ حل پیش کیے جاتے تھے۔مولانا کو اس کالم سے بڑی دلچسپی تھی، اور

---

[۱] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۲۲۳

وہ بڑی عرق ریزی سے پوچھنے والوں کے سوالات اور مسائل کا اطمنان بخش جواب اور حل پیش کیا کرتے تھے۔ 'سچی باتیں' کا کالم اس میں بھی بدستور جاری رہا۔

ملک کی تقسیم کے بعد بھی مولانا کے مشہور کالم 'سچی باتیں' کی مقبولیت پاکستان میں باقی رہی۔ وہاں کے اخبارات ورسائل بڑے احترام سے اس کالم کو اپنے اخبارات میں نقل کرتے تھے۔ پاکستان میں 'صدق' کی مقبولیت اور شہرت کی وجہ سے ایک متعصب اور جن سنگھی اخبار نے مولانا پر یہ الزام عائد کیا کہ مولانا ہندو مخالف اداریے اور شذرات پاکستانی اخبارات کے لیے لکھتے ہیں۔ اس پر یو پی کے وزیر اعلی بابو سمپورنانند نے اس بے بنیاد الزام کی بڑی سختی سے تردید اور مذمت کی۔

صدق میں مشاہیر علم وفن عالموں اور ادیبوں کے مضامین بڑے اہتمام سے شایع ہوتے تھے۔ جیسے سید سلیمان ندوی، مناظر احسن گیلانی، مولانا سید ابوالاعلی مودودی وغیرہ۔ مولانا مودودی کی کتابوں، مضامین وغیرہ کا اعتراف مولانا ماجد سچ میں ہمیشہ کرتے رہے۔ لیکن مولانا نے جہاں جماعت اسلامی کی فعالیت اور تنظیمی کاوشوں کی تعریف کی وہیں پاکستانی سیاست کے خلاف مظاہرہ کرنے پر ان کی مخالفت بھی کی۔ جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کی حمایت اور مخالفت کے متعلق مولانا ماجد کے داماد اور بھتیجے عبدالعلیم قدوائی صاحب لکھتے ہیں۔

> ''مولانا مودودی نے عمومی مسائل مثلاً پردہ، سود، نظام حکومت وغیرہ پر جو کتابیں لکھیں جو جدید ذہن کے شکوک وشبہات کو رفع کرنے میں مفید تھیں ان کا اعتراف صدق میں برابر ہوتا رہا اور مولانا نے ان کو متکلم اسلام کا خطاب دیا اور ان کے مطالعہ کی سفارش کی، اسی طرح جب انھوں نے اسلام کی دعوت وتبلیغ کی طرف توجہ کی تو ان کی کوششوں کی داد دی۔ چنانچہ رسالہ ترجمان القرآن اور جماعت اسلامی کی ابتدائی کوششوں کی داد دی اور حکومت الہیہ کے بنیادی تصور کی حمایت مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی اور دیگر نامور علماء کے ساتھ مل کر کی۔ مگر جب مولانا مودودی نے اس کو تحریک کی شکل دی اور پیدائشی ونسلی مسلمانوں کو طنز وتعریض کا نشانہ بنایا اور امیر جماعت کو

رسولؐ کی طرح معصوم اور کسی قسم کی جرح واعتراض سے بالاتر رکھنے کی کوشش کی تو انھوں نے ان کے انداز فکر کی کجی کو واضح کیا اور ان کے غالیانہ مسلک سے اپنی بریت ظاہر کی۔ چناچہ صدق میں اپنے کئی مضامین کے ذریعہ مولانا نے خدشات ظاہر کیے کہ جماعت اسلامی اور اس کے امیر خارجیت کے مسلک پر چل رہے ہیں جو اسلام اور شریعت کے مزاج کے خلاف ہے۔ صدق کی اس حق بیانی سے جماعت اسلامی کے پر جوش کارکن اور مولانا مودودی کے غالی معتقد بہت ناراض ہوئے اور انھوں نے مولانا پر ذاتی حملے اور اعتراضات شروع کیے جن کا سلسلہ ان کی وفات تک چلتا رہا۔ مولانا جماعت اسلامی کی فعالیت اور تنظیمی کوششوں کا ذکر تعریف سے صدق کے صفحات پر کیا کرتے تھے مگر اس کے ساتھ ہی پاکستان میں اس کے سیاسی موقف اور جوش وغلو کے مظاہروں کی مخالفت بھی کرتے تھے خاص کر مولانا مودودی نے جو رویہ ایوب خاں اور فاطمہ جناح کے مابین صدارتی الیکشن کے بارے میں اختیار کیا تھا۔''[1]

سچ کی طرح صدق کو بھی متعدد علمی، ادبی، مذہبی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن صاحب صدق نے صداقت اور حق گوئی کا دامن کبھی نہ چھوڑا۔ اس کی بدولت مولانا کے بہت سے مخالفین بھی پیدا ہو گئے تھے۔ نیاز فتح پوری کی توبہ ومعافی کے بعد عہد شکنی، علامہ عنایت اللہ مشرقی کی خاکسار تحریک دوقومی نظریہ، اردو دشمنی اور ترقی پسندی کے سائے میں فحاشی اور عریانیت کے خلاف صدق اور صاحب صدق محاذ آرا رہے، اور عوامی بیداری اور اصلاح کی راہیں ہموار کرتے رہے۔

نیاز فتح پوری نے معافی اور توبہ کے باوجود اپنی لامذہبیت اور الحاد کا پھر مظاہرہ پیش کیا۔ ہوا یوں کہ ۱۹۴۰ء میں ایک عیسائی مشنری ٹسڈل نے قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے کے خلاف بیہودہ اور نازیبا مضامین شایع کیا اس دعوے کے ساتھ کہ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کا حق مجھے بھی اسی طرح حاصل ہے جیسے سید سلیمان ندوی اور مولانا ماجد دریابادی کو ہے۔ یہ مضمون 'نگار' میں شایع ہوا۔ مولانا ماجد نے اس کے خلاف نوٹس لیا اور 'نگار' کی مسلم دشمنی کی روش کے خلاف ایک مستحکم مہم چلائی اور رسالہ کے بائیکاٹ کا اعلان کیا گیا۔ مولانا

---

[1] مولانا عبدالماجد دریابادی حیات وخدمات: عبدالعلیم قدوائی: ص: ۱۵۵۔۱۵۶

ماجد کی وجہ سے نیاز فتح پوری کو دوبارہ معافی نامہ شایع کرنا پڑا۔ مولانا ماجد اپنے قلم سے صحافت کو ایک نئی سمت عطا کی جس کی دوسری نظیر ملنی مشکل ہے۔ انھوں نے مذہب اسلام کی حمایت اور دشمنان اسلام کی مخالفت کا کام صحافت سے لیا، اور اسلام کی حقیقی روح اور پیغام کو دلنشیں انداز میں پیش کرتے رہے۔

مولانا ماجد کے مخالف بعض اخبار ورسائل بھی رہے، جو ان کے خلاف کوئی نہ کوئی الزام عائد کرتے رہتے تھے۔ خاص طور پر حیات اللہ انصاری مدیر 'قومی آواز' مولانا ماجد پر اور صدق پر یہ الزام عائد کرتے تھے کہ مولانا دو قومی نظریہ اور مسلم لیگ کے حامی ہیں، اور ہندوستان کے بدخواہ۔ مولانا ہمیشہ مستحکم دلائل سے ان کی تردید کرتے رہے۔ مولانا ماجد کا سیاسی مسلک اور نظریہ تھا کہ ہندی مسلمانوں نے سیکولرزم کو ایک سیاسی حکمت عملی کے طور پر اپنایا اور قبول کیا ہے، اور ہندوستانی دستور آئین کی مشروط اطاعت وحمایت ووفاداری اس وقت تک کرتے رہیں گے جب تک یہ کلام اللہ اور سنت رسول اللہ سے متصادم نہ ہو جائے۔ امام الہند ابوالکلام آزاد کے اس اعلان ''کہ مجھے مسلمان ہونے اور اسلامی ورثہ پر فخر ہے۔ میرے مذہب کی روح مجھے وطن دوستی اور اس کی محبت سے نہیں روکتی۔'' کی مولانا ماجد پوری طرح تائید کرتے تھے۔ اس کے برعکس حیات اللہ انصاری اشتراکی اور سیکولر نظریات کے پیرو تھے۔ مذہب ان کے نزدیک ثانوی چیز اور زیادہ اہم حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ مذہب کو محض ایک ذاتی اور شخصی چیز سمجھتے تھے، اور وہ چاہتے تھے کہ مولانا ماجد اور ہندوستانی مسلمان پاکستانی نظریہ کی کھل کر مذمت کریں، اور مسلم لیگ کو تقسیم ہند اور زبردست کشت وخون اور تباہی کا ذمہ دار قرار دیں۔ صدق نے اس غلط ذہنیت اور گمراہ کن نظریے کی جم کر مخالفت کی۔ اور ان کے نظریات کی پرزور تردید کرتے رہتے، اور دونوں اخباروں میں نوک جھونک اس وقت تک چلتی رہی جب تک حیات اللہ انصاری کی مدت ادارت قائم رہی۔ ان کے قومی آواز سے سبک دوش ہونے پر مولانا نے صدق میں جو سرخی لگائی ''لذت غم نہ رہی تیرے اٹھ جانے کے بعد'' جس سے ان کی شرافت اور انسانیت دوستی کا پتہ چلتا ہے۔ اختلافات کے باوجود دونوں ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ مولانا ماجد نے ان اختلافات کو کبھی ذاتی دشمنی کا رنگ نہیں دیا بلکہ ان سے دوستانہ تعلق برابر قائم رکھا۔

صدق میں نئی طبع شدہ مذہبی، ادبی کتابوں پر تبصرے 'نئی کتابوں' کے عنوان سے مہینے میں دو بار

شایع ہوتے تھے۔مولانا کے یہ تبصرے علمی ، مذہبی ، ادبی ،تنقیدی اعتبار سے بڑے اہم ہوتے تھے۔مولانا کے منتخب تبصروں کوعبدالعلیم قدوائی صاحب نے مرتب کر کے شایع کرایا ہے۔مولانا کے ریڈیائی نشریے بھی اس میں شایع ہوتے تھے،اوراب یہ نشریے بھی کتابی صورت میں شایع ہو چکے ہیں۔صدق میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ، ندوۃ العلماء ، دارالمصنفین اعظم گڑھ ،انجمن ترقی اردو ،ہندوستان اکیڈمی الہ آباد وغیرہ کے بارے میں اطلاعات اور کمیٹیوں کا حال شایع کیا جاتا تھا۔ مقالوں،مراسلوں کے علاوہ 'منقولات' کےعنوان سے دوسرے اخباروں اوررسالوں سےصدق کے معیار ومذاق کے مضامین نقل کیے جاتے تھے۔صدق میں اشتہارات سفرحج ودینی کتابوں کےعلاوہ کسی اور کے نہ ہوتے تھے۔

صدق ترقی پسندی کے نام پرمشتہر کی جانے والی بداخلاقی ،عریانیت ،فحاشی اورمغربیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتارہا۔مولانا ماجد کا ادبی نقطہ نظر ترقی پسندانہ تھا،لیکن ان کی ترقی پسندی صالح ،تعمیری اوراصلاحی ادب سے عبارت تھی۔مولانا کا ادبی نقطہ نظر حقیقت پسندانہ اورمعتدل تھا۔وہ ارتقاء کوقانون فطرت کالازمی جز سمجھتے تھے،اورصالح ادب کوانسانیت کی تعمیروترقی کا ذریعہ تصور کرتے تھے۔اسی لیے صالح اوراسلامی ادب کی ترویج واشاعت کے لیے پوری زندگی کوشاں رہے۔زبان وبیان ،لغت اور قواعدوغیرہ کے مسائل سے مولانا کو بڑی دلچسپی تھی۔اسی وجہ سے بابائے اردومولوی عبدالحق کی مرتب کردہ انگلش اردولغت مستشرقین کےعلمی وادبی کارناموں اورانسائیکلوپیڈیا جیسی اہم علمی تصانیف کا تعارف وتبصرہ صدق میں پیش کرتے رہتے تھے۔صدق کی یہ پالیسی تھی کہ حکومت وقت کی ان پالیسیوں اورقوانین پرتنقید کی جائے جس کے زد میں اسلامی احکامات ،مشرقی اقدار وتہذیب ،مسلم قوم اوراردوزبان آتی ہو۔اسی طرح کرپشن ،جرائم ،مہنگائی ،سود ورشوت خوری ،فتنہ وفساد ،بدنظمی اورسماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کے خلاف حکومت کی بےعملی وبےتوجہی کے خلاف آواز اٹھائی جاتی تھی۔عالمی سطح پراگرکسی ملک میں اسلامی شعائراورمسلمانوں کے خلاف کوئی ظلم وجبر ہوتا تھاتو صدق اس کے خلاف بھی صدائے احتجاج بلند کرتا تھا۔مثلاً پاکستان میں شراب نوشی کی کثرت ،اسلام سے بغاوت ،تعدادازدواج اورطلاق وغیرہ جیسے مذہبی وفقہی مسائل کے خلاف صدق برابررائے عامہ اورحکومت کوٹوکتا رہا،مگروہ حکومت کی سیاسی پالیسی اور معاملات پررائے زنی نہیں کرتا تھا۔اسی طرح ہندوپاک کے درمیان آمدورفت اورڈاک مواصلات پر

پابندیوں کے خلاف صدق ہمیشہ آواز اٹھاتا رہا، اور ساتھ ہی دونوں پڑوسیوں کے درمیان اشتراک و تعاون کی تائید کرتا رہا۔

صدق کی مالی حالت ہمیشہ کمزور رہی لیکن ملک کی تقسیم اور حیدرآباد کے سقوط اور زمینداری کے خاتمے کی وجہ سے اس کے خریداروں کی تعداد اور بھی کم ہوگئی تھی۔ پاکستان کی مالی بندش کی وجہ سے پاکستان سے صدق کا مالی رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ کاغذ، چھپائی کمتر ہونے کے ساتھ ساتھ پریس کی خرابی کی وجہ سے پرچہ بھی دیر سے شایع ہوتا تھا، اور کبھی ناغہ تک کی نوبت آجاتی تھی۔ کئی اہل خیر حضرات صدق کی مالی مدد کرتے رہے، خریداروں کے اضافے کی مہم چلائی گئی، مالی تعاون کی اپیل بھی جاری کی گئی مگر نتیجہ کچھ زیادہ اچھا نہیں نکلا۔ مولانا نے 'آپ بیتی' میں صدق کی اشاعت اور اس کی مالی دشواریوں کا تذکرہ اس طرح کیا ہے۔

> ''پہلا پرچہ نہایت ہی بدنما، اور تکلیف دہ حد تک بدزیب نکلا، ظاہری زیب وزینت کے معاملہ میں تو میں خود بے حس واقع ہوا ہوں، لیکن یہ نمبر اس حد تک سے بھی گیا گزرا ہوا تھا، کٹ کر رہ گیا۔ اب جہاں تک یاد پڑتا ہے، پرانے خریداروں کا رجسٹر بھی ظفر الملک صاحب کے یہاں سے نہیں ملا تھا۔ خیر، پرچہ محض انداز سے روانہ کیا گیا، پرچہ کی ظاہری صورت تو رفتہ رفتہ ٹھیک ہوگئی، البتہ معاملاتی تعلق کی تفصیل اب کیا بیان کی جائے اور بلا ضرورت پڑھنے والوں کا وقت کیوں ضائع کیا جائے۔ بارہا غیرت وخودداری کا خون کر کر کے مجھے اپیل خریداروں کے نام شایع کرنا پڑی، خیر ۱۴ سال کی مدت لشتم پشتم کسی طرح کٹ گئی اور ستمبر ۵۰ء میں یہ حد سے زیادہ تنی ہوئی کمان آخر ٹوٹ کر رہی۔''[۱]

بالآخر عبدالرؤف عباسی صاحب نے بڑھتے ہوئے نقصانات کے تحت پرچہ جاری رکھنے سے معذرت کی اسی دوران مولانا کو یہ خیال آیا کہ پرچہ کو اس مرتبہ براہ راست ذاتی انتظام وانصرام میں شایع کیا جائے۔ چنانچہ انتظامی امور کی ذمہ داری مولانا کے بڑے بھتیجے اور داماد حکیم عبدالقوی دریابادی صاحب کے سپرد کی گئی، اور انھیں منیجر اور نائب مدیر دونوں مقرر کیا گیا۔ (یہ روزنامہ تنویر لکھنؤ میں کام کر

---

[۱] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۲۲۳۔۲۲۴

چکے تھے اور اخباری تجربہ بھی رکھتے تھے) عبدالقوی صاحب کی معاونت کے لیے علی احمد صاحب اور محمد معین کو بھی عملہ میں شامل کیا گیا۔ اخبار کی تیاری، چھپائی، روانگی اور دفتری کاموں کی ذمہ داری محمد معین کے ذمہ تھی۔ حساب کتاب کی دیکھ بھال کی ذمہ داری علی احمد سندیلوی صاحب کے سر تھی۔ پرچہ کے نام کا سوال قانونی حیثیت سے پھر پیدا ہوا، کیونکہ ظفر الملک کی طرح اس مرتبہ بھی پرچہ کے مہتمم عبدالرؤف عباسی نے صدق نام کو اپنی ملکیت بتایا اور دفتر سے کسی بھی طرح کا کوئی دستاویز یا رجسٹر دینے سے انکار کیا۔ 'صدق' کے بند ہونے اور 'صدق جدید' کی اشاعت کے متعلق مولانا ماجد نے اپنی خودنوشت میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔

''نئے پرچہ کے نام کا سوال قانونی حیثیت سے پھر پیدا ہوا، اور اب مہتمم صاحب صدق مرحوم نے بھی صدق کے نام کو اپنی ملکیت بتایا، مجبوراً ضابطہ کا نام صدق 'جدید' رکھنا پڑا، اور پہلا پرچہ چند ہی ہفتہ کے اندر شروع دسمبر ۵۰ء میں نکل گیا۔ دفتر سابق سے کاغذ وغیرہ کسی قسم کی کوئی چیز نہ ملی۔

بر گردن او بماند و بر ما بہ گزشت!

پڑھنے والے اگر یہ بدگمانی کریں تو کیا بیجا ہے کہ یہ دریابادی نام کے مولانا تو بڑے چندہ خور واقع ہوئے ہیں، اخبار خوامخواہ بند کر دیتے ہیں اور پرانے خریداروں کا چندہ ہضم کر جاتے ہیں! اصل حقیقت روز حشر کھلے گی، جب یہ دونوں منیجر صاحبان مجرم کی حیثیت سے میرے سامنے آئیں گے، انشااللہ اس وقت انھیں معاف کر دوں گا اس طمع سے کہ جن بندوں کا میں خطاوار ہوں، وہ مجھے معاف کر دیں..... پرچہ بحمد اللہ برابر کامیابی سے نکل رہا ہے، اور اس میں دخل اللہ کی کارسازی کے بعد حکیم عبدالقوی، اور علی احمد اور درگاہی محمد معین کی مستعدی و حسن نیت کا ہے۔ کچھ اہل خیر ایسے بھی ہیں جو ۲۰۰ کی رقم یک مشت دے کر دوامی خریدار ہو گئے ہیں، ایسوں کی تعداد آٹھ، دس ہوگی باقی عام خریدارو میں ایک تہائی خریدار پاکستان کے ہیں، اور وہاں سے قیمت کی تقریباً

عدم وصولی کے باوجود، پرچہ بہر حال ماشاءاللہ یہی نہیں کہ اپنا خرچ پورا نکال لیتا ہے، بلکہ کچھ نہ کچھ بچت سالانہ ہوتی رہتی ہے۔ ۱۵ سو کی تعداد میں چھپتا ہے، پاکستان کے علاوہ پرچہ کی کچھ کاپیاں دوسرے مشرقی ملکوں (عراق، حجاز، مصر، لیبیا، کویت، سیلون، برما، افریقہ وغیرہ) میں جاتی ہیں، بلکہ بعض برطانیہ، فرانس، کناڈا، اور امریکہ بھی، پرچہ سے اپنے ظرف وبساط کے مطابق آمدنی بھی اچھی خاصی ہو جاتی ہے، اور اس کی تحریریں نقل اس کثرت سے ہوتی ہیں کہ بس اللہ کے فضل خصوصی کا قائل ہو جانا پڑتا ہے۔''[1]

صدق جدید

'صدق' کے منیجر عباسی صاحب سے معاملات طے نہ ہونے کی وجہ سے مولانا نے ایک ہفتہ وار 'صدق جدید' کے نام سے دسمبر ۱۹۵۰ء میں جاری کیا۔ اس اخبار کو بھی مولانا اپنے معمول کے مطابق دریا باد سے مرتب کر کے لکھنو بھیجتے تھے، اور یہاں سے حکیم عبدالقوی صاحب جو اس اخبار کے نائب مدیر اور مہتمم تھے اپنے اہتمام میں شایع کراتے تھے، اور یہ سلسلہ مولانا کے انتقال جنوری ۱۹۷۷ء تک قائم رہا۔ اس کے بعد بھی حکیم عبدالقوی صاحب کی کاوشوں سے یہ اخبار اپریل ۱۹۸۵ء تک نکلتا رہا۔ اس میں مولانا کے پرانے مضامین، سچی باتیں، شذرات وغیرہ بھی از سرنو شایع کیے جاتے تھے۔ نیز حکیم صاحب خود بھی شذرات اور مضامین لکھتے تھے، اور دیگر اہل قلم بھی تعاون کرتے تھے۔

ملک کی آزادی کے بعد اردو صحافت اور پریس میں ہفتہ وار 'صدق جدید' نے اپنا خاص معیار ومرتبہ بنا لیا تھا، اور عوام وخواص دونوں طبقوں میں یہ اخبار بڑا مقبول اور معروف تھا۔ اس کی مقبولیت کے تمام اسباب میں سے ایک اہم سبب مولانا کی پائے کمال کو پہنچی ہوئی انشاپردازی اور اسلوب نگارش تھی۔ مولانا کو چونکہ زبان وبیان اور روزمرہ پر قابل رشک عبور حاصل تھا، طنز وظرافت، شگفتہ نگاری اور اشعار اور رعایت لفظی کے برمحل استعمال سے یہ اخبار معاصر اردو اخبار سے منفرد اور ممتاز تھا۔ 'صدق جدید' کا ایک اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے مجبور، محکوم، مسلم اقلیت اور اردو زبان وادب اور مشرقی تہذیب واقدار کی ترجمانی اور تحفظ کا فریضہ بحسن خوبی ادا کیا۔

---

[1] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۲۲۴۔۲۲۵

ہندوستانی مسلمانوں کی شناخت اور تشخص اور وفاداری، دوقومی نظریہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بقاء وتحفظ، تعمیری واصلاحی ادب، ہندو مسلم یکجہتی، ہندو پاک اتحاد، مسلمانوں کے باہمی اتفاق کے لیے مولانا ماجد ایک سچے اور بااصول اور قوم پرست صحافی کی طرح پوری زندگی جدوجہد کرتے رہے۔آزادی کے بعد جب ہندوستانی مسلمانوں اور اردو زبان کے خلاف متعصب ہندو تنظیموں نے تحریک چلائی اور ان پر علیحدگی پسندی اور ملک دشمنی کے جھوٹے الزامات لگائے تو مولانا ماجد نے اس کے خلاف ادب کی تاریخ اور روزمرہ کی زندگی اور رسم ورواج، بول چال سے تلاش کر کے ایسی سچی مثالیں اور نا قابل تردید دلائل اور واقعات پیش کیے جن میں یہ ثابت کیا کہ اردو زبان اور مسلم تہذیب وتمدن میں سنسکرت اور ہندی کے الفاظ، محاورے اور اصطلاحیں بکثرت پائے جاتے ہیں اور 'ہم متعصب ہیں' کے عنوان سے ۱۴ دسمبر ۱۹۵۱ء میں 'صدق جدید' کے شمارے میں ایک مختصر مضمون لکھا یہ مضمون ملاحظہ ہو۔

> ''دعویٰ عنوان میں آچکا۔ دلائل اب سنیے۔ ہم جب ہندوستان آئے اور فاتح بادشاہ کی حیثیت سے آئے اور بادشاہت بھی دو چار نہیں آٹھ سو سال تک کرتے رہے۔ عرب سے نہ عربی ساتھ لائے نہ ایران سے فارسی نہ تاتار سے ترکی نہ افغانستان سے پشتو بلکہ رفتہ رفتہ یہیں کی بول چال کا لب ولہجہ اختیار کر لیا اور جہاں اپنی طرف سے ع اور غ اور ق اور ط اور س اور ص اور ث اور خ وغیرہ کا تحفہ پیش کیا۔ وہیں بے تکلف یہاں کی ٹ اور ڈ اور ڑ وغیرہ کو بھی اپنی زبان کا جزو بنا لیا۔ پہلی دلیل ہمارے تعصب کی یہ ہوئی۔ لباس اپنے ساتھ عرب کا لائے نہ ایران کا، نہ تاتار کا نہ افغانستان کا بلکہ یہیں کے گزی گاڑھے مارکین چھالٹین نین سکھ میں اپنی عبا قبا شملہ وعمامہ جامہ نیمہ شلوار اور قمیص کا پیوند لگا یہیں کی معاشرت اور آب وہوا کا رکھ رکھاؤ کر کے اچکنیں اور انگے اور پگڑیاں اور بنڈیاں پہننے لگے۔ دوسری دلیل ہمارے تعصب کی۔ مکانوں کے نقشے نہ اپنے ساتھ عرب کے لائے نہ عجم کے بلکہ جیسا رنگ ڈھنگ یہاں کا دیکھا اسی کے مطابق اپنے خاص مذاق اور خاص ضرورت کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی حویلیاں

اور کوٹھے اور بروٹھے اور چوپال اور کوٹھریاں بنانے لگے ۔ یہ تیسری دلیل ہمارے تعصب کی قائم ہوئی ۔ ابھی دلائل ختم کہاں ہوئے ۔ کھانے کے ہم بڑے شوقین تھے لیکن اس سرزمین پر جب قدم رکھا تو ولایتی شب دیگ اور دم پخت اور انار وانگور کے ساتھ یہاں کے ساگ اور ترکاریوں ، دال اور کڑھی ، یہاں کے آم اور خربوزہ ، کھیرے اور ککڑی نیبو اور املی جامن اور شریفے پوری اور کچوری کو بھی اپنے دسترخوان کا جزو بنالیا یہ چوتھی دلیل ہمارے تعصب کی ہوئی ! ابھی اور سنیے ۔ بڑا دعوی اور ہزار زعم ہم کو اپنی خالص توحید کا تھا اور سمجھا یہ جاتا تھا کہ دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے ہم شرک کے آس پاس بھٹک نہیں سکتے ۔ لیکن ہم جب یہاں آئے تو یہاں کے مشرکانہ تہواروں اور میلوں ٹھیلوں سے الگ رہنا تو الگ رہا الٹا ہم نے انھیں اپنانا شروع کیا اور خود اپنے ہاں انھیں نمونوں پر ویسے ہی باجے گاجے ناچ رنگ جملہ لوازم فسق کے ساتھ میلے تماشے تہوار منانے شروع کر دیے یہ پانچویں دلیل ہمارے تعصب کی ہوئی ۔ آپ چاہیں تو اس سلسلہ کو اور بڑھاتے چلے جائیں لیکن دعوی کو مدلل روشن اور واضح کرنے کے لیے یقین ہے یہ بھی کافی سے زائد کام دے جائے ۔"[1]

اس طرح مولانا نے اردو کی مخالفت اور دشمنی رکھنے والوں کو راہ راست پر لانے کے لیے کئی مدلل تحریریں اور 'سچی باتیں' میں اردو میں ہندی' کے عنوان سے شایع کیں اور اس پر زور دیا کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں بلکہ اس میں ہندوؤں اور ہندی زبان کا بھی بڑا حصہ ہے، اور وہ خالص ہندوستانی ہے اور یہاں کے مشترکہ کلچر اور ہندو مسلم اتحاد کی نشانی ہے ۔

یو پی حکومت نے جب اردو اکیڈمی کی بنیاد ڈالی تو مولانا نے صدق جدید میں حکومت کے اس فیصلے کو سراہا ، اور اس کے ابتدائی جلسے میں شامل ہو کر اکیڈمی کی رکنیت بھی قبول کی اور اس کے جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے ۔ اسی طرح جب مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کے خلاف سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ سنایا کہ مسلم یونیورسٹی کو مسلمانوں نے نہیں بلکہ حکومت ہند نے بنایا ہے، تو صدق جدید میں مولانا نے

---

[1] ہفتہ وار صدق جدید: ۱۴ دسمبر ۱۹۵۱ء

اس غیر معقول فیصلے کے خلاف سخت احتجاج کیا ۔مولانا کے صدق جدید کے ۲ نومبر ۱۹۶۷ء کے شمارے میں مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو غصب کر لینے کے فیصلے پر اظہار افسوس ان الفاظ میں کیا ہے۔

''نوشتہ تقدیر آخر سپریم کورٹ کے فیصلہ کی شکل میں ظاہر ہوا، اور مسلمانوں کے قلب پر بجلی گر کے رہی۔ملک کی سب سے بڑی عدالت کا فیصلہ اور وہ بھی متفقہ اجلاس میں صادر ہو کر رہا کہ مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کی نہیں حکومت ہند کی قائم کی ہوئی ہے، اور اس کے نظم ونسق کے پورے اختیارات مسلمانوں کو نہیں، سرکار ہند کو حاصل ہیں۔خواب یہ دیکھے جا رہے تھے کہ ۱۹۵۱ء اور ۱۹۶۵ء کے ایکٹوں میں جو شدید ناانصافیاں اور حق تلفیاں اس بدنصیب ملت کے ساتھ ہوئی ہیں، ان کی دادرسی ہوگی.....اکثریت جو ایک عزیز ترین متاع ملت پر قابض ہوتی جا رہی ہے بلکہ ایک حد تک قابض ہو چکی ہے، اس سے نجات ملے گی اور مسلمانوں کا قبضہ اپنے سے چھنی ہوئی چیز پر بحال ہوگا۔تعبیر بالکل برعکس نکلی۔اور آرزوؤں امیدوں، تمناؤں، کا سارا طلسم دم بھر میں ہست سے نیست ہو کر رہ گیا۔سزا ہے ایک تمام تر گراں خواب اور یکسر خود فراموش قوم کی۔''[۱]

مولانا ماجد نے صحافت کے ذریعہ قوم کو ہمیشہ بیدار کرنے کی کوشش کی صدق جدید کے مرحلے تک پہنچتے پہنچتے ان کا صحافتی قلم درجہ کمال تک پہنچ چکا تھا۔ان کا مخصوص اسلوب اور شگفتہ انداز تحریر کے علاوہ صدق جدید کی بڑی خاصیت اس کی برمحل و برجستہ سرخیاں ہوتی تھیں ۔مولانا کو عنوانات قائم کرنے اور اخباری سرخیاں لگانے پر بڑی قدرت حاصل تھی ۔مولانا کی چند سرخیاں ملاحظہ ہوں ۔ ہاتھ نکلے اپنے دونوں کام کے، کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے، کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے، ثوب لوٹتے ہیں خاک میں ملا کے مجھے، اسی کافر کی ادا یاد آئی، سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں، کیا یہ نمرود کی خدائی ہے، تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی وغیرہ۔

مولانا ماجد نے اپنے مجموعی صحافتی خدمات اور امتیازات کا اظہار اپنی خودنوشت میں کیا ہے۔ اقتباس طویل ہے لیکن مولانا کے صحافتی افکار ونظریات اور طرز تحریر وغیرہ کی واقفیت کے لیے کلیدی حیثیت

---

[۱] ہفتہ وار صدق جدید: ۲ نومبر ۱۹۶۷ء

کا حامل ہے اس لیے نقل کیا جا رہا ہے۔

''پرچہ کی خدمات پر اپنے قلم سے تبصرہ کر ہی کیا سکتا ہوں، دین، اور پھر ضمناً علم، ادب، صحافت کی خدمت بری بھلی جو کچھ بھی اس ۴۲/۴۰ سال میں بن پڑی، اس کا فیصلہ خود ناظرین پرچہ کے سو پچاس نمبر پڑھنے کے بعد کر سکتے ہیں۔ البتہ اپنی طرف سے یہاں صرف اتنی گزارش کی اجازت چاہتا ہوں کہ۔

(۱) واقعات حاضرہ پر اس طرز خاص سے تبصرہ کرنا، کہ پہلے نفس خبر، بجنسہ نقل کر دی اور پھر اس پر مختصر، جچے تلے لفظوں میں کچھ لکھ لکھا دیا۔ صدق وسچ سے پہلے شاید اردو کی دنیائے صحافت کے لیے نامعلوم تھا۔

(۲) صدق نے طنز وتعریض کا استعمال بے شک کثرت سے کیا ہے، لیکن اپنی والی کوشش ہمیشہ ذاتیات کا پہلو بچا کر، اور صرف پبلک زندگی کے پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر۔

(۳) مروت اور شخصی تعلقات سے یہ تو نہیں کہ سرے سے اثر قبول ہی نہیں کیا گیا، البتہ اس تاثر کو ہمیشہ حدود کے اندر رکھا گیا ہے اور اسے پبلک فریفتہ احتساب پر غالب نہیں آنے دیا گیا۔

(۴) ہر حق کو حق اور ہر باطل کو باطل بلا کسی پارٹی کے خیال اور بغیر کسی تعصب وتحزب کے پیش کیا اور جہاں کچھ بھی کہنے کی ہمت نہ ہوئی تو اس سے سکوت ہی اختیار کر لیا گیا۔

(۵) اظہار رائے اور جنبش قلم میں، یہ کس منہ سے کہوں کہ کبھی بھی ذاتی جذبات سے متاثر نہیں ہوا ہوں، جہاں کہیں بھی اس قسم کی لغزشیں ہوں، اللہ سے دعا ہے کہ اسے معاف فرمائے، اور ناظرین سے عرض ہے کہ وہ اس پر آمین کہیں۔

پرچہ سرکاری حلقوں میں قدرۃً غیر مقبول بلکہ مردودِ رہا ہے جیسا کہ

انگریزوں کے زمانے میں بھی رہ چکا ہے۔تنبیہ اتنے لمبے عرصے میں دو تین بار مل چکی ہے، پھر بھی حکام اس کی سنجیدگی کے قائل ہیں۔

خریداروں کی بہت بڑی اکثریت ظاہر ہے کہ مسلمان ہی ہے، پھر بھی کچھ نہ کچھ ہندو بھی اس کے خریدار ہیں، اور مسلمانوں میں بھی خریداری اہل سنت تک محدود نہیں، دوسرے فرقوں میں بھی اس کی کسی قدر رسائی ہے۔

ملک اور بیرون ملک کے رسالوں اور اخباروں کی طرف سے فرمائش مضمون کی یا کم سے کم پیام اس کثرت سے آتی رہتی ہیں کہ اگر سب کی تعمیل کرنا چاہوں تو اپنے کام کی طرف سے پھر ہاتھ بھی دھو بیٹھوں، ۴۲/۴۰ سال کی زندگی میں پرچہ کی سیاسی پالیسی میں تبدیلی ناگزیر تھی ۲۸ء کے ختم تک تو وہ کانگریسی رہا، جب سے مولانا محمد علیؒ کانگریس سے بیزار ہو کر الگ ہوئے، سچ نے بھی اس سے کنارہ کشی شروع کی، یہاں تک کہ چند سال میں صدق اس سے بالکل الگ ہو گیا اور پاکستان کا منصوبہ جب بروئے کار آیا تو اس حد تک مسلم لیگ کا بھی ہمنوا رہا کہ مسلمانوں کو بھی اپنا وطن بنانے کا حق خود اختیاری حاصل رہے۔سیاسی جماعتوں میں صرف خلافت کمیٹی کا ہم نوا وہم خیال پوری حد تک رہا تھا۔

پرچہ کی ارادی، شعوری، دانستہ کوشش ہر دور میں دین کو بلند کرنے کی رہی، اور اس کی دعوت ہمیشہ خیر ہی کی رہی، لیکن خدا معلوم کتنی بار اس کا نکالنے والا اور چلانے والا غصہ وطمع یا کسی اور شہوت نفس کا شکار ہو کر خود ہی پستیوں میں چلا گیا! اور خیر کی دعوت میں شر کی آمیزش ہوتی گئی۔ **نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیّاٰت اعمالنا۔**''[۱]

ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب نے مولانا ماجد کی صحافتی خدمات اور خصائص وامتیازات پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے۔

''ماجد کی صحافت میں بلکہ ہر تحریر میں جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی

---

[۱] آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۲۲۵۔۲۲۶۔۲۲۷

ہے اور شخصیت میں تلاطم اور ہیجان پیدا کر دیتی ہے، وہ ان کا منفرد اسلوب ہے۔ وہ بیک وقت ایک حکیم، خطیب، جراح اور ہمدرد طبیب کی طرح بظاہر مختلف حربوں سے کام لیتے ہیں مگر ان کا مقصود اصلی اور غایت اولیٰ مریض کی شفا کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ اپنے اسلوب کی اس تاثیر میں وہ بعض اوقات اپنے اس خاص فن سے کام لیتے ہیں جسے سرخی کہتے ہیں۔ صحافت میں سرخی جمانے کی اہمیت روشن ہے۔ قاری کے پورے وجود کو اپنی گرفت میں لے لینے اور اپنے موقف کو مختصر ترین لیکن ساتھ ہی ساتھ موثر ترین لفظوں میں قاری تک پہنچانے میں بنیادی رول اسی 'سرخی' کا ہوتا ہے۔ ماجد اس فن میں بڑے طاق تھے۔ اس ضمن میں وہ بعض اوقات برجستہ مصرعوں سے ایسا کام لیتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ مصرعہ خاص اسی موقع کے لیے خلق کیا گیا تھا۔.....بحر حال باون برس کی صحافیانہ خدمات ماجد کا وہ طغرائے امتیاز ہیں کہ تنہا یہی کوئی کم اعزاز نہیں۔ یعنی نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں چہ جائیکہ اس صحافت کے ذریعے سے فکر و فرزانگی، حکمت و دانش، سوز و سرور اور جذب وجنوں کی کتنی ہی حکایتیں رقم کی جائیں۔''[1]

مولانا اپنے اخباروں کی پیشانی پر جس آیت ربانی کو نقل کیا کرتے تھے۔ یہی آیت ان کی صحافتی زندگی کا نصب العین قرار پائی تھی۔ مولانا پوری زندگی سچ کو سچ ہی کہتے رہے مولانا کے صحافتی مسلک اور نظریہ کو جاننے کے لیے ان کے مضمون 'ہفتہ وار صحافت کے آداب' کا مطالعہ بہت ضروری ہے اس مضمون میں مولانا نے اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں صحافت کے مقاصد اور اس کی قدر و قیمت کا تعین کیا ہے۔ مولانا کا یہ مضمون ۲۹ مارچ ۱۹۶۸ء میں 'صدق جدید' میں شایع ہوا تھا۔ صحافت کے آداب واصول مولانا ہی کے زبان میں ملاحظہ ہو۔

''(۱) مقصود خدمت دین وملت رکھیے۔ عام خدمت خلق بھی اس کے تحت آتی ہے۔

---

[1] مولانا عبدالماجد دریابادی احوال وآثار: ڈاکٹر تحسین فراقی: ص: ۶۹۳-۶۹۴

(۲) وطن کا بھی بڑا حق ہے جس طرح پڑوسی کے، استاد کے اور اہل خاندان کے ہوتے ہیں۔ البتہ مسلمان پرستار وطن کا نہیں ہوسکتا عبودیت کا یہ خصوصی تعلق صرف ذات حق کے لیے مخصوص ہے۔ اس کے مخلوق میں کسی کے حصے میں نہیں آسکتا۔

(۳) خبر برائے خبر نامہ کا روز نامہ میں جو بھی درجہ ہو ہفت روزہ میں تو یہ ایک تقریباً مہمل چیز ہوگی۔ ہفت روزہ میں اپنے تبصرے سے یا کم از کم خبر کی سرخی ہی سے، ہر خبر کو با مقصد بنا کر پیش کیجیے۔

(۴) پبلک کے جذبات کی محض نمائندگی پر ہرگز اکتفا نہ کرنا چاہیے۔ پبلک کے مذاق اور جذبات کے اصلاح کی کوشش کیجیے۔

(۵) اپنی مقبولیت اور مرجعیت کا خیال کسے نہیں ہوتا؟ ایک حد تک یہ قدرتی ہے لیکن اس جذبہ کو ہمیشہ حدود کے اندر رکھیے اور اپنے اوپر غالب ہرگز نہ آنے دیجیے۔

(٦) صحافت ایک قسم کی تجارت نہیں بلکہ ایک قسم کی عبادت ہے۔ بس اسی کو نصب العین بنا کر ہمیشہ اپنے سامنے رکھیے۔

(۷) دوسروں کا احتساب ہر پبلک معاملہ میں ضرور کیجیے لیکن اپنے کو احتساب سے بالا خیال نہ کیجیے۔ احتساب نفس کو سب پر مقدم رکھیے۔

(۸) بلا وجہ معقول کے کسی کی دل آزاری کیا معنی، دل شکنی کو بھی گوارا نہ کیجیے اور مروت کے بھی حدود قائم کر لیجیے، ان سے آگے قدم نہ رکھیے۔

(۹) ملک کی اکثریت کا اور حکومت وقت کے قانون کا لحاظ ضرور رکھیے۔ حتی الامکان راہ سلامت روی اختیار کیجیے۔ لیکن مرعوبیت اور احساس کمتری تک ہرگز نہ پہنچ جایئے۔ صلح جوئی دوسری چیز ہے اور بزدلی اور خوشامد بالکل دوسری چیز ہے۔

(۱۰) بلا وجہ کسی سے نہ الجھیے، نہ خواہ مخواہ تکرار پیدا کیجیے لیکن دوسری طرف دیکھیے اور گریے بھی نہیں۔

(۱۱) پبلک تنقید آزادی سے کیجیے۔ لیکن ذاتیات پر اتر آنے سے اپنے کو اہتمام کے ساتھ بچائیے۔ کسی کے نسب پر، وطن پر، یا شکل وصورت پر طنز کرنا سب ذاتیات ہی کی شکلیں ہیں۔

(۱۲) مزاح، شگفتگی، خوش طبعی، علامت شرافت نفس کی اور تفضیح تضحیک اور پھکڑ بازی علامتیں دنایت اور سفلہ پنی کی۔ اس فرق عظیم کو ہمیشہ نظر میں رکھیے۔

(۱۳) آپ بھی بہر حال انسان ہیں اور سارے بشری جذبات رکھنے والے، غصہ سے آپ بھی بھڑک اٹھتے ہیں ایسے موقع پر نفس کو قابو میں رکھنا ہی آپ کی بلند کرداری کی دلیل ہوگی۔

(۱۴) دیانت کے امتحان بھی اس راہ میں سخت سے سخت آتے رہتے ہیں۔ اپنے کو بچانے کا اہتمام سامنے رکھیے۔

(۱۵) غلطی کا امکان ہر بشر کی طرح آپ کے لیے بھی ہے۔ غلطی کا علم ہو جانے پر اس کے اعتراف سے، اسے واپس لینے سے، اس پر معذرت کرنے سے شرمایے اور جھجکیے نہیں۔

(۱۶) جس طرح زبان سے نکلی ہوئی ایک ایک بات قابل گرفت ہوتی ہے۔ اسی طرح قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ بھی جرح کی ضد میں آسکتا ہے۔ خیال کریے اور ڈرتے رہیے اس وقت جب آپ کا سارا دفتر آپ کے سامنے ہوگا اور آخری اور حقیقی عدالت میں اس کے ایک ایک لفظ پر سوال ہو رہا ہوگا۔"[۱]

مولانا ماجد مفسر قرآن اور مبلغ اسلام تھے۔ اسی وجہ سے انھوں نے صحافت کو اصلاح اور تعمیر و ترقی کا ذریعہ تصور کیا۔ ان کی نظر میں صحافت ایک ایسا موثر ذریعہ تھا، جس سے قوم کی اصلاح و رہبری کا کام بحسن خوبی لیا جا سکتا ہے۔ اور انھوں نے صحافتی حربے کا استعمال بڑی کامیابی اور ایمانداری سے کیا۔ مولانا کی

---

[۱] ہفتہ وار صدق جدید: ۲۹ مارچ ۱۹۶۸ء

پالیسی یا ان کے نقطہ نظر سے تو کسی کو اختلاف ہوسکتا ہے مگر ان کے استدلالی و منطقی انداز تحریر اور دلکش اسلوب نگارش سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔

بحیثیت ایک باکمال صحافی مولانا کو مرتبہ امتیاز و اختصاص حاصل تھا۔انھوں نے اردو صحافت کو اعتبار و استناد عطا کیا، اپنی انشا پردازی اور زبان کی خوبیوں کی بنا پر وہ اپنے معاصر صحافیوں پر فوقیت رکھتے تھے۔اور ملک میں اعتدال ،اعلاء کلمتہ الحق اور مذہب اور وطن سے محبت کی بنا پر مقبولیت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے حوصلہ بڑھانے اور ان کے مفادات کی نگہبانی جس طریق احسن سے انھوں نے انجام دی وہ تاریخ میں زریں الفاظ سے لکھی جائے گی۔ان کو بجا طور پر خدنگ آخریں کہا جاتا تھا۔ سچ ،صدق اور صدق جدید کا شمار اعلی اخباروں میں کیا جاتا ہے۔ جو اپنی مستند زبان ،حق گوئی اور افادیت کے لحاظ سے صحافت اور اردو ادب کے ادب العالیہ میں شامل ہیں ۔

باب ششم

عبدالماجد دریابادی اور مختلف اصناف ادب

(سفرنامہ نگار، مترجم، مکتوب نگار)

باب ششم

عبدالماجد دریابادی اور مختلف اصناف ادب

(سفرنامہ نگار، مترجم، مکتوب نگار)

سفرنامہ نگار

مولانا عبدالماجد دریابادی کے تخلیقی و ادبی کارناموں میں ان کے سفرنامے بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ جن میں مولانا کا نادر اسلوب، دلکش انداز تحریر اور حکمت و موعظت، فکر و فلسفہ، تجربات و مشاہدات کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ مولانا نے اپنی انتہائی مشغولیت، خلوت پسندی، پابندی اوقات کے باوجود ضرورت کے تحت ملک اور بیرون ملک کے متعدد سفر کیے، اور اپنے مشاہدات اور تجربات کو قلم بند کر کے اور اپنے ہفتہ وار جرائد میں شایع کیا کرتے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں مولانا ماجد اپنی شریک حیات کے ساتھ حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے، اور وہاں سے واپسی کے بعد مولانا نے حج بیت اللہ سے متعلق تاثرات، مشاہدات کو ایک سچے عاشق رسول کی حیثیت سے لکھا۔ مولانا کا یہ سفرنامہ ہفتہ وار 'سچ' میں قسط وار شایع ہوا، اس کو عوام و خواص میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ عوامی مقبولیت کی وجہ سے اس کو 'سفر حجاز' کے نام سے کتابی شکل میں شایع کیا۔ اس کتاب کی مقبولیت اور اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اب تک 'سفر حجاز' کے پانچ ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں۔ زبان و بیان کے لحاظ سے یہ کتاب حج کے سفرناموں میں امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔

مولانا نے پاکستان کا دو مرتبہ سفر کیا پہلی بار اپریل ۱۹۵۵ء میں پاکستان کے گورنر جنرل غلام محمد کی دعوت پر کراچی اور لاہور کا اور دوسرا سفر ۱۹۵۸ء میں لاہور میں منعقد ہونے والے ایک اسلامی مذاکرے میں شرکت کے لیے کیا۔ اس کے علاوہ مولانا نے اندرون ملک کے متعدد مقامات بمبئی، بہار، بھوپال، حیدر آباد، دہلی، کلکتہ، مدراس، علی گڑھ، آگرہ، جے پور وغیرہ کے سفر کیے یہ اسفار خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ مولانا کے ان سفرناموں کا تفصیلی مطالعہ پیش کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ صنف سفرنامہ کا

اختصار سے جائزہ لیا جائے، تاکہ مولانا کے سفر ناموں کی تفہیم وتشریح اور اردو ادب میں ان کے صحیح مرتبہ کا پتہ لگایا جاسکے۔

سفر نامہ اردو ادب کی ایک مفید صنف ہے۔اس کے ذریعہ معاشرہ کے تاریخی، جغرافیائی، مذہبی، تہذیبی، سیاسی، سماجی احوال وکوائف سے آگاہی حاصل ہوتی ہے، اور بیرون ملکوں کے اقتصادی، معاشرتی، سیاسی، تہذیبی حالات کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اردو ادب وانشا کی خوبیوں سے لطف بھی اٹھایا جاسکتا ہے۔اس کی تاریخی وثقافتی اہمیت اظہر من الشّمس ہے۔سفر نامہ لکھنے کا رواج حج بیت اللہ شریف اور مقامات مقدسہ سے جڑا ہوا ہے۔مسلم عالموں اور ادیبوں اور سیاحوں نے اس مقدس سرزمین کے بارے میں اپنے احساسات قلم بند کیے۔حج وزیارت کی غرض سے نکلنے والے مسافروں کو راستے میں مختلف ملکوں کے دلکش اور عجیب مناظر دیکھنے کو ملتے اور دوران سفر مختلف قوموں کی تہذیب وتمدن اور معاشرت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا تھا، اوران تمام تجربات سے گذرنے کے بعد حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوتی، جس سے فراغت کے بعد وہ اپنے قلم کے ذریعہ دوسروں کو اپنی کہانی سناتے۔ان لکھنے والوں میں ابن حوقل بغدادی، اسطخری فارسی، حکیم ناصر خسرو، ابن جبیر اندلسی ابن بطوطہ مغربی اور بہت سے غیر ملکی عالم اور سیاح شامل ہیں جنھوں نے اپنے سفر کا آغاز اسی نیت سے کیا تھا، اور انھیں جب سیر وسیاحت کی عادت اور دلچسپی پیدا ہوگئی تو ان لوگوں نے دنیا کے گوشے گوشے کا مشاہدہ کیا۔اور دنیا کی تمام چیزوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا، اور دوران سفر پیش آنے والے تمام حادثات، واقعات، تجربات ومشاہدات کو قلم بند کر کے اپنے اسفار کی روداد پیش کی، جن کو سفر نامہ کا نام دیا گیا۔ہندوستان اور دنیا بھر کے ممالک سے لوگ ہر سال حج وزیارت کی غرض سے جاتے رہتے ہیں، اوران میں حساس وتخلیقی ذہن رکھنے والے افراد بھی ہوتے ہیں، جو سفر کے واقعات اور تاثرات کو قلم بند کرتے ہیں۔

اردو کی بیشتر اصناف کی طرح سفر ناموں کی ارتقاء ونشر واشاعت فارسی اور عربی کی مستند روایات کے اتباع میں ہوا۔مثلاً سفر نامہ حکیم ناصر خسرو ۱۰۴۶ء۔۱۰۵۲ء، ابن بطوطہ کا سفر نامہ 'رحلتہ ابن بطوطہ ۱۳۵۵ء، عبدالحق محدث دہلوی کا جذب القلوب الی دیار المحبوب' ۱۵۹۲ء، شاہ ولی اللہ کا 'فیوض الحرمین ۱۳۳۰ء۔۱۳۳۱ء، شیفتہ کا 'رہ آورد ۱۸۳۱ء، جبکہ اردو میں حج کا اولین مطبوعہ سفر نامہ منصب علی خاں کا

تحریر کردہ 'ماہ مغرب المعروف بہ کعبہ نما' ۱۸۷۱ء کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد علیم الدین کا 'رسالہ حج' ۱۸۹۲ء، محمد حفیظ اللہ کا 'سفر نامہ عرب' ۱۸۹۴ء، مرزا عرفان علی بیگ کا 'سفر نامہ حجاز' ۱۸۹۵ء، وغیرہ۔ ابتدائی عہد کے حج کے یہ سفر نامے فنی و ادبی اعتبار سے ممتاز ہیں۔ حج کے سفر ناموں کو فروغ دینے میں بیسویں صدی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس دور میں سفر نامے فنی و ادبی اعتبار سے زبان و بیان اور تخلیقی شان کے اعتبار سے بڑے اہم ہیں۔ احمد حسین کا 'سفر نامہ حجاز و مصر' ۱۹۰۴ء، محمد عبدالرحیم نقش بندی کا 'سفر حرمین الشرفین و ذکر مدینہ' ۱۹۱۲ء، حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کا 'الفوز العظیم' ۱۹۶۸ء، غلام رسول مہر کا 'سفر نامہ حجاز' ۱۹۸۴ء، وغیرہ۔ اسی زمانے میں مولانا ماجد دریا بادی کا مشہور سفر نامہ 'سفر حجاز' کے نام سے شایع ہوا۔ یہ سفر نامے اپنے لکھنے والوں کے فکری، قلبی، ذہنی، احساسات کے ترجمان و نمائندہ ہیں۔ اس کے علاوہ ابھی اردو میں بہت سے حج نامے لکھے گئے ہیں۔ جن کی تعداد اچھی خاصی ہے، اور ان میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

یوں تو اردو میں حج کے سفر ناموں سے تقریباً ۲۴ سال قبل ہی اردو ادب میں یوسف کمبل پوش نے سفر نامہ کی ابتدا کر دی تھی۔ لیکن اس صنف کو فنی و ادبی نقطہ نظر سے جمال و کمال تب ملا جب حج کے سفر ناموں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اردو ادب کی تاریخ میں اب تک کی تحقیق کے مطابق فنی و ادبی نقطہ نظر سے سب سے پہلا سفر نامہ یوسف کمبل پوش کا 'عجائبات فرنگ' ۱۸۴۷ء ہے۔ یہ سفر نامہ سفر نامے سے زیادہ سیاحت نامہ معلوم ہوتا ہے۔ سفر نامہ کی تعریف اہل قلم کے مطابق وہ روداد ہے جو مختلف ضروریات کی غرض سے کیے جانے والے سفر کے متعلق لکھی جاتی ہے۔ جبکہ سیاحت وہ روداد ہے جو من کی موج اور سیر و تفریح کی غرض سے کیے جانے والے سفر کے متعلق لکھی جاتی ہے۔ یوسف کمبل پوش نے جو سفر کیا وہ سیر و تفریح کی غرض سے تھا۔

سفر نامہ کی خصوصیات کے متعلق مختلف ناقدین کی رائے ہے، کہ لکھنے والے کے پاس کھلا ذہن، مشاہدہ کرنے والی آنکھ، اور خوش آہنگ نثر لکھنے والے کا قلم ہونا ضروری ہے۔ اردو میں جتنے مشہور و مقبول سفر نامے ہیں، ان میں یہ خصوصیت موجود ہیں۔ یوسف کمبل پوش نے جس منظر کو دیکھا اس میں ڈوب کر اس کی ہو بہو تصویر کاغذ پر اتار دی۔ اس کے علاوہ اردو میں اور بھی بہت سے کامیاب سفر نامے لکھے گئے۔ مثلاً مولوی مسیح الدین خان کا سفر نامہ 'سفیر' ۱۸۶۳ء، شبلی کا 'سفر نامہ یورپ و بلاد روم و شام' ۱۹۰۰ء، سلطان جہاں بیگم کا

'سیاحت سلطانی' ۱۹۱۱ء، خواجہ غلام الثقلین کا 'روز نامچہ سیاحت' ۱۹۱۱ء، مولانا محمد علی جوہر کا 'سفر یورپ' سید سلیمان ندوی کا 'سیر افغانستان' کرنل محمد خان کا 'بجنگ آمد' اور مولانا ماجد دریابادی کا 'سیاحت ماجدی' ان کے علاوہ اردو میں اور بھی بہت سے کامیاب سفرنامے لکھے گئے ہیں۔ ان سفرناموں کی اردو ادب میں سیاسی، سماجی، اقتصادی، جغرافیائی اعتبار سے بڑی اہمیت ہے۔ مولانا دوران سفر جن علاقوں اور مقامات وغیرہ گذرے انھوں نے اپنے مطالعہ کائنات اور مشاہدات شعور سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان مقامات کی تاریخی، جغرافیائی، سماجی و معاشرتی احوال کی تصویر کشی بڑے دلچسپ انداز میں کی ہے، اور اپنے قارئین کے لیے عبرت وموعظت کا سامان بھی فراہم کیا ہے۔ یہی عبرت آموزی مولانا کے قلم کی جان ہے، اور قوم وملت کو بیدار کرنے کا بہترین ہتھیار بھی ہے۔ مولانا کے سفرناموں کی خصوصیات اور فنی وادبی قدر و قیمت کو جاننے کے لیے ان کا اجمالی جائزہ لیا جارہا ہے۔

سفر حجاز

۱۹۲۹ء میں مولانا ماجد کو حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی۔ مولانا نے یہ مبارک سفر اپنی شریک حیات کے ساتھ کیا تھا، اس مقدس و مبارک سفر کے تاثرات، مشاہدات، تجربات کو 'سفر حجاز' کے نام سے قلم بند کیا ہے۔ مولانا کا یہ سفرنامہ پہلے ان کے ہفتہ وار 'سچ' (لکھنو) میں قسط وار شایع ہوا۔ اور سچ کے قارئین اسے بڑی دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ اس کے بعد یہ کتابی شکل میں شایع ہوا۔ اس کا دیباچہ مولانا ماجد کے عزیز دوست مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا تھا۔ مولانا کا یہ سفرنامہ ۴۰ مختلف عنوانات کے تحت لکھا گیا ہے۔ کچھ کے نام درج ذیل ہیں۔ روانگی، بمبئی، جہاز، سمندر، جدہ، آستانہ نبوت، زیارت اور آداب زیارت، دیار حبیب، کعبہ مقصود، دیار خلیل، عرفات، مکہ، حج رب البیت، رخصتی وغیرہ۔ مولانا کی زندگی میں ہی اس کے تین ایڈیشن ختم ہو چکے تھے۔ چوتھا ایڈیشن مولانا کے بھتیجے اور خویش حکیم عبدالقوی دریابادی مرحوم نے انشائے ماجدی کلکتہ سے شایع کرایا، اور اس کا پانچواں ایڈیشن نعیم الرحمٰن صدیقی کی تحریر 'پیش گفتار' کے ساتھ صدق فاؤنڈیشن سے شایع ہوا۔ نعیم الرحمٰن صدیقی 'پیش گفتار' میں لکھتے ہیں۔

> ''مولانا عبدالماجد دریابادی کا یہ سفرنامہ ۱۹۲۹ء میں ان کے مشہور ہفتہ وار اخبار 'سچ' لکھنو میں قسط وار شایع ہوا اس کے بعد ان کی زندگی میں کتابی شکل

میں تین مرتبہ طبع ہوا۔ ۱۹۸۰ء میں مولانا کے برادرزادہ اور خویش حکیم عبدالقوی دریابادی نے مولانا ماجد کے مخلص معتقد حاجی منظور علی لکھنوی کے ادارہ انشائے ماجدی کولکاتا سے اس کا چوتھا ایڈیشن بڑے اہتمام اور نفاست کے ساتھ شایع کروایا۔ حکیم صاحب نے اس ایڈیشن کے لیے جو تحریر لکھی تھی وہ بطور 'پیش لفظ' شامل کتاب ہے۔ برسوں سے یہ کتاب نایاب تھی۔ اب اسی کا عکس لے کر اس کا پانچواں ایڈیشن صدق فاؤنڈیشن کی جانب سے شایع ہورہا ہے۔''[1]

مولانا ماجد کا یہ سفرنامہ ان کے قلبی تاثرات، احساسات کا ایسا صاف اور روشن آئینہ ہے جس میں عاشقان رسول اپنا چہرہ دیکھ سکتے ہیں۔ 'سفر حجاز' میں انھوں نے اپنے عینی مشاہدات اور قلبی کیفیات اور روحانی تاثرات جو انھوں نے مکہ مکرمہ کی زیارت سے حاصل کیا تھا، اسے والہانہ انداز میں اس طرح پیش کیا ہے کہ مطالعہ کرتے وقت قاری وجد میں آجاتا ہے۔ کہیں کہیں مولانا نے اس میں موقع و محل کے لحاظ سے اسلام کی خصوصیات اور قرآن، حدیث، رسولؐ سے متعلق واقعات کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس سفرنامہ کے حوالے سے مولانا ماجد کی طرز تحریر، سادگی اور تخیل وغیرہ کی اہمیت کا اعتراف سید سلیمان ندوی نے دیباچہ میں اس طرح کیا ہے۔

''اس سفرنامہ کی اصلی حقیقت اور حقیقی عزت میری نگاہ میں دو باتوں سے ہے۔ ایک اس کی انشاپردازی کہ مصنف کے قلم نے اس میں انتہائی سادگی کا کمال حسن دکھایا ہے۔ سہل الفاظ، سادہ ترکیبیں اور پھر شاعرانہ تخیل، اس لیے انشا کی حیثیت سے اس کی اہمیت بہت کافی ہے۔ دوسری چیز وہ تاثرات اور وجدانیات ہیں جو اس کتاب کے فقرہ فقرہ سے نمایاں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صاحب دل مصنف نے کاغذ کی سطح پر اپنے دل کے ٹکڑے پھیلا دیے ہیں۔ میں سفر حجاز کی یہ بھی برکت سمجھتا ہوں کہ ان کے قلم نے ان کے دل کی ایسی ترجمانی کی ہے اور روح نے جسم کا ایسا قالب اختیار کیا ہے کہ باطن ظاہر، محجوب منکشف، اور نادیدہ دیدنی ہوگیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ فاضل مصنف کی

---

[1] پیش گفتار سفر حجاز: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۱۸

تصنیفات میں ان کے قلم کی یہ سرسری تحریریں سب سے زیادہ دیرپا، سب سے زیادہ سودمند اور سب سے زیادہ مقبول ہونگی۔ مسئلہ حجاز میں موصوف کے سیاسی مسلک سے ہر چند ہم کو پورا اتفاق نہ ہو، تاہم اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ انھوں نے یہ صفحات لکھ کر ہماری زبان ادب، تاریخ، جغرافیہ اور تصوف سب پر احسان کیا ہے۔ اور ظاہر و باطن لفظ و معنی اور روح و جسم کے مختلف مناظر ومظاہرہ کا ایک ایسا دلکش نظارہ گاہ تیار کیا ہے کہ ہر خیال و ذوق کا آدمی اپنے اپنے خیال و ذوق کے مطابق اس سے بہرہ ور ہوسکتا ہے۔''[۱]

مولانا ماجد کے سفرنامہ کو نعیم الرحمٰن صدیقی نے حج کے تمام سفرناموں میں 'سفرحجاز' کو گل سرسبد کہا ہے وہ لکھتے ہیں۔

''حج بیت اللہ کا یہ مبارک سفرنامہ ایسے خامہ صدق نگار کا شاہکار ہے جو ایک زمانے تک تشکیک وارتیاب کی گھاٹیوں میں سرگرداں رہنے کے بعد بتوفیق الٰہی اسلام اور اسلامی تعلیمات کی شرح وتفسیر اور ترجمانی کے لیے اپنے کو وقف کر چکا تھا۔ بلاخوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ 'سفرحجاز' اپنے عہد میں لکھے ہوئے حج کے سفرناموں میں گل سرسبد کی حیثیت بھی رکھتا ہے اور اولیت کا شرف بھی۔ حج کا یہ ماجدی سفرنامہ مولانا دریابادی کے باطنی احساسات وجذبات کے مدوجزر کی ایک انوکھی داستان ہے۔ یہ سفرنامہ مولانا دریابادی کے قلبی تاثرات واحساسات کا ایک ایسا مجلی ومصفی آئینہ ہے جس میں عاشقان رسول اپنا چہرہ دیکھ سکتے ہیں۔ یہ محبت اور والہانہ شیفتگی جو صدہا برس سے فرزندان توحید کا مایہ افتخار ہے۔''[۲]

مولانا نے سفرحجاز میں پہلا عنوان 'الوداع' کے نام سے لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے احباب، عزیز واقارب، سچ کے قارئین اور اسٹاف کو مخاطب کر کے خلوص وفا کے ساتھ الوداعی کلمات لکھے ہیں، اور معافی ومعذرت بھی طلب کی ہے، اور آخر میں بارگاہ یزدی میں یہ دعا کی ہے کہ ان کے اس مبارک سفر کو کامیابی وکامرانی سے ہم کنار کرے۔ مولانا کے یہ جملے رحمت وندامت، خلوص وفا سے لبریز ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

---

۱ دیباچہ سفرحجاز: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۱۱۔۱۲

۲ پیش گفتار سفرحجاز: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۱۳

''یہ الوداع ہے ماہ رمضان کی سالانہ 'الوداع' نہیں ناظرین 'سچ' سے ان کے خادم مدیر سچ کی الوداع ہے.....ناظرین سچ تک فرداً فرداً پہنچنا ممکن نہیں۔ان کے حقوق کی ادائی میں مدیر سچ کی جانب سے خدا معلوم کتنی غفلتیں اور کتنی کوتاہیاں اب تک ہوئی ہوں گی اور خدا معلوم کتنوں کی دل آزاریاں ان اوراق کے ذریعہ سے ہو چکی ہوں گی سب کی خدمت میں بمنت ولجاجت گزارش ہے کہ اپنے اس خادم کی بڑی اور چھوٹی ،دانستہ اور نادانستہ ساری خطاؤں کو اللہ کے واسطے صدق دل سے معاف فرمائیں۔وہ جو حاکموں کا حاکم ہے،ان کی خطاؤں کو بھی معاف فرمائے گا.....مولیٰ ہر بیکس کی لاج تیرے ہاتھ میں ہے۔ہر مفلس کا آسرا تیرا ہی دست کرم ہے۔بلایا ہے تو اپنے در سے محروم نہ واپس کرنا،اپنے اس غضب سے پناہ میں رکھنا کہ اس آستان پاک تک پہنچ کر انوار صاحب خانہ کی نوازش سے یکسر محرومی رہے،نہ ہو کہ مکان پر حاضری کے بعد بھی لامکان والے مکین کی تجلیات قبول پذیرائی حجاب ہی میں رہیں بیت کے ساتھ رب البیت کے انوار جمال کی بھی جھلک اپنے ظرف وبساط کے لائق نصیب ہو!....تجھ سے بھاگا ہوا تیرا نافرمان غلام،تیرے اور تیرے حبیب کے آستان پاک پر سر رکھنے کو حاضر ہو رہا ہے،دعاؤں کا قبول کرنا ترے ہی ہاتھ ہے اور دعاؤں کی توفیق دینا بھی تیرے ہی ہاتھ میں ۔''[۱]

حج کا سفر سیر وتفریح یا دنیاوی ضروریات کی غرض سے نہیں، بلکہ بارگاہ خداوندی میں حاضری کے لیے،اور اپنے پروردگار سے رحمت وبرکت چاہنے کے لیے اور گناہوں سے طوبہ واستغفار کے لیے کیا جاتا ہے۔ان جذبات واحساسات کو مولانا نے اپنے مخصوص ومنفرد انداز میں بیان کیا ہے،وہ لکھتے ہیں۔

''سفر سیر وتفریح کے لیے نہ تھا 'تحصیل 'علوم' و 'تکمیل 'فنون' کے لیے نہ تھا علمی وادبی 'تحقیقات' تاریخی واثری 'تفتیش' کے لیے نہ تھا۔کشمیر وشملہ کا نہ تھا،لندن وپیرس آکسفورڈ وکیمبرج کا نہ تھا ہاں وہاں کے لیے بھی نہ تھا جہاں

---

[۱] سفر حجاز: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص:۲۲-۲۵-۲۶

گرج گرج کر تقریریں کی جاتی ہیں۔اور جھگڑ جھگڑ کر ریزولیشن پاس ہوتے ہیں، سفر چلچلاتی ہوئی ریگ والی زمین کی طرف تھا۔گرمی کے موسم میں اس آسمان کی چھت کے نیچے تھا جس کا آفتاب تمتمایا ہوا ہوتا ہے۔ ہوٹلوں اور پارکوں، آبشارون اور سبزہ زارون کی طرف نہ تھا، خشک اور چٹیل میدانوں، بے آب وگیاہ ویرانوں اور آگ اور خاک برسانے والے ریگستانوں کی جانب تھا۔ایک گنہ گار امتی اپنے شفیع وشفیق آقا کے آستانے پر حاضر ہو رہا تھا۔بندے کی حاضری اپنے مولیٰ کے دربار میں تھی بھاگا ہوا غلام تھک کر، ہار کر، پچھتا کر اور شرما کر پھر اپنے مالک کی طرف رخ کر رہا تھا، ذرہ آرزومند تھا کہ آفتاب کی تابش سے جگمگا اٹھے، قطرہ کو ہوس ہوئی کہ بحر بیکراں کے وصل کا لطف اٹھائے۔ مشت خاک کو یہ دماغ ہوا کہ نور پاک کے جاروب کشوں کی فہرشت میں اپنا نام لکھائے جو کچھ بھی نہ تھا، اسے یہ ولولہ ہوا کہ جو سب کچھ ہے اس سے تعلق وپیوند پیدا کیا جائے۔''[۱]

مولانا کا یہ سفر نامہ عبرت وموعظت ،حکمت ودانائی سے لبریز ہے۔مولانا دراصل اسلام کے علم بردار اور مسلم قوم کے پاسباں تھے، اور ہمیشہ قوم وملت کی اصلاح وفلاح کے لیے کوشاں رہتے تھے۔اسی لیے وہ اپنی تحریروں میں تبلیغ کا پہلو نکال لیا کرتے تھے۔دوران سفر سمندر تو سبھی نے دیکھا ہوگا مگر مولانا نے اسے ایک دوسرے نقطہ نظر سے دیکھا اور اپنے منفرد اسلوب میں اس کو پیش کیا ہے۔مولانا دراصل مغرب کی مکاریوں، فریب کاریوں سے بہت متنفر تھے، جس کا اظہار انھوں نے یہاں کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ دنیا اور اس کے ساز وسامان ایک دن سب فنا ہو جائیں گے ،صرف خدا کی ذات باقی رہے گی۔حکمت وبصیرت سے پر مولانا کی یہ تحریر ملاحظہ ہو۔

''دل نے کہا کہ یہی وہ سمندر ہے جس کی بابت ارشاد ہوا ہے کہ اگر سارا سمندر روشنائی بن جائے اور اسی جیسا ایک اور سمندر بھی روشنائی بنا دیا جائے جب بھی قدرت الٰہیہ کے بحر بیکراں کے کلمات لکھنے سے قاصر رہے گا

---

[۱] سفر حجاز: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص:۳۱۔۳۲

لیکن روشنائی آئندہ ہی کیوں بنے روشنائی تو یہ اب بھی بنا ہوا ہے۔ نیلی روشنائی ہی کی طرح نیلا ہے۔ بحر قدرت وصنعت کے اتھاہ اور بے پایاں ہونے کا یہ کیسا نادر نمونہ ہے! اسی کے ساتھ ہی نظروں کے سامنے یہ سماں بھی آ گیا کہ ایک روز یہ سارا بحر اعظم یہ سارا لق ودق سمندر موجیں مارتے ہوئے پانی کے بجائے آگ سے لپکتے ہوئے شعلوں اور دھوئیں کے تیرہ تار بادلوں میں تبدیل ہو کر رہے گا یہ وہ دن ہوگا جب 'یاجوج' اپنے مایہ نازگی جہازوں اور آبدوز کشتیوں، اپنے تیل کے چشموں اور اپنے پٹرول کے خزانوں کی بھڑکائی ہوئی آگ کے شعلوں سے لنکا کے روایتی راون کی طرح، خود بھی جل رہا ہوگا۔ اور جب اس کی حرص وہوس، اس کی ملک گیری اور زر پرستی، اس کی (قیصریت) امپریل ازم اور کیپٹل ازم (سرمایہ داری) اور سوشلزم (اشتراکیت) اور کمیونزم (اشتمالیت) اور خدا معلوم کس کس 'ازم' کے انگارے سمندر میں آگ لگا کر خود اسی مادی دنیا میں اس کو دوزخ کا نمونہ دکھا رہے ہوں گے۔ یہ وہ دن ہوگا جب ارشاد ربانی **واذا البحار سجرت** کی تفسیر وتاویل کے لیے نہ تفسیروں کے اوراق الٹنے کی ضرورت ہوگی نہ اہل لغت کے کلام سے سند لانے کی بلکہ عالم وعامی سب اپنی آنکھوں سے مجاز کا نہیں حقیقت کا مشاہدہ کر لیں گے۔ آج 'یاجوج' کو مہلت ہے، آج وہ جتنا چاہے ہمارے دلوں اور دماغوں کو ہماری عقلوں اور ذہنوں کو، ہماری آنکھوں اور کانوں کو اپنے اقبال وچشم سے اپنی تہذیب وتعلیم سے اپنے علوم اور اپنے فنون سے، اپنے ڈاکٹروں اپنے انجینئروں سے، اپنے سائنس اور اپنے آرٹ سے، اپنی توپوں اور اپنی رائفلوں سے، اپنی مشین گنوں اور اپنی سنگینوں سے اپنے خزانوں اور اپنے طیاروں سے اپنے بموں اور ایٹم بموں سے مرعوب اور مخبوط اور مفلوج کرے، لیکن یہ مہلت دائمی نہیں، اور کسے خبر کہ پردہ اٹھنے کا وقت قریب ہی آ لگا ہو''[1]

---

[1] سفر حجاز: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۶۳-۶۴

حجاز مقدس کے مشہور شہر جدہ کی تہذیبی، ثقافتی، معاشرتی، سماجی، جغرافیائی صورت حال پر مولانا نے بڑے مدلل اور دلکش انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

''جدہ ہندوستان کے شہر کے معیار سے کوئی بڑا شہر نہیں۔کوئی پندرہ ہزار کی آبادی ہوگی لیکن اپنی جغرافیائی ہیئت کے لحاظ سے اہمیت بہت خاصی رکھتا ہے، بازار اچھا بڑا ہے، ہر قسم کی چیزیں مل جاتی ہیں۔اور گرانی کچھ ایسی زائد نہیں، سکہ ہر ملک کے چل جاتے ہیں.....صفائی کا انتظام خاطر خواہ نہیں، یہاں کی مکھیاں اپنی کثرت کے لحاظ سے ضرب المثل ہیں۔عرب کی سرزمین شروع ہو چکتی ہے۔اس لیے گرمی کی بابت کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے، برف مل جاتی ہے، اگرچہ گراں قیمت پر، پانی کی قدر جہاز ہی سے شروع ہو جاتی ہے،.....جدہ میں میٹھا پانی، یعنی سمندر کا صاف شدہ پانی تلاش سے اور خاصی گراں شرح پر ملتا ہے.....کھاری سمندری پانی البتہ بہ افراط، مکانات کی وضع بمبئی کے مکانات سے ملتی جلتی، یعنی صحن کا رواج برائے نام اور اوپر تلے چار چار پانچ منزلوں کا رواج عام، انھیں کمروں کو کھڑکیوں کی مدد سے خاصا ہوا دار بنا لیا جاتا ہے۔ہندوستان کے لوگوں کو جس شے کی زیادہ تکلیف ہوتی ہے، وہ یہاں کے پاخانے ہیں، مہتروں کی قسم سے کوئی قوم یہاں موجود نہیں، نتیجہ یہ ہے کہ مکان میں بہت گہرے سنڈاس، کنوئیں کی طرح گہرے بنے ہوئے ہیں انھیں میں رفع حاجت کی جاتی ہے۔اور ان کی عفونت مکان کے دوسرے حصوں تک پھیلی رہتی ہے زبان موجودہ بگڑی ہوئی عربی ہے، جسے قرآن مجید کی عربی سے کوئی نسبت نہیں، تاہم اردو بھی اچھی خاصی سمجھ لی جاتی ہے، اور محض اردو داں بھی اپنا کام نکال لیتے ہیں۔حاجیوں کے ہجوم کے زمانہ میں ہر ہر گھر مسافر خانہ بنا ہوا،.....جدہ سرزمین عرب کا پھاٹک ہے، حکومت اسلام کا پہلا شہر ہے، برا یا بھلا جیسا بھی ہے اپنا ہے، اپنوں اور اپنے والوں کی چاہت کسے نہیں ہوتی؟''[1]

---

[1] سفر حجاز: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۸۰۔۸۱۔۸۲

روضہ نبوی کی زیارت ہر مسلمان کی دلی خواہش ہوتی ہے تمام حاجی روضہ نبوی کی زیارت سے آنکھوں میں نور اور دلوں میں سرور محسوس کرتے ہیں۔ رسول اکرمؐ کے جسد اطہر کو حضرت عائشہؓ کے حجرے مبارکہ میں دفن کیا گیا تھا۔ لیکن مرور ایام کے ساتھ ساتھ اب روضہ مبارکہ متعدد حفاظتی دیواروں کے پیچھے چھپ گیا ہے۔ اس لیے زیارت کرنے والے سنہری جالی کو دیکھ کر ہی قلب ونظر کو سکون فراہم کرتے ہیں۔ مولانا نے 'روضہ جنت' کے عنوان سے روضہ نبوی کی تعمیرات اور حفاظتی انتظامات پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

''اللہ ٹھنڈا رکھے، اگلوں کی تربتوں کو، تربت مبارک کی حفاظت اور لوگوں کی نظر سے مخفی رکھنے کا کیسا کیسا انتظام کر گئے ہیں، دین کے بادشاہ کا جسد مبارک جہاں مع دونوں وزیروں صدیقؓ وفاروقؓ کے آرام فرما ہے۔ وہ ام المومنین عائشہؓ صدیقہ کا حجرہ تھا۔ ستر اسی سال تک یہ حجرہ اپنی اصلی حالت میں زیارت گاہ خلائق بنا رہا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جمال دیکھنے والے اور ان دیکھنے والوں کے دیکھنے والے ایک ایک کر کے اٹھتے جارہے تھے، ہجرت کی پہلی صدی ابھی ختم بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ خلیفہ ولید کے حکم سے والی مدینہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے (اپنے دور خلافت سے قبل ہی) ایک مستحکم سنگی عمارت حجرہ صدیقہ کے گرداگرد تعمیر کرا دی جس میں کوئی دروازہ نہ رکھا، تربت اطہر تو حجاب میں تھی ہی اب حجرہ شریفہ بھی اس حجاب میں آگیا اور مشتاقان جمال کو اس بیرونی عمارت کی زیارت پر قناعت کرنا پڑی کچھ روز کے بعد مزید تحفظ کے خیال سے ایک اور احاطہ پتھر کے ستونوں اور محرابوں کا اس عمارت کے اردگرد بھی بنا دیا گیا اور گنبد خضرا اسی احاطہ پر قائم ہے۔ اس احاطہ پر کلمہ طیبہ سے منقش پردے پڑے رہتے ہیں اور اس کے دو دو ہاتھ کے فاصلہ پر چاروں طرف فولاد یا پیتل کی زرد جالیوں کی دیواریں ہیں اور اب زائر کے پیش نظر صرف یہی جالیاں رہتی ہیں یہ اہتمام اور انتظام چودھویں صدی ہجری اور بیسویں صدی عیسوی میں جس پہلو اور جس اعتبار سے

بھی دیکھیے سرتا سر ضروری ومناسب نظر آئے گا تربت مبارک اگر بغیر اتنے حجاب کے کہیں کھلے میدان میں ہوتی تو شریعت سے بیگانے اہل ہوس واہل بدعت خدا معلوم اب تک کیا کر گزرے ہوتے! اور پھر جو اہل نظر ہیں وہ اس نظارہ بے حجاب کی تاب کیوں کر لا سکتے ان کے علاوہ اور بھی متعدد مصلحتیں ہیں جو ہر غور کرنے والے کی سمجھ میں آسکتی ہیں۔''[1]

'آثار مدینہ' کے عنوان سے مولانا نے مدینہ منورہ کی اہمیت اور فضیلت پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے، عصر حاضر میں ملت اسلامیہ جن مسائل ومصائب سے دو چار ہے۔ ان کا تذکرہ بڑے پرسوز اور مغموم انداز میں کیا ہے، اور قوم کی تعمیر وترقی کے لیے دعا گو بھی نظر آتے ہیں۔

''یہ وہ جگہ ہے جہاں اللہ کے سب سے زیادہ تعریف کرنے والے اور سب سے زیادہ تعریف کیے گئے بندہ کو اس وقت پناہ ملی تھی، جب اس کے وطن والے اس کے خون کے پیاسے ہو چکے تھے، **غنی عن العالمین** کی شان بے نیازی کا کوئی ٹھکانہ ہے۔ پناہ ڈھونڈنی پڑی تھی جو خود اس واسطے بنایا گیا تھا کہ سارا عالم اس کی پناہ میں آئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آئینے میں امت کی ساری تاریخ کا عکس دکھایا گیا، جس رسول (صلعم) پر ایک روز مکہ کی زمین تنگ کر دی گئی تھی آج اس کی امت پر عرصہ عالم تنگ ہے۔ رسول (صلعم) کی جان کے دشمن ایک ابو جہل اور ایک ابو لہب تھے۔ رسول کی عزت کے، رسول (صلعم) کے پیام کے، رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دین کے دشمن آج خدا معلوم کتنے ابو جہل اور کتنے ابولہب پیدا ہو گئے ہیں ان مکی دشمنان حق کا خاتمہ ہلاکت وبربادی پر ہوا تھا۔ کیا یہ بیسویں صدی عیسوی کے 'روشن خیال' اور 'وطن پرست' ابو جہل وابولہب ہمیشہ مہلت ہی پاتے رہیں گے؟ مکہ کے مہاجر کو اپنے رب کا نام پکارنے توحید کا کلمہ بلند کرنے جو قبا کا ایک ٹھکانہ مل گیا تھا، کیا اس محبوب کی امت کی قسمت میں کوئی قبا

---

[1] سفر حجاز: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۱۲۸-۱۲۹

نہیں اور کیا اسے خدانخواستہ ہمیشہ بھٹکتے ہی رہنے دیا جائے گا۔''[1]

مولانا ماجد نے 'سفر حجاز' میں تاریخی واقعات کو بڑے ہی پر تاثیر انداز میں پیش کیا ہے۔ ہر ایک جگہ کا تاریخی پس منظر اور ارکان کو پورا کرنے کے طریقے پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ بطور مثال ابراہیمی کی وجہ تسمیہ اور اس کی تاریخی و روایتی پہلوؤں کو مولانا نے 'دیار خلیل' کے عنوان سے روشنی ڈالی ہے۔

''مقام ابراہیم کا نام کلام مجید میں دو جگہ آیا ہے، لیکن بغیر حاجی ہوئے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ 'مقام ابرہیم' ہے کیا چیز۔ مقام ابراہیم کے لفظی معنی ہیں ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ۔ روایات حدیث میں آتا ہے کہ خلیل اللہ کی تعمیر کے وقت جب خانہ کعبہ کی دیواریں اونچیں ہونے لگیں تو قدرۃً پاڑ باندھنے کی ضرورت محسوس ہوئی حضرت جبرئیل نے ایک پتھر لاکر رب جلیل کے خلیلؑ کی خدمت میں پیش کیا۔ اس پر کھڑے ہو کر اللہ کے گھر کے اس معمار نے کعبہ کی دیواریں بلند کرنی شروع کر دیں جب نیچے سے پتھر گارہ وغیرہ اٹھانے کی ضرورت ہوتی تھی تو یہ پتھر خود بخود لچک کر نیچا ہو جاتا تھا، اور جوں جوں دیواریں بلند ہوتی جاتی تھیں اور اونچے تک ہاتھ پہنچانے کی ضرورت ہوتی تھی یہ پتھر بھی ازخود بلند ہو جاتا تھا، یہ پتھر حجر اسود کی طرح آج تک محفوظ چلا آتا ہے۔ اور بعض روایات میں آیا ہے کہ اس پر اللہ کے خلیلؑ کے قدم مبارک اور انگلیوں کے نشانات تک بنے ہوئے ہیں .....یہ پتھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ حضرت صدیقؓ کے زمانہ تک خانہ کعبہ کی دیوار سے متصل اپنی اصلی جگہ پر رکھا ہوا تھا شاہ عبدالعزیز دہلوی اپنی تفسیر میں سنن بیہقی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ عہد فاروقی میں ایک سیلاب آیا جس سے یہ پتھر اپنی جگہ سے ہٹ کر بہہ گیا، حضرت عمرؓ کو خبر ہوئی تو آپ خود تشریف لائے اور اس پتھر کو دیوار کعبہ سے فاصلہ پر مطاف سے باہر ایک مقام پر رکھوا دیا اور اب وہیں رکھا چلا آتا ہے۔ البتہ اب یہ کھلی ہوئی جگہ میں نہیں ہے بلکہ چھوٹی سی جالی دار کوٹھری بنا دی گئی ہے جس پر ایک قبہ بھی ہے

---

[1] سفر حجاز: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۱۵۳

اسی کوٹھری کے اندر محفوظ ہے پہلے ہر شخص آزادی سے زیارت کرسکتا تھا اب کوٹھری بند رہتی ہے شاید کسی خوش نصیب کو کسی خاص وقت میں زیارت کا موقع مل جاتا ہو۔مطاف کے کنارے مشرق جانب ایک خوبصورت محراب پتھر کی کھڑی ہوئی ہے یہ محراب النبی کہلاتی ہے اس لیے کہ حضورؐ اکثر اسی راستے سے تشریف لاتے تھے اسی محراب کے قریب سمت جنوب میں وہ خوش نما قبہ ہے جس کے نیچے وہ مبارک پتھر کوٹھری میں بند رہتا ہے اور اب مجازاً خود اسی کوٹھری کو مقام ابراہیمؑ کہنے لگے ہیں سننے میں آیا کہ حجر اسود اور اس مقام کے درمیان ۲۷ گز کا فاصلہ ہے۔کہا جاتا ہے کہ یہ پتھر تین بالشت اونچا اور دو بالشت چوڑا ہے اور اس پر چاندی کا پتّر چڑھا دیا گیا ہے،صرف اتنی جگہ جہاں قدم مبارک کا نقش ہے اپنی اصلی حالت پر چھوٹی ہوئی ہے۔''[1]

مولانا سفر حجاز میں قوم وملت کی زبوں حالی پر اشک بار نظر آتے ہیں،اور امت محمدیہ کی دینی ودنیاوی کامرانی کے خوہاں بھی،اور اعجاز مقدس کی سرزمین کی منظر کشی اس انداز سے کرتے ہیں کہ تمام مقامات کی تہذیبی،جغرافیائی،معاشرتی،تاریخی منظر نامے پورے طور پر واضح ہو جاتے ہیں۔مکہ،مدینہ،جدہ،وغیرہ جیسے شہروں کے محل وقوع اور وہاں کے لوگوں کا رہن سہن وہاں کی مساجد،مکانات،آبادی،وغیرہ کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔اس کے علاوہ بھی مولانا نے ان تمام ضروری باتوں کا تذکرہ کیا ہے جن سے ان کا واسطہ دوران سفر پڑا تھا۔مثلاً سواری،کرایہ،جہاز کی تفصیلات وغیرہ۔'رخصتی' کے عنوان سے مولانا نے حج بیت اللہ سے فراغت کے بعد ایک حاجی کو شرعی اعتبار سے جن ارکان کو ادا کرنا پڑتا ہے،ان کی تفصیل اور الوادعی طواف کا تذکرہ بڑے پرسوز وپرتاثیر انداز میں کیا ہے۔مولانا کے جملوں میں ان کے قلبی احساسات وتاثرات کی جھلک نظر آتی ہے۔سادگی،خلوص،سلاست وشیرینی ان جملوں کے خاص اوصاف ہیں۔رخصتی کا آخری حصہ ملاحظہ ہو۔

''رخصتی کا طواف،طواف الودع کہلاتا ہے،مَلک الملوک کے دربار کا یہ آخری سلام ہوتا ہے۔طواف الصدر اور طواف الافاضہ بھی اسی کے نام ہیں۔

---

[1] سفر حجاز:مولانا عبدالماجد دریابادی:ص:۲۲٦۔۲۲۷

یہ طواف وطن واپس جانے والوں پر حنفی مذہب میں واجب ہے البتہ عورتیں
اپنے خاص زمانہ میں اس وجوب سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ طواف اسی طرح ہوگا جس
طرح اور سب طواف ہوتے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں رمل نہیں، باقی
سات چکر کاٹنا، مقام ابرہیم پر دو رکعت نماز پڑھنا۔ زمزم پینا، حجر اسود کو بوسہ
دینا اور موقع ملے تو ملتزم سے لپٹنا یہ سب چیزیں اسی طرح بدستور، رخصت
کے وقت کی بعض دعائیں جو حرم شریف کے دروازہ سے باہر نکلتے وقت پڑھی
جاتی ہیں، کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں معلم اس وقت پڑھا دیتے ہیں۔ بہتر یہ
ہے کہ کعبہ سے جب روانہ ہونے لگے تو الٹے پاؤں درِحرم تک آئے۔ حج کی
مقبولیت کی اور دوبارہ حاضری کی بار بار دعا کرے اور کعبہ سے جدائی پر
آنکھیں روئیں یا نہ روئیں لیکن کم ازکم دل ضرور روتا ہو اور حرم شریف سے
باہر آکر مساکین کو کچھ صدقہ بھی دے دے۔ عصر اور مغرب کے درمیان ہم
لوگوں کا سامان بندھ کر تیار ہوگیا مغرب کی نماز حرم میں پڑھی اور بعد نماز
طواف وداع کے مراتب سے فارغ ہوئے۔ مغرب پڑھے ہوئے کوئی پون
گھنٹہ گزرا ہوگا کہ ہم لوگوں کے قدم حدود حرم شریف سے باہر آگئے یہ وقت بھی
عجیب ہوتا ہے۔ کوئی ہشاش بشاش کوئی غمگین وافسردہ کسی کا دل امیدوں اور
امنگوں سے لبریز اور کسی کا قلب غم وحسرت کے بار سے دبا ہوا، کوئی یہ سمجھ رہا
ہے کہ اب دوبارہ آنکھوں کو یہ دربار کاہے کو دیکھنا نصیب ہوگا کسی کو یقین کہ پھر
آئیں گے اور بار بار آئیں گے اور سو بار اگر وداع ورخصت کی تلخیاں جھیلیں
گے تو ہزار بار حضوری اور وسال کی لذتیں اور حلاوتیں بھی حاصل کریں گے۔
کوئی مغموم کہ کعبہ چھوٹ رہا ہے، کوئی مسرور کہ کعبہ ساتھ چل رہا ہے اپنی اپنی
نسبت اور اپنا اپنا ظرف، کس کو خبر کہ دلوں کے مالک کی نظر میں کس کی نذر
مقبول اور کس کا تحفہ قابل قبول۔"[1]

---

[1] سفر حجاز: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۳۳۲

'سفر حجاز' میں جہاں تاریخی وجغرافیائی معلومات، مقامات مقدسہ کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ وہیں حج وزیارت کے آداب وشرائط، بدعات، ملت اسلامیہ کے زوال اور مسلمانوں کے درخشاں وتابندہ ماضی کا بیان بڑے پر اثر انداز میں کیا گیا ہے۔ سفر حجاز اپنے پرکشش ودلکش انداز بیان اور حکیمانہ نکتہ سنجی، سادہ وشگفتہ اسلوب نگارش کی وجہ سے بہت مقبول رہا ہے۔ عالم اسلام کے مایہ ناز عالم ومفکر مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے اپنے مضمون 'مولانا دریابادی ذاتی تاثر' میں سفر حجاز کی دلکشی ودلآویزی کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے۔

> ''۱۹۲۹ء میں مولانا نے حج وزیارت سے فراغت حاصل کی اور وہ سفرنامہ ان کے قلم سے نکلا جو نہ صرف ان کی تحریروں بلکہ ان لاتعداد کتابوں میں جو اس موضوع پر لکھی گئی ہیں امتیاز خاص رکھتا ہے۔ جہاں تک یاد ہے یہ مولانا کی پہلی کتاب تھی جو میں نے بڑے شغف وانہماک کے ساتھ پوری پڑھی، پڑھتا تھا اور مولانا کے زورِ قلم اور البیلے طرز تحریر پر جس میں ادب واردات قلبی کا نہایت حسین اور دل آویز امتزاج ہے جھوم جھوم جاتا تھا۔''[۱]

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا کا یہ سفرنامہ حسن انشا، زور بیان، سلاست وشگفتگی میں اپنی مثال آپ ہے اور اس کو ادب عالیہ میں ایک مخصوص ومنفرد جگہ حاصل ہے۔

سیاحت ماجدی

'سیاحت ماجدی' مولانا کے مختلف سفرناموں کا مجموعہ ہے۔ اس میں کل ۱۵ سفرنامے شامل ہیں۔ جن میں دو پاکستان کے سفر سے متعلق ہیں، اور باقی ۱۳ ملک کے دوسرے مقامات کے اسفار پر مشتمل ہے۔ یہ سبھی سفرنامے پہلے مولانا کے ہفتہ وار اخبار میں شایع ہوئے، بعد میں ان کی اشاعت کتابی شکل میں ہوئی۔ پاکستان کا پہلا سفرنامہ ۱۹۵۵ء میں مولانا نے پاکستان کے گورنر جنرل غلام محمد کی دعوت پر کیا تھا۔ اس سفر کی روداد 'ڈھائی ہفتہ پاکستان یا مبارک سفر' کے نام سے مولانا کے دیباچے کے ساتھ کتابی شکل میں شایع ہوئی۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور کی دعوت پر مولانا نے پاکستان کا دوسرا سفر ۱۹۵۸ء میں ایک اسلامی مذاکرہ میں شرکت کرنے کے لیے کیا تھا۔ اس سفر کی روداد مولانا نے 'لاہور' کے عنوان سے لکھا ہے۔ اور ملک کے مختلف اسفار کی روداد 'سیاحت ماجدی یا گیارہ سفر' کے نام سے حکیم عبدالقوی دریابادی مرحوم نے اپنے مقدمے کے

---

[۱] مولانا دریابادی ذاتی تاثر (مضمون) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی: فروغ اردو: (عبدالماجد دریابادی نمبر) اگست تا اکتوبر ۱۹۷۷ء لکھنو: ص: ۲۷

ساتھ ادارہ انشائے ماجدی سے شایع کرایا۔اس کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت جناب محمد راشد شیخ نے مولانا کے سبھی سفرناموں کو یکجا کر کے ادارہ علم وفن کراچی سے کرائی، اسی پاکستانی ایڈیشن کا عکس لے کر تیسرا ایڈیشن صدق فاؤنڈیشن لکھنو سے شایع ہوا۔'سیاحت ماجدی' کی اہمیت وافادیت اوراس کی نشرواشاعت کے متعلق نعیم الرحمٰن صدیقی 'پیش گفتار' میں لکھتے ہیں۔

''مولانا کو ماضی کی یاد آفرینی میں کمال حاصل تھا۔ یہ بات اپنی موثر ترین شکل میں ماجدی سفرناموں میں پوری طرح جلوہ گر ہے۔وہ سفر کے دوران میں جن جن علاقوں سے گذرے ہیں وہاں اپنے مطالعے، ذہن اور شعور سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔انھوں نے ان مقامات کے شاندار ماضی کے اوراق بھی پلٹے ہیں اور اپنے قارئین کے لیے عبرت وموعظت کا سامان بھی فراہم کیا ہے۔ یہ عبرت آموزی مولانائے دریابادی کے اسلحہ خانے کا موثر ہتھیار بھی ہے ہمرہان ملت کو بیدار اور ہوشیار کرنے کا کارگر حربہ بھی ہے۔ 'گیارہ سفر یا سیاحت ماجدی' کے نام سے کتابی شکل میں مرتب کر کے یہ مجموعہ مولانا دریابادی کے برادر زادے اور خویش حکیم عبدالقوی دریابادی نے ۱۹۸۰ء میں مولانا کے معتقد محترمی حاجی منظور علی صاحب لکھنوی کے اشاعتی ادارے 'ادارہ انشائے ماجدی' کلکتہ سے شایع کروایا تھا۔ایک تو مولانائے دریابادی کے قلم صدق رقم کی جلوہ گری اس پر مستزاد کتابت وطباعت کا اعلیٰ معیار، کتاب خوب مقبول ہوئی۔جلد ہی اس کا ایڈیشن ختم ہوگیا۔مدت سے یہ کتاب نایاب تھی۔ ۲۰۰۱ء میں مولانا مرحوم کے ایک نادیدہ معتقد جناب محمد راشد شیخ صاحب مالک 'ادارہ علم وفن' کراچی (پاکستان) نے کتاب کو از سرنو ترتیب دے کر اور صدق جدید لکھنو میں شایع شدہ مولاناؒ کے تحریر کردہ تین غیر مدون سفرناموں کا اضافہ اور سفرنامہ پاکستان المعروف بہ 'ڈھائی ہفتہ پاکستان میں یا مبارک سفر' یکجا کر کے شایع کیا۔اپنی تخلیقی شان، تاثر آفرینی، عبرت

زائی، محاکمہ آرائی ،ادبی لطافتوں خصوصا سلاست بیانی اور شگفتہ نگاری کے باعث یہ کتاب اردو کے سیاحتی ادب میں ایک امتیازی شان کی حامل ہے۔کتاب کی مقبولیت اور افادیت کے پیش نظر اسی پاکستانی ایڈیشن کا عکس لے کر اور اس میں ضروری تصحیح وترمیم کے بعد اس کو صدق فاؤنڈیشن کی جانب سے شایع کیا جارہا ہے۔''[1]

مولانا کے سفرنامے اپنی تخلیقی شان اور دلکش انداز بیان کے سبب بڑے مقبول ومشہور ہوئے۔یہ سفرنامے فنی وادبی اعتبار سے بھی بڑے اہم ہیں۔سفرنامہ کے لیے وسیع النظری، وسعت مطالعہ،صداقت نگاری،صدق گفتاری،متوازن ومعتدل طرز نگارش بے حد ضروری ہوتا ہے۔مولانا کے یہ تمام سفرنامے ان خوبیوں سے لبریز ہیں۔ان میں ملک وقوم کی تہذیبی،جغرافیائی،اقتصادی،سیاسی،مذہبی صورت حال کی ترجمانی ملتی ہے،اور ساتھ ہی عبرت وحکمت،فکر وفلسفہ وغیرہ کی بھی آمیزش پائی جاتی ہے۔

'ڈھائی ہفتہ پاکستان میں' مولانا کا سب سے طویل سفرنامہ ہے۔اس کو انھوں نے ۱۸ ابواب میں تقسیم کیا ہے،اور ہر باب کے الگ الگ عنوان ہیں۔مثلاً تقریب سفر پر طرح طرح کی طبع آزمائیاں، مسافر نوازیاں،مشاہدات وزیارت،خاطر داریاں،مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں،لاہور سے کراچی تک، ایک سرسری جائزہ،زہر اور اس کا تریاق،خوشگوار تجربے،پرانی یادیں نئے نظارے،حاصل سفر،اور آخر میں دو ضمیمے بھی ہیں۔'مولانا کہلانے سے قبل' اور 'سفر اور سفر آخرت' وغیرہ۔مولانا کا پاکستان کا سفر ایک نجی قسم کا سفر تھا۔قیام پاکستان کے قبل ہی سے غلام محمد سے مولانا کے گہرے مراسم تھے،اور وہ انھیں کی دعوت پر پاکستان گئے تھے۔لیکن پاکستان میں مولانا ماجد صاحب کی آمد پر ممتاز عالم دین میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہونے لگیں،اور سب سے زیادہ کھلبلی جماعت اسلامی کے قائدین اور اس کے خاص ہمدردوں میں مچ گئی۔ان کا خیال تھا کہ گورنر جنرل غلام محمد نے مولانا ماجد کو یہاں مستقل قیام کے لیے بلایا ہے۔تاکہ جماعت اسلامی کا زور توڑا جاسکے۔اسی طرح نہ معلوم کتنی خیالی اور قیاسی باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔لیکن مولانا جتنا وقت طے کر کے گئے تھے اسی مدت میں واپس اپنے ملک آگئے۔ان واقعات کا تذکرہ مولوی غلام محمد نے اپنے مضمون 'حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی ذاتی تاثرات' میں اس طرح کیا ہے۔

---

[1] پیش گفتار سیاحت ماجدی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص:۴-۵

''مولانا کی پاکستان میں تشریف آوری پر سب سے زیادہ کھلبلی جماعت اسلامی کے عمائدین اوراس کے خاص بہی خواہوں میں مچی ہوئی تھی ان میں سر گوشیاں یہ تھیں کہ غلام محمد صاحب (جو جماعت کے سخت خلاف تھے) نے مولانا کو جماعت اسلامی کے اسلامی اور اس کے امیر کے خلاف قلمی محاصرہ قائم کرنے کے لیے بلایا ہے، اس وقت صرف اپنے شرائط طے کرنے کے لیے مولانا آئے ہیں، شرائط طے ہوتے ہی مستقلاً پاکستان منتقل ہو جائیں گے۔ اورتو اور مولانا ظفر احمد انصاری نے جو جماعت کے غیر ممبر مخلص ترین رضا کار ہیں، مجھ سے پوچھا کہ مولانا عبدالماجد صاحب کیوں آئے ہیں۔ میں نے عرض کیا غلام محمد صاحب کی شخصی دعوت پر محض دوستانہ ملاقات کے لیے! انصاری صاحب بولے ''نہیں مولانا کو جماعت اسلامی کا زور توڑنے کے لیے یہاں مستقلاً بلایا جا رہا ہے''۔ میں نے عرض کیا کہ میں مولانا کے مزاج سے خوب واقف ہوں ان کو کوئی شخص کسی قیمت پر 'استعمال' نہیں کرسکتا، ان کی تائید ہو یا مخالفت وہ ان کی اپنی فکر وفہم کی بنا پر ہوتی ہے، فرمائش یا دباؤ کا وہاں گذر نہیں۔ مگر انصاری صاحب کو یقین نہیں آیا۔ بولے 'دیکھیے گا' میں نے دل میں کہا کہ ہم کیا دیکھیں آپ ہی دیکھیے گا۔ دن گذرتے رہے مولانا کی روانگی کی مدت قریب آ گئی۔ گورنر جنرل پاکستان نے اصرار پر اصرار کیا کہ مولانا ایک ہفتہ اور رک جائیں مگر مولانا نے بس یہی جواب دیا کہ بس اتنی ہی مہلت نکال کر اور اتنی ہی مدت کے لیے صدق اور دوسرے کاموں کا انتظام کر کے چلا تھا ایک دن بھی دیر ہوگی تو نظام میں خلل پڑ جائے گا۔ چنانچہ ٹھیک اپنے پروگرام کے مطابق مولانا یہاں سے روانہ ہو گئے اور رقیبانہ نگاہیں نہ جانے کب تک سامان بدگمانی لیے ان کی واپسی کو تکتی رہیں مگر پھر مولانا کراچی تشریف نہیں لائے۔''[1]

مولانا پاکستان کے سفر کے دوران اپنے ذہن میں یہ سوچتے رہے، کہ قیام پاکستان کا مقصد

---

[1] مولانا دریابادی ذاتی تاثر (مضمون) مولوی غلام محمد: فروغ اردو: (عبدالماجد دریابادی نمبر) اگست تا اکتوبر ۱۹۷۷ء لکھنو: ص: ۳۵

کیا تھا۔اس اسلامی ریاست کے قیام کے لیے کتنے معصوموں کی جانیں گئیں، کتنی عورتوں کی عصمتیں نیلام ہوئیں، نہ معلوم کتنے بچے یتیم ہوئے تب جا کر دنیا کے نقشہ پر اس ریاست کا قیام ممکن ہو سکا۔ مگر افسوس ہے کہ اب یہ مملکت خداداد پر آشوب حالات اور پر خطر راہوں سے گزر رہی ہے۔ مولانا پاکستان کے قیام سے لے کر اس کی موجودہ صورت حال کے متعلق بڑے فکر آمیز اور پر درد لہجے میں لکھتے ہیں۔

''گاڑی چلی اور دماغ کے تصور خانے میں پاکستان کے اگلے پچھلے نقشے پھرنے لگے۔ ترجمان حقیقت اقبال نے کس شوق اور چاؤ کے ساتھ اس 'اسلامی' مملکت کی تحریک دلوں میں قائم کرائی تھی۔ ہزار ہا مخلص جانبازوں نے کس درد مندی سے اس آواز پر لبیک کہی تھی۔ کیا کیا آرزوئیں تھیں اور کیسے کیسے منصوبے! اور اب اس شیریں وخوشگوار خواب کی تعبیر کیا نکل رہی ہے! امت نے اس کے پیچھے کیا کچھ کھویا، اس کے نام پر کیا کیا لٹایا، اور اب اسے حاصل کر کے کیا کیا پایا! نفع نقصان کی میزان کیا رہی! سودا مہنگا پڑا یا سستا!....شام ہوئی، رات کا اندھیرا چھایا، خیالات کی یہ رو جاری تھی۔ کچھ سوتے اور کچھ جاگتے کہ پچھلی رات میں گاڑی یوپی کے حدود طے کر کے سرحد پنجاب میں داخل ہوگئی اور پھر صبح ہونے لگی! یہ انبالہ پڑا، جو کبھی شیخ التبلیغ میر نیرنگ کے دم سے گلزار تھا اور وہ لدھیانہ رہا، یہ سرہند گزرا جسے ایک مجدد وقتؒ کی آرام گاہ آج بھی 'شریف' بنائے ہوئے ہے، اور وہ راجپورہ نکلا یہاں تک کہ دن کے اجالے میں جالندھر آ گیا۔ یہاں ابھی کل کتنے عالم و فاضل آباد تھے اور یہاں کی کتنی مسجدوں کے مینار دن رات اللہ کی توحید کی گواہی پکار پکار کر دیتے رہتے تھے! دل پر مسرت وانبساط کے بجائے اب تمام تر حسرت وغم کے جذبات طاری تھے۔ لیجیے اب جالندھر اور امرتسر کے درمیان کا علاقہ شروع ہو گیا اور آہ کچھ نہ پوچھیے، دماغ کے کیمرہ کے سامنے کیسی کیسی حسرت آلود، خون میں ڈوبی ہوئی تصویریں آ گئیں! کتنے معصوم بچوں اور بچیوں کا معصوم خون اس سرزمین میں جذب ہوا ہو گا! کتنے مظلوم بوڑھوں اور

بوڑھیوں کے لاشے اسی علاقے میں تڑپ کر سرد ہوئے ہوں گے! کتنی عصمتیں یہاں دن دہاڑے بیدردی سے لٹی ہوں گی! اللہ کی زمین اس عصمت مآبوں پر تنگ ہوگئی ہوگی! وہ فریاد کررہی ہوں گی اور کوئی ان کی چیخوں کا سننے والا نہ رہا ہوگا! ظلم، شقاوت، شیطنت کا کون سا کھیل ہے جو اس علاقہ میں ہفتوں بلکہ مہینوں نہیں کھیلا جاچکا ہے۔ مسلمان جن صورتوں میں مظلوم رہے ان پر آہ فغاں تو بالکل قدرتی تھی لیکن ساتھ ہی یہ عقلی تسکین بھی موجود تھی کہ شہادت ومظلومیت کے اجر بھی کیسے کیسے بے حساب اور قابل رشک انھیں مل چکے ہوں گے لیکن قلب ان صورتوں کے تصور سے کانپ گیا جہاں سبقت واقدام کا داغ مسلمانوں کے چہرہ پر لگا نظر آیا۔ یہ داغ غیروں کی نظر میں خود اسلام کے روئے روشن پر لگا اور یہ تصور آتے ہی سر ندامت سے جھک گیا۔ دس مسلمانوں کا مظلوم ہوکر اپنے رب کے حضور میں حاضر ہونا اس سے کہیں بہتر ہے کہ ایک مسلمان بھی ظالم بن کر دنیا وآخرت میں رونما ہو!''[۱]

مولانا کو قیام پاکستان کے دوران جتنا بھی وقت ملا اس میں انھوں نے پاکستانی عوام کی ذہنی وفکری، سماجی، ثقافتی، تہذیبی احوال کا مطالعہ کیا اور ان کی ترجمانی اور پاکستان کے مختلف مقامات کی مکمل عکاسی بڑے دلکش اور نادر انداز میں اپنے سفرنامہ میں کی ہے۔ محاکات، منظرکشی، طنز وظرافت کے برمحل استعمال نے مولانا کی تحریروں کو اور پرکشش بنادیا ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

''لاہور کی رونق کا کیا کہنا۔ ہر بڑے شہر کی طرح شہری وتمدنی چہل پہل سے لبریز۔ سیر وتفریح، گلگشت، کھیل تماشے کے مواقع خصوصاً چھاونی اور سول لائن کے حصوں میں قدم قدم پر موجود۔ مال روڈ (ٹھنڈی سڑک) سے بھی بار بار گزرنا ہوا۔ لیکن بے حیائی کے وہ منظر کہیں بھی دیکھنے میں نہ آئے جن کے لیے لاہور کی بدنامی اچھے اچھے ثقہ حلقوں میں مدت سے چلی آرہی ہے۔ عورتیں یوں بھی سر بازار چلتی پھرتیں، تانگوں اور موٹروں پر دوڑتیں، سائیکلوں

---

[۱] سیاحت ماجدی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص:۱۶-۱۷

پر اڑتی زیادہ نظر نہ آئیں جو تھیں بھی وہ بھی عموماً برقع پوش، کھلے ہوئے چہروں کے ساتھ کم ہی تھیں اور بے حجابی اور بے حیائی کے ساتھ تو اور بھی کم۔ جتنی تھیں ایک اسلامی مملکت میں بیشک اتنی بھی نہ ہونا چاہیے تھیں یہاں سوال 'چاہیے' کا نہیں، واقعہ کا ہے، واقعہ کے لحاظ سے عرض ہے کہ جتنے چرچے سنے تھے۔اس کے مقابلہ میں مشاہدہ کی شہادت تو بہت ہی کم کی ہے۔مسجدوں میں بجز فجر کے اور مختلف اوقات کی نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا کوئی مسجد ویران نہ ملی۔سب جگہ نمازی اچھی خاصی تعداد میں نکلے۔ یہاں تک کہ مقبرہ جہانگیر میں جو مسجد آبادی سے بالکل الگ ہے وہ بھی مغرب کے وقت نمازیوں سے یکسر خالی نہ تھی۔بہر حال نمازیوں کی تعداد اور مسجدوں کی یہ معموری بحمد اللہ ایسی نہ معلوم ہوئی جو کسی مسلم مملکت کے بڑے شہرے کے لیے باعث ننگ ورسوائی ہو۔تیسرا مشاہدہ اسی سیاق وسلسلہ میں قابل ذکر ہے کہ سڑکوں کی تختیوں اور عمارتوں کے نام جوں کے توں ہیں۔۔۔۔یہ بات بظاہر معمولی سی لیکن قوموں کے ذہنی توازن اور ملتوں کے ظرف کا اندازہ باتوں سے ہوتا رہتا ہے۔''[۱]

''کراچی ماشاء اللہ شہر ہے بہت اچھا۔خوشنما، کشادہ، آباد، پر رونق، پاکستان جیسی کم عمر مملکت کے شایان شان البتہ وسیع، عالی شان وسر بفلک عمارتوں کے ساتھ ساتھ تنگ وتاریک، غلیظ گلیاں اور گری پڑی جھونپڑیاں بھی نظر میں کانٹے کی طرح چبھتی ہیں۔لیکن جو صورت حال شہر کی تشکیل میں پیش آتی چلی گئی اس لحاظ سے ایسا ہونا شاید کچھ ناگزیر ہی تھا۔ مسجدیں لاہور کی طرح یہاں بھی آباد نکلیں۔۔۔۔عورتوں کی بے حیائی کی خبریں جس شد و مد سے سننے میں آئی تھیں وہ بھی اچھی خاصی مبالغہ آمیز نکلیں۔۔۔۔ایک بڑی بات یہ کہ لاہور کی طرح یہاں بھی عمارتوں، باغوں، سڑکوں وغیرہ کے نام اب تک ہندوؤں، مسیحیوں، مجوسیوں کے نام کے ساتھ قائم ہیں۔''[۲]

---

۱ سیاحت ماجدی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص:۲۶۔۲۷

۲ ایضا: ص:۹۱۔۹۲

'حاصل سفر' کے عنوان سے مولانا نے پاکستانی عوام کے درمیان پائے جانے والے اختلافات وانتشار وغیرہ کو بڑے پرتاثیر اور حکیمانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ اور اپنی اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ یہاں پر ایمانی اخوت ومساوات کا بول بالا ہونا چاہیے تھا جو اس وقت ناپید ہے وہ لکھتے ہیں۔

''بڑے دکھ اور دلی کرب کے ساتھ یہ محسوس ہوا کہ اتحاد امت، یکدلی یکجہتی کو وجود میں لانے اور اسے ترقی دینے کے لیے پاکستان بنا تھا، خود ہی مفقود ہے۔ قدم قدم پر انتشار، بات بات میں اختلاف اور سب سے مہلک زہر رگ رگ میں سرایت کیا ہوا صوبائی تعصب کا! حسرت ہی رہی کہ کسی پنجابی کی زبان سے کسی بنگالی کے حق میں کلمہ خیر سنا ہوتا۔ کسی بنگالی نے کسی سندھی کا نام خوشدلی سے لیا ہوتا۔ کسی سندھی نے کسی سرحدی پر اعتماد ظاہر کیا ہوتا۔ حد یہ ہے کہ مہاجرین تک مختلف ٹولیوں میں بٹے ہوئے ایک دوسرے کی طرف بجائے محبت واخوت کے رقابت بلکہ دشمنی کی نظر سے دیکھنے والے '**رحماء**' کے بجائے '**اشداء**' کے مصداق۔ یوپی والے، بمبئی والے، بہاری، دکھنی سب الگ الگ پارٹیوں میں تقسیم، تنظیم سے کوسوں دور! اس زہر کا توڑ صرف ایک ہی تھا ایمانی اخوت۔ یہی سب کو ایک سانچہ میں ڈھال سکتی ہے اور وہی ناپید۔''[۱]

مولانا ہندوپاک کے تلخ وناخوش گوار تعلقات کو دیکھ کر بہت کڑھتے تھے۔ اور یہ خواہش کرتے تھے، کہ جس طرح دو بھائیوں کے بیچ لڑائی ہوتی ہے اور پھر ایک ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح سے ہندوپاک کے درمیان تعلقات استوار ہونے چاہیے۔ مولانا اس بات کے منتظر تھے کہ وہ وقت آئے کہ ہندوپاک ایک مستحکم رشتے میں بندھ جائیں اور دونوں ممالک ایک دوسرے کے حلیف بن جائیں۔

''ہندو پاکستان کے باہمی تعلقات یہ دیکھ کر دل بہت ہی کڑھا کہ محض آپس کی ضدم ضدا نے اس درجہ خراب کر رکھے ہیں۔ نفس تقسیم ملک ہرگز دشمنی کو مستلزم نہیں۔ حقیقی بھائیوں کے درمیان جائیداد کی تقسیم ہوتی رہتی ہے اور بارہا اس تقسیم کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مدتوں کے بگڑے ہوئے تعلقات ازسرنو سدھر جاتے

۱۔ سیاحت ماجدی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۱۰۰

ہیں بعینہ یہی صورت ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بھی ممکن تھی اور آج بھی ناممکن نہیں۔ لاہور کراچی دونوں جگہ یہ محسوس کر کے دل کو کس درجہ کوفت اور اذیت ہوتی تھی کہ گرد و پیش کے سارے محبت کرنے والے ہی جمع ہیں۔ بہت سے عزیز ہیں اور جو عزیز نہیں وہ بھی فرط اخلاص کی بنا پر عزیزوں ہی میں شمار کے لائق۔ لیکن اس ساری یگانگت کے باوجود پھر اجنبی، پھر غیر، پھر بیگانے! مور جنگل میں اپنے خوشنما پر پھیلا پھیلا کر خوش ہو رہا تھا، ناچ رہا تھا کہ یک بیک نظر اپنے پیروں پر پڑ گئی، اور دل کی کلی معاً مرجھا کر رہ گئی!..... دونوں ملکوں کے اونچے طبقات میں کیا مخلص اہل فہم بھی ایسے نہیں جو اس اشتراک مع الاختلاف کے موضوع کو اپنا کے اس کی عملی صورتیں نکالیں؟ اور اس طرح لاکھوں نہیں کروڑوں بندگان خدا کی دعائیں اپنے لیے حاصل کریں؟ کتنا مبارک و خوش آئند ہوگا اس دن کا طلوع جب ہندوستان پاکستان کو اپنا قوت بازو اور اپنی مغربی سرحد کا محافظ و پشتیبان سمجھے گا اور پاکستان از سر نو ہندوستان کو اپنا شریک جسم و جان اور ایک مخلص حلیف سمجھنے لگے گا!

متاع وصل خسرو .....بس گراں است

گر ایں سودا بہ جاں بودے چہ بودے!

ایک طرف غلام محمد، دوسری طرف جواہر لال ان دونوں کے عہد سے بڑھ کر ساعت سعید اس یوم عید کے لیے اور کب آسکتی ہے!''[۱]

مذکورہ اقتباس سے مولانا کی پاکستان سے وابستگی اور قلبی تعلق کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مولانا کی اس خواہش کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے، کہ دونوں ملکوں کے درمیان زمین پر سرحدیں تو ہوں مگر دونوں ممالک کے عوام کے دلوں سے سرحدوں کے تصور کو مٹا دیا جائے، تاکہ دونوں ملک کے باشندے ایک سگے بھائی کی طرح رہ سکیں، اور ایک دوسرے کے محافظ بن جائیں۔ نفرت، عداوت، انتشار کا خاتمہ ہو جائے، امن، شانتی اور باہمی اتحاد کا بول بالا ہو جائے۔

---

۱ سیاحت ماجدی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۱۰۱۔۱۰۲۔۱۰۳

پاکستان کے علاوہ مولانا نے اندرون ملک کے متعدد شہروں مثلاً بمبئی، بہار، بھوپال، حیدرآباد، دہلی، کلکتہ، مدراس، علی گڑھ، آگرہ، جے پور کا بھی سفر کیا تھا۔ ان تمام اسفار کی روداد بھی مولانا نے لکھی ہے۔ مولانا کے ان تمام سفرناموں کا تذکرہ بہت طویل ہو جائے گا، اس لیے ان میں سے بعض کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ مولانا کے یہ سفرنامے ماضی کی یادوں اور سیاسی، سماجی، مذہبی، ادبی شخصیات سے ملاقات وغیرہ پر مبنی ہیں، مولانا اپنے سفرنامے میں جہاں شخصیات کے ذہنی و قلبی تاثرات کو بیان کیا ہے، وہیں تاریخی عمارتوں، مسجدوں، لائبریریوں، تاریخی علمی یادگاروں اور مزارات اور نامور شخصیات وغیرہ کا تذکرہ بڑے دلکش اور پرتاثیر انداز میں کیا ہے۔

ڈھائی ہفتہ پاکستان کے بعد مولانا کا دوسرا سفرنامہ حیدرآباد بھی کافی طویل ہے۔ مولانا نے حیدرآباد کے جن مقامات کی سیر کی ان کے عنوان سے ان کا تذکرہ کیا ہے، جیسے غریب خانہ، بہادر سردار، ادارہ ادبیات اردو وغیرہ۔ 'حیدرآباد کی تہذیبی شرافت' کے عنوان سے مولانا نے وہاں کی ثقافتی و معاشرتی احوال کی ترجمانی اس طرح کی ہے۔

> ''اردو صحافت محض اردو زبان کی صحافت نہیں، اردو کلچر کی مظہر و ترجمان ہے، اردو محض ایک زبان کا نام نہیں، اردو کلچر یا تہذیب خود ایک مستقل چیز ہے۔ اردو تہذیب کا آئینہ ہے، اور اس آئینہ کی ساری جلا صرف ایک لفظ شرافت کے اندر مضمر ہے۔ حیدرآبادی تہذیب، لکھنوی تہذیب، اسی جوہر شرافت کی یادگار تھی۔ وہ جب مٹتی ہے تو ہر شریف کو اس کے مٹنے کا رنج ہوتا ہے۔ ٹھیٹھ مذہبی عقائد کا تعلق عالم غیب سے ہوتا ہے، لیکن یہ تہذیبی شرافت ایسی چیز ہے جو اسی دنیا میں بندوں کا دل بندوں سے جوڑے رہتی ہے۔ اور جب اس تہذیب کا جنازہ اٹھتا ہے تو ماتم داروں میں سب سے آگے شرافت ہی ہوتی ہے۔ پرانا حیدرآباد مٹا فنا ہوا۔ نظام جاگیرداری گیا۔ نئے نظام حکومت و آئینی سیاست نے جگہ لے لی۔ اکثریت نے آزادی محسوس کی لیکن آخر کوئی بات اس مرحوم اردو کلچر میں تھی کہ جب پولیس ایکشن کے بعد ایک نامور ہندو ایڈوکیٹ نے ازراہ

ہمدردی ایک اونچے مسلمان عہدہ دار سے کہا ''زمانہ اگر میر محبوب علی خاں کا ہوتا تو ہم خود آپ لوگوں کے ساتھ ہو کر پولیس ایکشن مقابلہ کرتے'' تو اس مسلمان عہدہ دار نے کتنا بلیغ و جامع یہ جواب دیا کہ ''خیر ہم تو مر چکے، خوشی اس کی ہے کہ ہم پر آنسو بہانے والے آپ بھی ہیں!''.....حیدرآباد پولیس ایکشن کے بعد اپنے انجام پر حیرت ہی کیوں کرے؟ عاقبت اندیشی اگر ہوتی تو اس کی نوبت ہی کیوں آنے دی جاتی؟ بہر حال اس بد اقبالی کا ظہور کسی درجہ میں تو ناگزیر ہی تھا۔لیکن اللہ کا یہی بڑا فضل ہے کہ حالت نکبت زدہ اس درجہ میں دیکھنے میں نہیں آئی جس کا اندیشہ تھا،.....بہر حال یہاں کے مسلمان اپنی ثقافتی ،معاشرتی حالت بہت کچھ سنبھالے ہوئے ہیں ،مکہ مسجد تو خیر اس ڈر سے جانا نہیں ہوا کہ وہاں پہچان لیا جاؤں گا اور پھر مجمع سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا لیکن جن دو ایک چھوٹی مسجدوں میں جمعہ پڑھنے یا کسی اور وقت جانے کا اتفاق ہوا وہاں نہ صرف نمازی ہی اچھی خاصی تعداد میں دکھائی دیے بلکہ جماعت و نماز کا انتظام اور روشنی ،فرش ،صفائی ،پانی وغیرہ کا انتظام بھی تقریباً اسی حال میں ہے جس طرح دور نظام دکن میں تھا، یہ دیکھ کر جی بڑا خوش ہوا،اس زمانہ میں مسجدوں کے نظام ظاہری ہی کو مسلمان سنبھال لے جائیں تو یہی ایک بڑی بات ہے۔''[۱]

حیدرآباد کے تاریخی اور قدیم کتب خانہ آصفیہ کا تذکرہ مولانا نے اس انداز میں کیا ہے۔

''۱۹۱۷ء ،۱۹۱۸ء میں جب کچھ دن جم کر رہنا حیدرآباد میں ہوا تھا تو اپنے شوق و دلچسپی کی ایک خاص چیز کتب خانہ آصفیہ تھا۔....اب ظاہر ہے کہ کتب خانہ اس ہیئت وصورت کے ساتھ کہاں باقی رہ گیا تھا۔'آصفیہ' کا نام ونشان مٹ کر کتب خانہ 'اسٹیٹ لائبریری' میں تبدیل ہو گیا ہے۔اور اس پرانے نام سے، اور ایک نئی جگہ نئی شان سے قائم ہے۔عمارت جدید طرز کی اور عالی شان ،وسیع احاطہ ،نئی وضع نیا سامان ،عربی فارسی کتابوں کا ذخیرہ اب بھی خاصا ہے اور بعض

---

[۱] سیاحت ماجدی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۱۶۶۔۱۶۷۔۱۶۸

نوادر کے لحاظ سے قابل دید البتہ یہ مشرقی ذخیرہ اب نیچے کی منزل میں ہے، جہاں
دن دہاڑے بھی لکھنے پڑھنے کے کام کے لیے بجلی کی روشنی ناگزیر ہے۔ اور یہ تو
اب جدید سرکاری اور نیم سرکاری عمارتوں کے فیشن میں داخل ہو چکا ہے کہ کمروں
کے اندر سارا کاروبار بجائے سورج کی روشنی کے بجلی کی مصنوعی روشنی میں کیا
جائے۔ ہندی اور انگریزی کی کتابوں پر پورا زور ہونا ہی تھا۔ مرہٹی وغیرہ کا بھی
دور دورہ ہے، البتہ اردو کے ساتھ سوتیلے پن کا رویہ اس پردیش میں بھی دکھائی
دیا، اردو کی اتنی انجمنوں اور اردو کے اتنے ہمدردوں اور کارکنوں کے باوجود، اردو
کی نئی کتابوں کی کوئی فہرست باہر آویزاں نہ ملی، بخلاف انگریزی اور ہندی کے،
کہ ان کے تازہ مطبوعات کے نام مع ان کے تعارف کے بورڈ پر چسپاں
تھے۔ اور اس ایک جزئیہ کے لحاظ سے حیدرآباد کی اسٹیٹ لائبریری کی زمین لکھنو
کی پبلک لائبریری کے آسمان کے ہم رنگ ہی نکلی!''[۱]

یوپی اردو اکیڈمی نے کتابوں کو انعام دینے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی تھی، جس کے ایک رکن مولانا بھی تھے۔ ۱۹۶۳ء میں راجستھان میں کمیٹی کی میٹنگ تھی، سفر لکھنو سے آگرہ ہوتے ہوئے راجستھان جانے کا تھا، آگرہ اسٹیشن پر کئی گھنٹے تک دوسری گاڑی کا انتظار کرنا تھا۔ مولانا موقع غنیمت جان کر تاج محل دیکھنے چلے گئے مگر تاج محل دیکھنے کے بعد مولانا کو اس پر افسوس ہوا کہ آخر شاہجہاں کو تاج محل بنانے کی کیوں سوجھی اور اس کی جگہ پر کوئی دینی ادارہ یا مسجد، نہر وغیرہ کی تعمیر کیوں نہ کرائی چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

''تاج محل اور اس کے ملحقات، گلستان شاہجہانی وغیرہ کے حسن و جمال
اور وسعت رقبہ کا کیا پوچھنا! ایک دنیا ہے کہ ملکوں ملکوں سے، مشرق و مغرب سے
تمنائے دید کھنچی چلی آرہی ہے اور ہر سال نہیں ہر روز ہی ایک میلہ سا، کیا خواص
اور کیا عوام کا لگا رہتا ہے! اس روز بھی اور ٹھیک دوپہر میں ایک تانتا تماشائیوں کا
لگا ہوا بھانت بھانت کی مخلوق ہر ریاست اور ہر صوبہ کی اور ایک ٹولی کیمرہ بدست
فرنگیوں اور فرنگنوں کی۔ ان کے علاوہ اصل عمارت اور اس کے ملحقات، رقبہ

---

[۱] سیاحت ماجدی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۱۷۳-۱۷۴-۱۷۵

فرلانگوں کا نہیں میلوں کا گھیرے ہوئے ہیں۔ دولت اس سارے کارخانے کی تعمیر وجلا میں ارزانی کے زمانے میں بھی کیا لاکھوں سے کچھ کم صرف ہوئی ہوگی! اور آج کے معیار سے تو میزان کروڑوں کی پہنچے گی۔ شاہجہاں کا شمار صاحب فہم سلیم رکھنے والے تاجداروں میں ہے۔ ساتھ ہی دین کا شعور اور شریعت کا پاس رکھنے والا۔ حیرت اور کمال حیرت ہے کہ اسے اس بے تحاشا اسراف اور سر تا سر بے نتیجہ اسراف کی سوجھی کیا! اور وقت کے علماء ومشائخ اس ارادہ کے کیوں نہ آڑے آ گئے اور کسی نے کیوں نہ سمجھایا کہ محبوب کی یاد منانے کا یہ کون سا عاقلانہ طریقہ ہے! محبوب کی روح کو اس بے دھڑک اسراف پروری سے کسی قسم کی بھی مسرت، راحت حاصل ہوگی؟ کیا اس سے ہزار درجہ بہتر نہ ہوتا کہ بادشاہ ملکہ کی یادگار میں مسجدیں بنوا دیتا، آبپاشی کے لیے نہریں یا کنویں کھدوا دیتا، دینی مدرسے کھول جاتا، مہمان سرائیں تعمیر کرا دیتا۔ وقس علی ہذا۔ اسی حسرت وتاسف کے ساتھ قلعہ کی لق ودق عمارت کو بھی دیکھا۔ 'عمارت' بہ صیغہ واحد نہیں چھوٹی بڑی بیسیوں، عمارتوں کے مجموعہ کو جس کی ہر چھوٹی عمارت بھی بیسیوں عظیم الشان عمارتوں پر بھاری! یہ قلعہ بمعنی قصر شاہی دور اکبر، جہانگیری سب سے بڑھ کر عہد شاہجہانی کی تعمیر ہے اور مسلمانوں فرماں رواؤں کے حد مرض تک پہنچے ہوئے اسراف کا مکمل نمونہ! تاج محل اور قلعہ کی سیر سے جو افسردگی وحسرت طاری ہوئی اس نے فتح پور سیکری، مقبرہ اعتمادالدولہ وغیرہ کی طرف توجہ کرنے کی ہمت ہی نہ باقی چھوڑی۔''[1]

پاکستان کے نامور دانش ور اور محقق ڈاکٹر تحسین فراقی نے مولانا ماجد کے سفر ناموں کے متعلق اس طرح اظہار خیال کیا ہے۔

''جدید ہندوستان میں کیا اردو ادب نے ماجد سے بڑا عبرت زا قلم کار پیدا کیا ہے؟ ہمارے خیال میں ہرگز نہیں۔ اسی عبرت زائی نے ماجد کے سفر ناموں کو ایک نیا لہجہ اور ایک نئی دھار عطا کی ہے۔''[2]

---

[1] سیاحت ماجدی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۳۵۸۔۳۵۹

[2] مولانا عبدالماجد دریابادی احوال وآثار: ڈاکٹر تحسین فراقی: ص: ۴۵۰

عبدالماجد دریابادی بحیثیت مترجم

ادب وانشا کے حوالے سے مولانا ماجد کی ترجمہ نگاری کا تذکرہ ناگزیر ہے۔انھوں نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز پہلے مضمون نگاری، پھر ترجمہ سے کیا، چنانچہ الناظر، معارف، وکیل، مشرقی وغیرہ میں ان کے مضامین وتراجم شائع ہوتے رہے،اس کے بعد انجمن ترقی اردو کے لیے ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے ان سے متعدد ترجمے کرائے۔ نیز مولانا شبلی کو سیرۃ النبی کے لیے انگریزی کتابوں اوران کے حوالوں اور ترجموں کے سلسلہ میں مولانا سے خاصی مدد ملی۔جس کا انھوں نے اپنے خطوط اورنجی محفلوں میں کھل کر اعتراف کیا ہے۔حالانکہ یہ زمانہ مولانا کے الحاد کا تھا۔اوراسی بنا پران کو اس خدمت سے ہٹنا بھی پڑا۔

مولانا ماجد کا شمار بیسویں صدی کے مشہور ومعروف مترجموں میں ہوتا ہے۔ان کو ترجمہ سے طبعی مناسبت تھی۔ان کی شخصیت میں جو وسعت تھی وہی وسعت وتنوع ان کے تراجم میں بھی موجود ہے۔انھیں عربی، فارسی، اردو کے صرف ونحو کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب پربھی عبور حاصل تھا۔مولانا کو فلسفہ، سائنس، تہذیب وتمدن، عمرانیات اورقرآنیات وحدیث سے گہری دلچسپی تھی۔اسی لیے انھوں نے اردو میں ان کے بہترین تراجم کیے جو اردوادب میں بیش قیمت اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ضرورت کے لحاظ سے مولانا نے ترجمہ کرتے وقت اصل متن کا ترجمہ کہیں کہیں لفظی مگر زیادہ تر تلخیص وترجمانی سے کام لیا ہے۔ مولانا کے خالص تراجم میں مکالمات برکلے، پیام امن، ناموران سائنس اورقرآن مجید کا ترجمہ اردو اور انگریزی کا شمار ہوتا ہے۔انھوں نے بعض کتابوں کی تلخیص بھی لکھی ہے۔مثلاً تاریخ اخلاق یورپ، تاریخ تمدن (اس کے مختلف ابواب) منطق (استخراجی واستقرائی)، مناجات مقبول، چہل حدیث وغیرہ۔مولانا ماجد کے تراجم کی فنی وادبی قدر وقیمت کا اندازہ لگانے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے فن ترجمہ نگاری کے تاریخی پہلوؤں پراختصار سے روشنی ڈالی جائے۔

اسلامی تاریخ میں عہد عباسی کو علمی، فنی وادبی اعتبار سے عہد زریں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔عباسی خلیفہ ہارون رشید ایک علم دوست حکمراں تھا۔اس نے بغداد کی سرزمین پر 'بیت الحکمت' کے نام سے ایک اکیڈمی قائم کی، جہاں پرمختلف زبانوں کی اہم کتابوں کا ترجمہ کیا جاتا تھا۔اس بیت الحکمت کو ہمہ جہت ترقی اس کے وارث مامون رشید نے عطا کی۔ مامون رشید نے مختلف علم وفن مثلاً طب، فلسفہ، منطق، ادب، جیسے اہم علوم

وفنون کی کتابوں کا ترجمہ دنیا کی دوسری زبانوں سے عربی میں کروایا۔شاہی سرپرستی اور قدردانی کی بدولت ترجمہ نگاری کی تاریخ میں 'بیت الحکمت' کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔

اردو زبان وادب کی تاریخ جتنی قدیم ہے، اتنی ہی قدیم اردو ترجمہ نگاری کی تاریخ ہے۔صوفیاء اور بزرگان دین تبلیغی واصلاحی مقصد کے تحت مذہبی احکامات اور اقوال کو عوامی زبان میں منتقل کرتے تھے۔ اس طرح اردو زبان میں ترجمہ نگاری کے ابتدائی نقوش نظر آتے ہیں۔آٹھویں صدی ہجری میں سید محمد عبداللہ حسینی نے حضرت الاعظم کا رسالہ 'نشاط العشق' کا دکنی میں ترجمہ کیا۔اور شمش العشاق میراں جی نے 'شرح مرغوب القلوب' لکھی۔بارہویں صدی ہجری تک فارسی کا راوج بہت کم ہوگیا۔فارسی زبان کے بجائے اردو زبان کا عام چلن ہونے لگا، اور خاص کر مذہبی محفلوں میں اردو زبان ہی استعمال کی جانے لگی تھی۔اسی مقصد کے تحت فضل علی خاں فضلی نے ملا واعظ کاشفی کی تصنیف 'روضتہ الشہدا' کا ترجمہ اردو میں 'کربل کتھا' کے نام سے کیا۔اسی دور میں قرآن مجید کے ترجمے وتفاسیر بھی اردو زبان میں لکھی جانے لگی۔شاہ رفیع الدین اوران کے بھائی شاہ عبدالقادر نے اردو میں قرآن کے ترجمے کیے۔مذہب اسلام کے علاوہ عیسائی، اور ہندو مذہب کی کتابوں کا ترجمہ بھی اردو میں کیا جانے لگا۔

اردو ترجمہ نگاری کو ایک اہم جہت اور رفتار اس وقت ملی جب انگریزی حاکموں نے اپنی ضرورت کے تحت فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔اور فورٹ ولیم کالج میں فن ترجمہ نگاری کو خاص توجہ دی گئی۔سیکڑوں کی تعداد میں کتابوں کے ترجمے منظر عام پر آئے فورٹ ولیم کالج سے وابستہ مترجمین میں میر امن، بہادر علی حسینی، کاظم علی جواں، للولال جی، شیر علی افسوس، حیدر بخش حیدری وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔فورٹ ولیم کالج کے ترجموں کی خصوصیت سہل وسادہ نگاری تھی۔ چونکہ ان ترجموں کا مقصد نوآورد انگریز حاکموں کو ہندوستانی زبان کی تدریس ہوتی تھی، اسی لیے یہ ترجمے عام فہم اور سادہ زبان میں کیے جاتے تھے۔ یہ تمام تراجم فارسی، عربی، سنسکرت، برج بھاشا وغیرہ کی کتابوں سے اردو میں کیے گئے تھے۔فورٹ ولیم کالج کے علاوہ دہلی کالج میں ورنا کیولر سوسائٹی اور سرسید احمد خان کی قائم کردہ سائنٹفک سوسائٹی، حیدرآباد کے دارالترجمہ اور دارالمصنفین اعظم گڑھ وغیرہ جیسے اداروں نے اردو ترجمہ نگاری کے فن کو بہت فروغ دیا، اور مترجمین کی ایک بڑی جماعت پیدا کردی۔ان اداروں کی کاوشوں کی بدولت اردو زبان وادب کا دامن بہت وسیع اور کشادہ

ہو گیا، اور فن ترجمہ نگاری کو اردو زبان و ادب میں مستقل ایک حیثیت مل گئی۔ ان اداروں نے مختلف علوم وفنون مثلاً سائنس، ادب ریاضی، فلسفہ، منطق، طب وغیرہ کی اہم کتابوں کے ترجمے اردو میں کیے، اور اردو اصطلاحات سازی کا بھی کارنامہ انجام دیا۔ اردو ترجمہ کی روایت رفتہ رفتہ مستحکم وتوانا ہوتی گئی۔ مولانا ماجد کے زمانے تک آتے آتے ترجمہ نگاری کو فن کی حیثیت مل چکی تھی۔ مولانا چونکہ متنوع وہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے اس لیے انھوں نے ترجمہ نگاری میں بھی اہم کارنامے انجام دیئے۔ ان کے ترجموں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا اگر اور کچھ نہ لکھتے تب بھی اردو ادب کی تاریخ میں زندہ وتابندہ رہنے کے لیے ان کے ترجمے ہی کافی تھے۔

مولانا کو زبان و بیان پر بڑی قدرت تھی۔ تخلیق اور ترجمہ میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ تخلیق میں فن کار اپنے تجربات ومشاہدات اور جذبات کے اظہار کے لیے مختلف انداز اختیار کرسکتا ہے۔ جبکہ اس کے برعکس ترجمہ میں متن کو سامنے رکھ کر اظہار خیال کی اجازت ہوتی ہے۔ ترجمہ نگاری کا کمال یہ مانا جاتا ہے کہ متن کی تفہیم وتشریح اصل کے مطابق کی گئی ہو۔ زبان چونکہ ایک سماجی، ثقافتی، معاشرتی پہلوؤں کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس لیے کسی زبان کو دوسری زبان میں منتقل کرنا مشکل ترین عمل ہے۔ لیکن ایک کامیاب ترجمہ نگار اپنے زبان و بیان کی قدرت ومہارت کی وجہ سے اس دشوار مرحلے سے باآسانی گزر جاتا ہے۔ ترجمے کی زبان فطری، سادہ اور عام فہم ہونی چاہیے۔ ترجمہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی ذاتی پسند وناپسند کے بجائے متن اور صاحب متن کے منشا کو مدنظر رکھے۔ مولانا ماجد کے تمام تراجم میں مذکورہ خصوصیات پائی جاتی ہے۔ مولانا کے تراجم کی قدر و قیمت اور فنی و ادبی اہمیت کا اندازہ لگانے کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی ترجمہ کردہ کتابوں کا اختصار سے جائزہ لیا جائے۔

مکالمات برکلے

'مکالمات برکلے' جارج برکلے کی مشہور انگریزی کتاب 'مکالمات مابین ہائلس وفلونیس'
ThreeDialoguesBetweenHylasAndPhilonousInOppositionToSkeptiesAndAtheists
کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ مولانا نے دارالمصنفین اعظم گڑھ کی فرمائش پر کیا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں اسی ادارے سے اس کی اشاعت ہوئی۔ میرے پیش نظر دارالمصنفین سے شائع شدہ 'مقالمات برکلے' کا جدید

ایڈیشن ۲۰۱۱ء ہے۔ دیباچہ میں مولانا نے ترجمے کی خصوصیات و امتیازات کا تذکرہ اس طرح کیا ہے۔

''ترجمہ مکالمات میں حتی الامکان لفظی پابندی ملحوظ رکھی گئی ہے لیکن نہ اس حد تک کہ کتاب چیستان ہو جائے، کتاب کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ اسے پڑھیں، اگر وہ پڑھنے والوں کی سمجھ سے بالاتر ہوئی تو اس کا عدم و وجود یکساں ہے، البتہ پڑھنے والوں سے سنجیدہ ناظرین کی جماعت مراد ہے، فلسفہ کتنی ہی سلیس زبان میں بیان کیا جائے پھر بھی فلسفہ ہی ہے، برکلے کا طرز ادا نہایت ہی سلیس و قریب الفہم ہے، تاہم وہ فلسفہ کو ناول نہیں بنا سکتا تھا۔ بعض مقامات پر جہاں توضیحی الفاظ یا فقروں کا اضافہ ضروری معلوم ہوا، ان کو خطوط وحدانی (بریکٹ) میں رکھ کر ان پر 'م' کا نشان بنا دیا ہے کہ وہ منجانب مترجم ہیں، جا بجا مبادی کے حوالے بھی اس کے اردو ایڈیشن کے مطابق اضافہ کر دیے ہیں۔''[۱]

مکالمات برکلے میں اصل متن شروع ہونے سے پہلے مولانا نے ایک تفصیلی مقدمہ لکھا ہے۔ جس میں انھوں نے برکلے سے قبل کے فلسفیانہ اور برکلے کے فلسفہ ونظریات کی تلخیص پیش کردی ہے۔ جس کی وجہ سے کتاب کی تفہیم بہت آسان ہوگئی ہے۔ مولانا کا مخصوص ومنفرد لہجہ اور اسلوب نگارش کی پوری جھلک اس مقدمہ میں نظر آتی ہے۔ مولانا کو فلسفہ سے طبعی شغف تھا اسی وجہ سے انھوں نے مشرق ومغرب کے تمام اہم فلسفیوں کا باریک بینی سے مطالعہ کیا تھا۔ اسی لیے انھوں نے فلسفیانہ مباحث ونظریات کی تشریح وتجزیہ میں مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے۔

مولانا نے برکلے کے فلسفیانہ نظریات کو سمجھانے کے لیے بہت سے تاریخی واقعات اور علماء فضلا اور طاقت ور بادشاہوں کی حکایات کو بڑی عبرت آمیز انداز میں پیش کیا ہے، اور نتیجہ یہ نکالنے کی کوشش کی ہے کہ دنیاوی طاقت، عظمت وجلال، مال ودولت، سائنس وحکمت، خدائی حکمت وقدرت کے سامنے ہیچ ہیں۔ بطور مثال سکندر اعظم کو پیش کیا ہے، کہ اس نے نہ معلوم کتنے ممالک پر اپنے فتح وکامرانی کا پرچم نصب کیا ہے، اور اس طرح دنیا کا سب سے بڑا جہاز ٹائٹینک کا تذکرہ بطور مثال پیش کیا ہے کہ تمام حفاظتی تدابیر اور انتظامات کے باوجود جہاز کس طرح ایک چٹان سے ٹکرا کر غرقاب ہوگیا۔ مولانا لکھتے ہیں۔

---

[۱] دیباچہ مکالمات برکلے: مترجم مولانا عبدالماجد دریابادی: ص:۶

> ''یہ اس قسم کے مشاہدات وتجربات ہیں جو وحشی ومتمدن، جاہل وعالم ہر انسان کو پیش آتے رہتے ہیں اور انسان کی فطرت ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ ہر واقعہ سے کوئی نہ کوئی نتیجہ نکالتا رہتا ہے۔ عالی دماغ افراد بڑے بڑے مسائل کے متعلق اہم نتائج نکالتے ہیں، عامی انسان اپنی بساط کے موافق کم رتبہ نتائج تک پہنچتا ہے لیکن نفس نتیجہ نکالنا سب میں مشترک ہے۔....غرض نتائج خواہ مشاہدہ وتجربہ کے حدود کے اندر رہ کر نکالے جائیں، خواہ ان کے قیود سے باہر نکل کر تخیل کی فضائے وسیع میں پرواز سے کام لیا جائے، انسان جب تک انسان ہے، اسے بشریت کی بے بسی، بے کسی و بے چارگی کا محسوس ہوتے رہنا لازمی ہے اور اس کا احساس ہونا گویا یہ اعتراف کرنا ہے کہ موجودات فانی سے ماوراو مافوق کسی اور شے کا وجود ضروری ہے۔''[1]

اتنی بات ہر انسان کو معلوم ہے کہ کوئی طاقت ہے جو دنیا کی تمام طاقتوں سے زیادہ طاقت ور ہے، اور اس کا اعتراف جاہل، مشرک ومومن، خدا پرست لامذہب، موحد ودہریہ سبھی کرتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد ہی اختلاف شروع ہوتا ہے۔ مولانا نے تمام مذاہب کے نظریات ومبادیات کا تذکرہ بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ مثلاً مشرق کے متعلق لکھتے ہیں کہ ان کے یہاں کئی خدا ہوتے ہیں، اور مذہب اسلام میں خدا کو زماں ومکاں کے قیود سے عاری اور ہر جگہ اس کی قدرت وعلم کو محیط سمجھا جاتا ہے۔ دہریہ وملحد کے یہاں عالم میں جو کچھ تغیرات جاری ہیں، یہ سب محض مادہ کے مختلف اشکال وشئون ہیں، وجود حقیقی صرف مادہ کا ہے جو غیر مخلوق اور ناقابل فنا ہے، قوت اس کا ایک غیر منفک وصف ہے، اسی کے سہارے ہیولا برابر اپنی صورتیں بدلتا رہتا ہے اور کائنات میں جو کچھ موجود ہے یہ سب اسی ذرات مادی ہی کی ترکیب وتحلیل، لف ونشر، انضمام وانتشار وغیرہ کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ اسی طرح مولانا نے مختلف عقائد اور نظریات رکھنے والے طبقے کا تذکرہ کیا ہے۔

مذکورہ مباحث علم کلام والٰہیات سے متعلق ہیں۔ فلسفہ کا تعلق ماہیت واجب الوجود سے محض ضمنی بالواسطہ ہے۔ برکلے کے نظریات وفلسفیانہ مباحث نے یہ ثابت کیا ہے کہ علم کلام اور فلسفہ میں کوئی تناقص نہیں ہے، اور یہ ممکن ہے کہ ایک شخص گراں پایہ فلسفی اور اعلیٰ متکلم بھی ہوسکتا ہے۔ برکلے سے پہلے فلسفیوں

---

[1] مقدمہ مکالمات برکلے: مترجم مولانا عبدالماجد دریابادی: ص:۸۔۹۔۱۰

اور متکلمین کے درمیان شدید اختلافات تھے، اور 'عقل' 'نقل' میں یہ جنگ مدتوں جاری رہی۔لیکن برکلے کے فلسفیانہ مباحث ونظریات کا اعتراف دونوں حلقوں نے کیا ہے۔مولانا ماجد اپنے مقدمے میں برکلے کے فلسفیانہ نظریات اور مباحث کا خلاصہ دس نقطوں میں پیش کیا ہے ملاحظہ ہو۔

"(۱) موجودات عالم کے جتنے خواص ممکن ہیں ،رنگ بو،مزہ ، شکل، جسامت،وزن وغیرہ سب مجموعاً وانفراداً اپنے وجود کے لیے اس امر کے محتاج ہیں کہ کسی کے حس وادراک میں آسکیں۔

(۲) موجودات عالم ہمیں اس لیے نہیں محسوس ہوتے کہ موجود ہیں بلکہ ہم ان کے وجود ہی کے محض اس بنا پر قائل ہیں کہ محسوس ہوتے ہیں۔

(۳) وجود اشیاء، محسوسیت اشیاء کے مرادف ہے، جو شے قطعاً کسی کے حس وادراک میں نہیں آسکتی وہ موجود بھی نہیں ہوسکتی۔

(۴) گویا کائنات خارجی ممکن الوجود ہے اور نفس مدرکہ اس کے لیے واجب الوجود ہے، وجود حقیقی نفس مدرکہ کا ہے اور کائنات خارجی محض ایک وجود شبہی یا ظلی رکھتی ہے، جب آفتاب نہیں تو نہ شعاع باقی رہ سکتی ہے نہ سایہ، جب نفس مدرکہ نہیں تو کائنات کا وجود بھی نہیں۔

(۵) لیکن ظاہر ہے کہ کائنات کے بے شمار اجزا ایسے ہیں جو کسی نفس انسانی کے ادراک میں نہیں آتے ، پھر ان کا وجود کہاں ہے؟

(۶) اس کے علاوہ خود نفوس مدرکہ بھی تو جز وکائنات ہیں ،ان کے وجود کے ہم کس بنا پر قائل ہیں؟

(۷) ان کا وجود ایک نفس اعظم کے ادراک میں آتا ہے، جو محیط کل، ہمہ گیر، ہمہ داں، ہمہ بیں ہے۔

(۸) عام نفوس مدرکہ محدود ومخلوق ہوتے ہیں لیکن یہ نفس اعظم غیر محدود وغیر مخلوق ہے، زمان ومکان کے قیود سے آزاد، فنا ونقص کے قوانین سے

بالاتر اور بقائے دوام وہمہ جائی کا تاج دار۔

(۹) عام نفوس مدرک اس کے ممکن الوجود ہیں اور یہ حقیقۃ واجب الوجود۔

(۱۰) اسی ذات واجب الوجود کو مذہب کی اصطلاح میں خدا کہتے ہیں۔''[۱]

مولانا کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے فلسفہ جیسے پیچیدہ موضوع کو عام فہم اور سلیس انداز میں پیش کیا ہے، اور برکلے کے نظریات وافکار کو تفہیمی وتشریحی انداز میں پیش کیا ہے۔ مولانا مکالمات کے موضوع ومواد کے متعلق 'مقدمہ' میں لکھتے ہیں۔

''یہ کتاب تین مکالمات پر مشتمل ہے، پہلے مکالمہ میں علم وادراک انسانی کی ماہیت وحدود پر بحث ہے، دوسرے میں وجود، روح اور اس کی عدم مادیت پر، تیسرے میں وجود باری اور اس کے بدیہی الاثبات ہونے پر، اس میں تمام مسائل ہائلس (الف) وفلونیس (ف) دو فرضی اشخاص کی باہمی گفتگو کے ذریعہ سے ادا کیے گئے ہیں، ہائلس کو بطور معترض ومخالف کے فرض کیا گیا ہے اور فلونیس خود برکلے کے خیالات کی ترجمانی کرتا ہے، جتنے اعتراضات ان نظریات پر وارد ہونا ممکن ہیں تقریباً سب ہائلس کی زبان سے ادا کیے گئے ہیں اور فلونیس نے ان کی تردید کی پوری کوشش کی ہے، کوئی جدید اعتراض اب شاید ہی پیدا ہو سکے۔''[۲]

مکالمات برکلے کا انداز چونکہ مکالماتی ہے اور مکالمہ کو کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ لیکن مولانا نے برکلے کے متن کا ترجمہ اس مہارت سے پیش کیا ہے کہ اندازہ ہوتا ہے کہ دو شخص محوِ گفتگو ہیں، اور ان کے بحث کا موضوع فلسفہ ہے۔ برکلے نے اپنی اس تصنیف کو تخلیقی زبان اور نادر ودلکش اسلوب تحریر میں پیش کیا ہے۔ مولانا نے اس ترجمے کا حق پورے طور پر ادا کیا ہے، اور اس کتاب کو پڑھ کر تصنیف کا گمان ہوتا ہے۔ مولانا کے ترجمے کی فنی قدر وقیمت اور لطائف وچاشنی اور حسن بیان کا اندازہ لگانے کے لیے چند اقتباسات بطور نمونہ نقل کیے جا رہے ہیں۔

''ف۔ اہاہ، ہائلس ہیں، یہ آج اتنے سویرے کہاں نکل پڑے؟

---

۱ مقدمہ مکالماتِ برکلے: مترجم عبدالماجد دریابادی: ص ۱۳۔۱۴

۲ ایضاً: ص: ۱۵

ا۔ ہاں میرے لیے اتنے سویرے اٹھنا ہے تو واقعی ایک نئی بات لیکن رات کو بعض خیالات میں کچھ ایسا منہمک رہا کہ نیند نہ پڑی اور آج صبح تڑکے ہی باغ میں ہوا کھانے چلا آیا۔

ف ۔غنیمت ہے کہ اسی بہانہ سے آپ کو صبح اٹھنا تو نصیب ہوا، بھلا اس وقت کے لطف کا کیا پوچھنا اور پھر خصوصاً اس موسم میں، یہ نیل گوں آسمان، یہ پرندوں کی زمزمہ سنجی، یہ درختوں اور پھولوں کی عطر بیزی، یہ طلوع آفتاب کا سہانا سماں، کوئی کہاں تک گنائے، اس وقت کی ہر کیفیت روح کو وجد میں لانے کے لیے کافی ہے، دماغ کی تازگی بھی جیسی اس وقت ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی اور مسائل پر غور کرنے کے لیے تو باغ کی فضا اور صبح کے وقت سے بہتر کوئی موقع ہو ہی نہیں سکتا مگر آپ تو خود اس وقت کسی غور میں ڈوبے ہوئے تھے، میں ناحق خلل انداز ہوا۔

ا۔نہیں، آپ خلل انداز بالکل نہیں ہوئے، میں اس وقت ایک مسئلہ کی ادھیڑ بن میں ضرور تھا اور چاہتا ہوں کہ اسے حل کر ڈالوں لیکن میرا دماغ بمقابلہ تنہائی کے مکالمہ میں زیادہ کام کرتا ہے، اس لیے مہربانی کر کے آپ جایئے نہیں بلکہ یہیں موجود رہیے، مبادلہ خیالات سے بہت سی گتھیاں سلجھ جاتی ہیں۔''[1]

''ف ۔اس نامعلوم الماہیت مادہ کا وجود ہے کس مقام پر؟

ا۔کیا خوب، آپ اچھی گرفت کرنا چاہتے ہیں، یعنی اگر میں یہ کہہ دوں کہ فضا میں ہے تو آپ فوراً یہ ثابت کر دیں گے کہ اس کا وجود محض ذہنی ہے کیوں کہ مکاں وفضا کا وجود محض ذہنی ہونا مسلم ہو چکا ہے لیکن مجھے اپنے ناواقفیت کے اظہار میں کوئی باک نہیں، میں صاف صاف کہتا ہوں کہ مجھے اس کی مقامیت کی کوئی خبر نہیں، صرف اتنا جانتا ہوں کہ فضا میں موجود نہیں ہے، آپ کے لیے یہی منفی جواب کافی ہے اور آئندہ مادہ سے متعلق آپ کے

---

[1] مکالمات برکلے: مترجم مولانا عبدالماجد دریابادی: ص:۲۱

ہر سوال کا جواب سلبی ہوگا۔

ف۔ اچھا آپ اس کی جگہ نہیں بتاتے ہیں نہ سہی، یہ تو فرمایئے کہ اس کی موجودگی کی شکل کیا ہے اور اس کے وجود سے مراد کیا ہے؟

ا۔ وہ نہ ذی شعور ہے نہ فعال، نہ مدرک ہے مدرک۔

ف۔ آخر اس میں کوئی صفت ایجابی ہے؟"[۱]

ف۔ میں جدید خیالات کے بانی ہونے کا مدعی نہیں، میری کوششوں کا ماحاصل صرف اس قدر رہا ہے کہ وہ صداقت جواب تک فلاسفہ اور عامتہ الناس کے درمیان منقسم رہی ہے اس کو مجموعی و یکجائی حیثیت سے بیان کروں، عامتہ الناس کا خیال یہ ہے کہ جو چیزیں براہ راست ادراک میں آتی ہیں وہی اشیائے حقیقی ہیں، اور فلاسفہ کا قول یہ رہا ہے کہ جو چیزیں براہ راست ادراک میں آتی ہیں وہ تصورات ہی ہیں جن کا وجود محض ذہنی ہے، میں نے صرف یہ کیا کہ ان دونوں دعوؤں کو یکجا کر دیا ہے۔

ا۔ میں ایک مدت تک حواس پر بے اعتباری کرتا رہا اور اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب تک چیزوں کو میں دھندلی روشنی میں جھوٹی عینک سے دیکھتا رہا، اب یہ عینک ہٹ گئی ہے اور گویا میری عقل ایک نئی روشنی میں آگئی ہے، اب مجھے پورا اطمنان ہوگیا ہے کہ میں موجودات کو ان کی ہیئت اصلی میں دیکھنے لگا ہوں اور ان کی نامعلوم ماہیت اور وجود خارجی کے پھیر میں نہیں پڑتا۔ ان نتائج تک تو میں اس وقت پہنچ گیا ہوں گو جس راستہ سے آپ مجھے اس منزل تک لائے ہیں وہ اب بھی میرے لیے صاف نہیں، آپ چلے تو اسی طریقہ پر جس پر اشراقیین متبعین ڈیکارٹ وغیرہ حکما اکثر چلتے ہیں اور دیر تک یہی معلوم ہوتا رہا کہ آپ ان ہی کی فلسفیانہ تشکیک کی جانب لیے جا رہے ہیں، لیکن آخر کار آپ کے نتائج ان کے بالکل برعکس نکلے۔

---

[۱] مکالمات برکلے: مترجم مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۹۱۔۹۲

ف۔دیکھیے وہ سامنے والے فوارہ کا پانی کیوں کر کچھ دور تک ایک گول ستون کی شکل میں اوپر کو جاتا ہے اور ایک خاص نقطہ تک پہنچ کر ہٹتا ہے اور پھر جہاں سے چڑھا تھا وہیں گرتا ہے، درآں حالاں کہ وہ اپنے اس چڑھاؤ اتار دونوں میں قانون کشش کا یکساں پابند ہے، اسی طرح وہی مقدمات جو پہلی نظر میں تشکیک کی جانب مودی ہوتے ہیں، کچھ عرصہ کے غور کے بعد انسان کو اس کی فطرت سلیم کی جانب واپس لے آتے ہیں۔''[۱]

منقولہ اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے انگریزی کے اصل متن کی روح کو کس خوبصورتی سے اردو کے قالب میں ڈھال دیا ہے، اور برکلے کے ذہن ودماغ اور اس کے افکار ونظریات کو اس انداز ولہجہ میں پیش کیا ہے جس انداز میں برکلے نے پیش کیا تھا۔ مولانا نے ترجمہ میں انگریزی محاورے اور روزمرہ وغیرہ کی جگہ پر اردو محاوروں اور ضرب الامثال وغیرہ کا سہارا لیا ہے۔ مولانا کو چونکہ اس موضوع سے فطری مناسبت تھی اس لیے انھوں نے کتاب کے مواد ومتن کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ اصل متن کی پوری روح اس ترجمہ میں سما گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا شمار کامیاب ترجمہ میں کیا جاتا ہے۔ مولانا نے اس ترجمہ میں توضیح وتشریح طلب الفاظ، اصطلاحات، جملوں وغیرہ کا حاشیہ بریکٹ میں درج کر دیا ہے، تا کہ متن کی تفہیم آسان ہو جائے، اور مشکل انگریزی الفاظ اور اصطلاحات کا اردو ترجمہ بھی کتاب کے آخر میں 'فرہنگ مصطلحات' کے عنوان سے نقل کیا ہے۔

ڈاکٹر اعجاز حسین اپنے مضمون 'عبدالماجد دریابادی' میں 'مکالمات برکلے' کی فنی عظمت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے۔

''ترجمہ میں سب سے پہلی چیز جہاں لوگوں کو لغزش ہو جاتی ہے وہ زبان کا میدان ہے۔ انگریزی نما اردو لکھ کر لوگ سمجھتے ہیں کہ مترجم کا اہم فرض ادا ہو گیا، لیکن یہ وہ ٹھوکر ہوتی ہے کہ جس کی بدولت قبول عام کا شرف ہمیشہ دور باش کی صدا دیتا ہے۔ عبدالماجد نے اس ترجمہ میں علاوہ اور باتوں کے زبان وطرز بیان کا خاص طور سے خیال رکھا ہے، محاورہ اور روزمرہ کی چاشنی مناسب

---

[۱] مکالمات برکلے: مترجم مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۱۴۸

مقامات پر دیے ہوئے مضامین کی دشوار گزار راہوں سے بھی نہایت خوبی
وکامیابی کے ساتھ گزر گئے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پڑھنے والے کی دلچسپی ہر
وقت باقی رہتی ہے۔''[۱]

پیام امن

مولانا ماجد کی دوسری ترجمہ کردہ کتاب 'پیام امن' ہے۔ یہ کتاب پال رچرڈ کی انگریزی کتاب ToTheNation کا اردو ترجمہ ہے یہ کتاب پہلی عالمی جنگ کے خاتمے کے قریب لکھی گئی تھی۔ کتاب کے موضوع کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے مولانا نے اس کا ترجمہ اردو میں 'پیام امن' کے نام سے کیا۔ مولانا آپ بیتی میں اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

''ایک فرنچ فلسفی پال رچرڈ کی انگریزی ToTheNation نظر سے
گزری، عین جنگ کے خاتمہ پر مستقل پیام امن کی دعوت لے کر شایع ہوئی۔
میں نے اسے اردو میں شروع ۲۰ء ہی میں اپنالی اور 'پیان امن' کا نام دے کر پھر
اس پر مقدمہ اور مفصل تبصرہ وغیرہ کا اضافہ کر کے اسے بجائے ترجمہ کے تالیف
سے قریب تر کر دیا۔ طبع و اشاعت کی نوبت تین ساڑھے تین سال بعد کہیں اخیر
۲۳ء میں آئی۔''[۲]

اس کا دوسرا ایڈیشن عبدالماجد اکیڈمی کی طرف سے ۱۹۸۳ء میں شایع ہوا۔ اس کتاب کی تاریخی اعتبار سے اہمیت ہے کہ یہ کتاب ایک صاحب طرز انشا پرداز کے قلم کی یادگار ہے۔ یہ کتاب تلاش کے باوجود نہ مل سکی۔ پیام امن کے متعلق حکیم عبدالقوی دریابادی مرحوم اپنے مضمون 'مولانا عبدالماجد دریابادی کی مکمل فہرست تصانیف' میں لکھتے ہیں۔

''پیام امن' ایک فلسفی مصنف و امن پسند فلسفی مسیو پال رچرڈ کی کتاب
کا جو پہلی جنگ عالمگیر کے خلاف اور اس کی تباہ کاریوں سے دنیا کو خبردار کرنے
کے لیے لکھی گئی تھی، کا اردو ترجمہ، اس میں مترجم نے اسلام اور امن وغیرہ کے
عنوان سے چند نئے ابواب کا اضافہ بھی کیا تھا۔''[۳]

۱۔ عبدالماجد دریابادی (مضمون) ڈاکٹر اعجاز حسین: فروغ اردو: (عبدالماجد دریابادی نمبر) اگست تا اکتوبر ۱۹۷۱ء لکھنو: ص: ۱۳۲

۲۔ آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۲۸۳۔۲۸۴

۳۔ [illegible] (مضمون) حکیم عبدالقوی دریابادی: فروغ اردو: (عبدالماجد دریابادی نمبر) اگست تا اکتوبر ۱۹۷۱ء لکھنو: ص: ۸۰

ناموران سائنس

مولانا ماجد کی تیسری ترجمہ کردہ کتاب 'ناموارن سائنس' ہے۔ یہ کتاب بھی تلاش کے باوجود نہ مل سکی۔ 'ناموران سائنس' کو میکملن اینڈ کمپنی لمیٹڈ کلکتہ نے ۱۹۲۴ء میں شایع کیا تھا۔ ولایت کے کسی بڑے ناشر نے مولانا سے تین کتابوں کے تراجم کے بارے میں خط و کتابت کی تھی۔ جس میں سے مولانا نے 'ناموران سائنس' کا انتخاب کیا۔ مولانا آپ بیتی میں لکھتے ہیں۔

> ''۲۱ء کا اخیر ہو گا کہ ولایت کے کسی بڑے ناشر غالبا (Macmilan) کے ہندوستانی ایجنٹ نے لاہور سے مجھے لکھا کہ ''ہمیں تین کتابوں کے اردو ترجمے کرانے ہیں۔ ڈاکٹر سر اقبال نے آپ کا نام تجویز کیا ہے'' میں نے ایک کتاب انتخاب کر لی، نام کچھ اس قسم کا یاد پڑتا ہے EminentMenOfScience ترجمہ کا نام 'مشاہیر سائنس' رکھا۔ ترجمہ کا معاوضہ اس کمپنی نے میرا مسودہ پہنچتے ہی ارسال کر دیا۔ اب یاد نہیں پڑتا کہ کیا تھا۔ مگر اچھا تھا۔''[۱]

مولانا ماجد نے اس کتاب کا نام 'مشاہیر سائنس' لکھا ہے، اور ان کے بھتیجے اور خویش حکیم عبدالقوی دریابادی نے بھی مولانا کی مکمل تصانیف کی فہرست رسالہ فروغ اردو عبدالماجد دریابادی نمبر میں 'مشاہیر سائنس' لکھا ہے۔ لیکن ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب کے مطابق اس کتاب کا نام 'ناموران سائنس' ہے۔ تحسین فراقی صاحب اس کتاب کی اہمیت اور زبان و بیان کے متعلق لکھتے ہیں۔

> ''مولانا دریابادی اور حکیم عبدالقوی صاحبان دونوں کو ترجمہ کردہ کتاب کے صحیح نام کے بیان میں تسامح ہوا ہے۔ ماجد کی ترجمہ کردہ کتاب کا نام 'مشاہیر سائنس' نہیں 'ناموران سائنس' ہے ....'ناموران سائنس' پندرہ اہم سائنس دانوں کے احوال پر مشتمل ہے جس کی تفصیل یہ ہے ۱۔ گیلی لیو گیلی لی ۲۔ ولیم گیکسٹن ۳۔ اسحاق نیوٹن ۴۔ بنجمن فرینکلسن ۵۔ رچرڈ آرک رائٹ ۶۔ ولیم مرڈک ۷۔ ہمفری ڈیوی ۸۔ جارج اسٹی فن سن ۹۔ مائیکل فراڈے ۱۰۔ چارلس

۱۔ آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۲۸۴

ڈارون ۱۱۔ جیمس سمسن ۱۲۔ جوزف لسٹر ۱۳۔ ٹامس الوا ایڈیسن ۱۴۔ سر جگدیش چندر بوس ۱۵۔ پروفلا چندر رائے۔ پہلی بات جو ناموران سائنس کے بارے میں کہی جا سکتی ہے، وہ اس کے اسلوب کی تازہ کاری ہے۔ خصوصیت کے ساتھ کم وبیش ہر باب کا آغاز وتمہید دلچسپ اور دل کش ہوتے ہیں، مثلاً پہلے باب 'گیلی لیو گیلی لی'، ہی کی ابتدائی چند سطور ملاحظہ ہوں ''ٹھیک اسی دن جب کہ ایک آفتاب صنعت غروب ہو رہا تھا، ایک آفتاب حکمت طلوع ہو رہا تھا۔'' دوسری اہم بات یہ کہ اگرچہ کتاب میں ہر باب اپنی جگہ ایک الگ کڑی کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن مصنف نے سن وار ترتیب کے ذریعے پوری مہارت کے ساتھ ایک باب کو دوسرے سے اس طرح مربوط کر دیا ہے کہ پوری کتاب ایک مسلسل داستان لگتی ہے۔ جہد مسلسل، تندہی، استقلال، پامردی، ذہانت، قوت ایجاد، تازہ کاری، انکشاف، اکتشاف اور ہمت وجرات کی صفات ثابتہ کی۔ پھر اکثر مشاہیر سائنس کے گھریلو اور معاشی حالات خاصے حوصلہ شکن اور اعصاب فرسا تھے لیکن یہ لوگ اسی بھٹی سے تپ کر کندن بن کر نکلے۔ 'ناموران سائنس' مختلف مشاہدات، واقعات اور ایجادات کا ایک حیرت خانہ ہے۔ تیسری اہم بات یہ ہے کہ مصنف نے 'ناموران سائنس' کے واقعات کو خالص تکنیکی اور پیچیدہ مباحث سے پاک رکھا ہے اور فارمولوں اور ایجادات کے متعلق بیان سے زیادہ ایجادات سے پیدا ہونے والے سہولت بخش نتائج کی تفصیل مہیا کی ہے۔۔۔۔ انگریزی متن کی غیر موجودگی میں ترجمے کے محاسن یا معائب کا ذکر تو ممکن نہیں، البتہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ 'ناموران سائنس' پر سرے سے ترجمے کا نہیں طبع زاد تصنیف کا گمان گزرتا ہے۔ یہ سہولت اظہار ماجد کا خاص فن ہے۔ یوں لگتا ہے انھوں نے اصل کے عناصر کو خوبی سے ترجمے میں سمیٹ لیا ہے۔''[1]

---

[1] مولانا عبدالماجد دریابادی احوال وآثار: ڈاکٹر تحسین فراقی: ص: ۲۸۷۔۲۸۸۔۲۸۹

تفسیر ماجدی و ترجمہ قرآن پاک

مولانا ماجد کے خالص تراجم میں سب سے اہم، شاہکار، تاریخ ساز کارنامہ کلام اللہ کی انگریزی اور اردو ترجمہ اور تفسیر ہے۔ براعظم کے مفسرین میں مولانا مرحوم ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ انھوں نے انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں کلام اللہ کے ترجمہ و تفسیر کا کام بحسن خوبی انجام دیا ہے۔ انگریزی میں انھوں نے جمہور اہل سنت کے لیے قابل قبول ترجمہ و تفسیر TheGloriousQuran کے نام سے کیا، جسے تاج کمپنی لاہور نے ایک لمبی مدت کے بعد چھاپا۔ اس کے بعد مرحوم نے اس دوسرے ایڈیشن پر نظر ثانی زبان و بیان اور مفہوم دونوں اعتبار سے کی، اور اس کے دوسرے ایڈیشن کو مجلس تحقیقات و نشریات اسلام ندوۃ العلماء نے شایع کیا، اور اس سے بھی زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ اس کا تیسرا دیدہ زیب ایڈیشن اسلامک فاؤنڈیشن لیسٹر نے حال ہی میں شایع کیا جس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ تفسیر میں نصرانیت اور یہود کے تقابلی مطالعہ کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

تفسیر ماجدی اردو بھی مولانا کا ایک اہم اور لازوال کارنامہ ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن تاج کمپنی لاہور نے لمبی مدت کے بعد شایع کیا۔ پھر مرحوم نے اس پر نظر ثانی کی جس میں پہلے ایڈیشن کا تقریباً چالیس پچاس فیصدی حصہ بدل دیا گیا، اور اس کی اشاعت مجلس تحقیقات و نشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنو کر رہی ہے، تین جلدیں مکمل ہو چکی ہیں چوتھی اور آخری جلد ابھی شایع ہونا باقی ہے۔ ان ترجموں کی تعریف و تحسین فاضلین و ماہرین نے کی ہے۔ مولانا کے قرآنی تراجم و تفاسیر ان کی باریک بینی، وسعت مطالعہ، قرآن فہمی، دینی و فکری بصیرت کی عمدہ مثالیں ہیں۔ مولانا نے علوم شرعیہ کی باضابطہ تعلیم کسی دارالعلوم میں حاصل نہیں کی، اس کے باوجود مولانا کا شمار درجہ اول کے علمائے دین اور مفسرین قرآن میں کیا جاتا ہے۔ خدائے قدوس کے فضل و کرم کے ساتھ اسلامی علوم کے حصول میں مولانا کی محنت، ریاضت، ذہانت بھی شامل ہے۔

۱۹۳۳ء میں مولانا نے تھانہ بھون میں کئی ہفتہ کا قیام کیا۔ اور وہاں ان کی ملاقات مولوی سراج الحق مچھلی شہری سے ہوئی جنھوں نے مولانا سے قرآن کا انگریزی میں ترجمہ و تفسیر لکھنے کی فرمائش کی۔ سراج الحق صاحب کے اصرار اور مولانا اشرف علی تھانوی کی تائید و تشدید پر مولانا ماجد صاحب نے انگریزی ترجمہ و تفسیر لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ مولانا نے انگریزی ترجمہ و تفسیر لکھنے کے درمیان جن کتابوں سے استفادہ کیا اور جن

دشواریوں سے وہ دوچار ہوئے ان کا تذکرہ اپنی خودنوشت میں تفصیل سے کیا ہے۔

''۱۹۴۳ء تھا اور اپنا قیام اس وقت تھانہ بھون کئی ہفتے کی مدت کے لیے تھا، کہ ایک مقیم خانقاہ مولوی سراج الحق مچھلی شہری، استاد مجیدیہ انٹرمیڈیٹ کالج الہ آباد سے ملاقات ہوئی۔.... ایک روز انھوں نے باتوں میں کہا کہ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ اہل سنت و جمہور امت کی طرف سے قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ ایک بھی موجود نہیں۔ آپ ضرور یہ کام کرڈالیے۔ میں اپنی انگریزی اور اردو دونوں کی قابلیت کے حدود اربعہ سے خوب واقف تھا، فرمائش پر دنگ رہا، اور جواب کچھ اس طرح کا دیا کہ آپ نے حسن ظن کی حد کردی، کہاں میں اور کہاں اتنا بڑا کام! کچھ تھوڑی بہت مناسبت بھی تو ہو؟ لیکن وہ کیا ماننے والے تھے، اصرار کیے گئے، آخر میں بولے ''نیا ترجمہ نہ سہی، آخر محمد علی لاہوری کا ترجمہ تو موجود ہی ہے، اسی کو زمین بنا کر اسی میں ترمیم وتصرف کر کے کام چلائیے۔'' اب ان کے اخلاص کی کرامت سمجھیے یا جو کچھ، بات دل میں اتر سی گئی،..... قلم ہاتھ میں لیا۔ کام شروع کر دینے اور تھوڑا بہت کرڈالنے کے بعد ہی جا کر کام کی عظمت اور پھیلاؤ کا اندازہ ہوا، یہ اگر پہلے سے کہیں ہوگیا ہوتا، تو ہرگز جرات ہی نہ کرتا۔ ابتدائی خیال کہ دو ایک ڈکشنریوں کی مدد سے اور دو ایک انگریزی ترجمہ سامنے رکھ لینے سے کام چل جائے گا، اب بالکل طفلانہ نظر آنے لگا۔ سچ (صدق کا پرانا نام) عارضی طور پر بند کر کے اس کے کام سے چھٹی لے لی، اور کہنا چاہیے کہ سارا ہی وقت اس خدمت قرآنی کے نذر کر دیا۔ بعد عصر باہر بیٹھنے کا معمول تھا، اسے روزانہ سے سہ روزہ کرنا پڑا۔ اس ساری کتر بیونت کے بعد بھی معلوم ہوا کہ وقت بالکل ناکافی ہے، اور تفسیری حاشیوں کی تیاری کے لیے تو کتابوں کے انبار کی حد ہی نہیں! کہ عشق آساں نمود اول و بے افتاد مشکلہا کا معاملہ۔ بیسیوں نہیں، پچاسوں کیا سیکڑوں ہی جلدیں، کیسی کیسی ضخیم وگراں

قیمت ،لغت عربی کی،لغت عربی انگریزی کی ،جغرافیہ عرب کی ،جغرافیہ شام وعراق ومصر کی،تاریخ اقوام عرب واسرائیل کی،تاریخ روم وایران کی،تاریخ مذاہب یہود ونصاری کی،عقائد مجوس ومشرکین کی،تاریخ تمدن کی،اورعلاوہ تفسیر کے حدیث ،فقہ،کلام وغیرہ مختلف علوم وفنون کی کتابیں منگانا اور مطالعہ کرنا پڑ گئیں ۔اورتفسیری حاشیے الگ رہے،نفس ترجمہ ہی کا کام کتنا دشوار نکلا۔شروع شروع میں دلیل راہ محمد علی لاہوری کے ترجمہ کو بنانا سوچا تھا،آگے چل کر اسے بالکل ترک کر دیا۔پکھتال ،سیل ،بیل وغیرہ کے مکمل اور لین وسید حسین بلگرامی کے نامکمل ترجموں سے یقیناً بڑی مدد ملی ،پھر بھی مشکلات ایسی ایسی پیش آئیں کہ کہنا چاہیے رو رو دیا ہوں !لین کے عربی انگریزی لغت نے بڑا سہارا دیا۔سال ڈیڑھ سال جٹ کر کام کرنے کے بعد کہیں مسودہ اول تیار ہوا۔''[1]

مولانا نے انگریزی ترجمہ کرتے وقت مختلف مذہبی کتابوں ،قرآن کی مختلف تفاسیر اور حدیث انسائیکلو پیڈیا وغیرہ سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔انھوں نے قرآن کے واقعات کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔حضرت مریم ،اور جنت دوزخ ،انجیل وتورات کے واقعات کو قرآن کی روشنی میں پیش کیا ہے۔تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے دوسری آسمانی کتابوں کی تحریف کو قرآن سے ثابت کیا ہے۔مولانا کا مطالعہ چونکہ بہت وسیع اور ہمہ جہت تھا،اسی وجہ سے ان کی تفاسیر میں وسعت ،فکر ونظر پیدا ہوگئی ہے۔مولانا نے حنفی مسلک کی روشنی میں کلام اللہ کی تفسیر پیش کی ہے۔مولانا کی انگریزی تفسیر زبان وبیان کے اعتبار سے مواد اور انداز استدلال کی وجہ سے بہت جلد مقبول ومشہور ہوگئی۔پہلے پارے کی اشاعت کے بعد ہی اس پر تنقید وتبصرے کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ترجمہ کے ساتھ مولانا نے حاشیہ کا بہت اہتمام کیا ہے۔جن میں قرآن کے مطالب کی وضاحت کے ساتھ جغرافیائی اور تاریخی پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔دوسرے مذہب کے عقیدوں کا موازنہ اسلام سے بڑے ہی مدلل انداز میں کیا ہے،اوراس کے لیے دوسرے آسمانی صحیفوں اور مستند کتابوں کے حوالے بھی بکثرت پیش کیے ہیں۔مولانا کو انگریزی زبان وبیان پر بھی بڑی قدرت حاصل تھی ،اردو کی طرح وہ انگریزی کے بھی صاحب انشاپرداز تھے۔اسی لیے مولانا کے ترجموں میں تمام خوبیوں کے ساتھ

---

[1] آپ بیتی:مولانا عبدالماجد دریابادی:ص:۲۹۲۔۲۹۳۔۲۹۴

ساتھ زبان وبیان کی دلکشی بھی پائی جاتی ہے۔ مولانا کا یہ کارنامہ رہتی دنیا تک باقی رہے گا، اور انشا اللہ لوگ اس سے مفید ہوتے رہیں گے۔ مولانا ماجد کی انگریزی تفسیر کے متعلق مولانا ماجد کے بھتیجے اور داماد عبدالعلیم قدوائی صاحب کی یہ رائے بڑی معتبر معلوم ہوتی ہے۔

> ''مذاہب عالم اور عصری علوم کی واقفیت اور انگریزی و عربی پر عبور رکھنے کی وجہ سے خاطر خواہ جدید ترین معلومات فراہم کر دی ہیں، اسی کے ساتھ ہی کہیں بھی تفسیر بالرائے یا مرعوبیت ومعذرت خواہی کی جھلک نہیں ملتی۔ جس کی وجہ سے ان کی تفسیر مستند اور معتبر ہے۔ انگریزی میں ترجمہ کرنے والوں میں عام طور پر یہ کمی یا کمزوری دیکھنے میں آتی ہے کہ وہ جنت دوزخ، حور وغلمان اور جنت کی نعمتوں کے ذکر میں شرمساری اور معذرت خواہی کا لہجہ اختیار کرتے ہیں اور ان کو رمز کنایہ یا محاوراتی تعبیر کہہ کر ٹال دیتے ہیں۔ مولانا نے ایک مومن صادق کی طرح ان حقائق کو پورے عزم واعتماد کے ساتھ پیش کیا اور یہودیت وعیسائیت کی تحریفات کو بے نقاب کیا اور تاریخی حیثیت سے قرآن مجید کے قصوں اور واقعات کی صحت ثابت کی اور حضرت موسیٰؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت لوطؑ، حضرت مسیحؑ اور دیگر پیغمبران عظام کی عصمت وعظمت کی مدلل وضاحت کی۔ مولانا کا ترجمہ وتفسیر نہ صرف پختہ مسلمانوں کے ایمان کو پختہ تر بناتا ہے بلکہ یوروپی ومغربی تعلیم سے متاثر ومرعوب مسلمانوں کو شک وشبہہ کی دلدل سے نکال کر اسلام کی صراط مستقیم پر گامزن کرتا ہے۔''[۱]

انگریزی تفسیر کے مکمل ہونے کے بعد مولانا نے ۱۹۳۹ء میں اردو تفسیر لکھنی شروع کر دی۔ مولانا کی اردو تفسیر بھی قرآنیات میں ایک بیش قیمت اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے، اور انگریزی کے مقابلے میں زیادہ مفصل اور ضخیم ہے۔ اس میں بھی حاشیہ میں تاریخی وجغرافیائی پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے، اور ساتھ ہی عربی الفاظ وتراکیب کے مطالب کو صرفی ونحوی اعتبار سے پیش کیا گیا ہے۔ مولانا نے اپنے اردو ترجمہ وتفسیر کی بنیاد مولانا اشرف علی تھانوی کی تفسیر 'بیان القرآن' کو بنایا تھا۔ مولانا 'آپ بیتی' میں لکھتے ہیں

---

[۱] مولانا عبدالماجد دریابادی حیات وخدمات: عبدالعلیم قدوائی: ص:۱۰۲-۱۰۳

''انگریزی کام کرنے سے ہمت کھل گئی، اور ابھی اسی کی نظر ثانی پوری طرح نہیں ہوئی تھی کہ حوصلہ اسی طرز انداز میں، گو اور زیادہ تفصیل و وسعت کے ساتھ اردو ترجمہ و تفسیر کا بھی ہو گیا۔ اور اس میں مدد سب سے بڑھ کر حضرت تھانوی کے ترجمہ و تفسیر 'بیان القرآن' سے ملی، قرآن مجید کے اردو ترجمے اور بھی اچھے اچھے ہو چکے ہیں اور شاہ عبدالقادر دہلوی کا ترجمہ تو کہنا چاہیے اپنی نظیر آپ تھا۔ لیکن جتنی رعایتیں حضرت تھانوی کے ترجمہ میں جمع ہو گئی ہیں، وہ اور کہیں بھی نہ مل سکیں، میرا ترجمہ تو کہنا چاہیے کہ ۷۵ فی صد اسی ترجمہ اشرفیہ کی نقل ہے، اور تفسیری حصہ میں بھی فقہیات میں نے بڑی حد تک اسی 'بیان القرآن' سے لی ہیں۔ حضرت مرحوم اس کام کے آغاز سے ۳، ۴ سال بعد تک حیات رہے اور برابر زبانی و تحریری ہر قسم کا مشورہ اس باب میں دیتے رہے، بلکہ میں خود بھی ہمت کر کر کے ہدایتیں حاصل کرتا رہا۔ اردو تفسیر کی ضخامت انگریزی تفسیر سے کہیں بڑھ گئی، اور لغت اور قدیم تفسیروں کی عبارتوں کی عبارتیں اس میں کثرت سے نقل ہوتی رہیں، پھر بھی کام اپنی ہی زبان میں کرتا رہا، اس لیے اس میں وقت بھی انگریزی کے مقابلہ میں کہیں کم لگا، اور کوئی چار برس کی محنت میں اس کا مسودہ تیار ہو گیا۔ اور ۴۴ء میں پارہ اسی تاج کمپنی لاہور کے پاس پہنچنا شروع ہو گیا۔''[۱]

'تفسیر ماجدی' جلد اول میں 'عرض ناشر' کے عنوان سے اس کی اہمیت و افادیت کا اعتراف مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے اس طرح کیا ہے۔

''قرآن مجید کو جس کا کلام معجز بیان عظیم و پر وقار زبان اور فصیح و بلیغ عبارت کا کامل وصف رکھتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ اس کو عظیم تقدس و عظمت حاصل ہے، مولاناؒ نے اس کی ترجمانی میں ادب کی بیباکی اور عبارت کی اثر انگیزی کو احتیاط کے حدود سے نکلنے نہیں دیا ہے، بلکہ قرآن مجید کے الفاظ و عبارت کی روح کو سمجھنے اور سمجھ کر پوری امانت داری کے ساتھ اس کے مفہوم کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔''[۲]

---

۱ آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۲۹۶۔۲۹۷

۲ تفسیر ماجدی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ل۔و

'تفسیر ماجدی' کا مقدمہ مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندوی نے لکھا ہے۔ مقدمہ میں 'تفسیر ماجدی' کی اہمیت وافادیت کا اعتراف مولانا مرحوم نے اس طرح کیا ہے۔

''ہمارے محدود علم میں (اور یہ بات وسیع سفروں اور سیاحتوں، یورپ اور امریکہ کے سفروں اور وہاں کی بہت سی علمی کوششوں سے واقفیت کے بعد لکھا جارہا ہے) اللہ تعالیٰ نے ہندوستان کے ایک محقق اور فاضل یگانہ اور خادم دین مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب کو توفیق دی کہ وہ تقابل مذاہب اور تقابل صحف سماوی کا منظم، وسیع اور مخلصانہ مطالعہ فرمائیں اور کم سے کم انگریزی میں شایع ہونے والی تنقیدی، احتسابی وتقابلی کتابوں، موسوعات، انسائیکلوپیڈیاز، اور وقتاً فوقتاً شایع ہونے والے مضامین ومباحث کا مطالعہ جاری رکھیں، اور ان کے حوالہ ونشاندہی سے بدیہی حقائق کی طرح قرآن مجید کے اعجاز اور اس کی محفوظیت اور تورات وانجیل کے تحریفات، خارجی اضافات اور ذات وصفات خداوندی کے خلاف بیانات اور نسبتوں سے پردہ اٹھائیں، یہ ایک خادم دین مترجم ومفسر قرآن کا وہ کارنامہ اور اس کے اخلاص وبلند ہمتی کا شاہکار ہے، جس میں راقم حروف کی نظر میں ان کا اس عہد میں نہ صرف ہندوستان بلکہ کسی اسلامی ملک میں بھی کوئی ہمسر اور نظیر نظر نہیں آتا۔''[1]

'تفسیر ماجدی' جلد اول کے آخر میں مولانا عبداللہ عباس ندوی صاحب نے 'تفسیر ماجدی کی خصوصیات اور اس کی انفرادیت' کے عنوان سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

''مولانا دریابادیؒ مفسر ہونے سے پہلے وہ 'عبدالماجد دریابادی' صاحب طرز انشا پرداز، کامیاب صحافی کی حیثیت سے معروف تھے، فلسفہ جذبات اور فلسفہ اجتماع کے مصنف، مذہبی لٹریچر کا وسیع مطالعہ رکھنے والے دانشور تھے، سوائے اخلاص کے کوئی بات ایسی نہ تھی جو ان کو تفسیر لکھنے پر آمادہ کرتی، عربی میں ان کی صلاحیت عربیت کے کسی بڑے فاضل سے کم نہ تھی،

---

[1] مقدمہ تفسیر ماجدی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص:۳

انھوں نے باقاعدہ اس کی تحصیل کی تھی ۔صرف ونحو کی باریکیوں پر جوان کی نگاہ تھی اس کا اندازہ اسی کو ہوسکتا ہے،جس نے ان کی تفسیری بحثیں پڑھی ہیں۔ .....یہ تفسیر مفسر گر ہے،اگرکسی ایک کتاب میں کسی کو دیکھنا ہو کہ قدماء نے کیا لکھا ہے،اور کن الفاظ میں لکھا ہے،وہ اس کو تفسیر ماجدی میں پالے گا،محققین کی تازہ سے تازہ تحقیقات معلوم کرنا ہو تو اس کا مکمل مواد اس تفسیر میں پائیں گے ،ایک لفظ کے اگر متعدد معانی مختلف مفسروں نے بیان کیے ہیں اگر ان کو کوئی یکجا رکھنا چاہے تو اس کو اس تفسیر میں مل جائے گا،نحوی ترکیب کے کسی گوشہ یا شوشہ میں الجھنیں پیش آرہی ہو تو تفسیر ماجدی میں اس کا حل ہے۔''[۱]

'تفسیر ماجدی' کے جلد اول میں مولانا ماجد کے تین دیباچے افتتاحیہ کے نام سے شامل ہیں۔یہ افتتاحیے مختلف اشاعتوں کے موقع پر لکھے گئے تھے۔افتتاحیہ میں مولانا نے جن لغت ومتعلقات لغت،لغت قرآنی،اور تفسیر متعلقات تفسیر سے استفادہ کیا ہے،ان کی فہرست،لغت،لغات القرآن،اعراب القرآن، قرآنیات کی جامع کتابیں،عربی تفسیریں،فقہی تفسیریں،اردو تفسیریں کے عنوان سے درج کردی ہیں۔جو تقریبا ۶۵ ہیں۔لغات وتفاسیر کی جن کتابوں کے حوالے بار بار آئے ہیں مولانا نے پورا نام نقل نہ کرکے ان کے مختصر مخففات درج کیے ہیں،ان علامات کی فہرست بھی مولانا نے افتتاحیہ میں درج کردی ہے۔مولانا نے قدیم تفاسیر کے متروکہ الفاظ کے معنی ومطالب کو بھی بطور مثال پیش کیا ہے۔مولانا لکھتے ہیں کہ تبدیلی زمانہ کے ساتھ ساتھ الفاظ کے معنی ومطالب بدلتے رہتے ہیں۔جو تفسیریں قدیم زمانے میں زبان وبیان کے لحاظ سے عمدہ تسلیم کی گئی تھیں۔آج وہ جدید نسل کے لیے پچاس فیصد ناقابل فہم ہو چکی ہیں۔یہ ہمیشہ چلتا رہے گا،قدرت کے اس تصرف کو روکنا کسی کے بس میں نہیں۔قرآن زماں ومکاں کے قیود سے آزاد ہے،اس کی ہدایات ہر ملک،قوم ونسل کے لیے ہے۔اس کی ابدیت زمانے کے تقاضے کے مطابق ہونا بھی قرآن کا معجزہ ہے۔اسی لیے اس کی تعبیر ہر زمانے میں ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔جغرافیائی اعتبار سے بھی تفسیروں کے لکھنے کا رواج ہے،مثلا اسپین مفسرین کے رنگ سے شامی،عجمی،ہندی مفسرین کا رنگ بالکل مختلف ہوگا،اور تفسیریں وقت اور دور کے اعتبار سے بھی بدلتی رہی ہیں۔قرآن کے اعجاز وعظمت کا اعتراف

---

[۱] تفسیر ماجدی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص:۹۹۹-۱۰۰۶

مولانا ماجد صاحب نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

''قرآن مجید نے انتہائی حکیمانہ طریقہ یہ اختیار کیا کہ ان ساری فرعی، ضمنی، ثانوی بحثوں سے متعلق اس نے صراحت تو ایک بار بھی مذاق عرب کے خلاف نہیں کی اور اہل عرب کے علمی، عقلی، فکری مزعومات کو ان کے حال ہی پر چھوڑے رکھا، لیکن اشارے ایسے برابر رکھ دیے اور کلام میں لچک اتنی پیدا کر دی کہ آئندہ نسلیں اپنے اپنے دور کے ماحول فکری کے مطابق اس کتاب الٰہی کی تعبیر وتشریح میں آزاد رہیں۔ یہ انتہائی نازک ودشوار مقام تھا، کوئی بشری عقل وحکمت اس سے عہدہ برآ ہو ہی نہیں سکتی تھی، یہ قرآن ہی کا اعجاز ہے اور اس کے کتاب الٰہی ہونے پر ایک مستقل دلیل سائنس اور ایک سائنس ہی پر کیا موقوف ہے، ریاضی کے ممکن استثناء کے بعد سارے ہی دنیوی علوم وفنون کا یہ حال ہے کہ ان کی یافت اور تحقیق برابر بدلتی رہتی ہے اور ثبات وقرار ان علوم میں سے کسی کے بھی نصیب میں نہیں، اسی مسلسل ومستمر بے ثباتی کا نام ان علوم کی 'ترقی' یا 'ارتقاء' رکھ دیا گیا ہے، نظریات وظنیات ہی نہیں، ان علوم کے بڑے بڑے مقبول ومعروف مسلمات وقطعیات تک ہر تھوڑی مدت گزر جانے پر کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔ اور 'قدیم' کے پرستار 'جدید' کے معتقدین کا بس منھ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ قرآن مجید، بشری علوم کی ان نیرنگیوں اور تلون مزاجیوں کا ساتھ کیونکر دے سکتا تھا، اس نے ان ہونی، ہونی کر دکھائی، کہ اپنی عبارت کے اندر لچک اس غضب کی اور اتنی حیرت انگیز رکھ دی کہ جس طرح اب تک کسی دور کے بھی 'محقق' اسے عصری تحقیقات کے منافی ومعارض نہ پاسکے، آئندہ بھی کسی دور میں انشاء اللہ نہ پاسکیں گے۔''[۱]

عبدالعلیم قدوائی صاحب مولانا کی اردو تفسیر کی اشاعت اور انگریزی کی حالیہ اشاعت کے متعلق اپنی کتاب 'عبدالماجد دریابادی حیات وخدمات' میں لکھتے ہیں۔

---

[۱] تفسیر ماجدی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۱۳۔۱۴

''ان کی اردو تفسیر چار سال میں یعنی ۱۹۴۴ء میں مکمل ہوگئی اور اس کی اشاعت بھی تاج کمپنی لاہور نے کی مگر اس میں ۱۸ سال کی لمبی مدت لگی۔ اس کے پہلے ایڈیشن پر مولانا نے نظر ثانی کی جس میں تقریباً ۴۰ فیصدی حصہ حک واضافہ کے بعد نیا ہو گیا تھا مگر افسوس ہے ان کی زندگی میں دوسرے ایڈیشن کے صرف گیارہ پارے شایع ہو سکے۔ نظر ثانی شدہ مکمل ایڈیشن، ندوۃ العلماء کی مجلس تحقیقات اسلامی شایع کر رہی ہے، تین جلدیں چھپ چکی ہیں اور جلد ہی آخری یعنی چوتھی جلد چھپ جائے گی۔ انگریزی ترجمہ وتفسیر کا مکمل دوسرا ایڈیشن مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ندوۃ العلماء نے چار حصوں میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے پیش لفظ کے ساتھ چھاپا، اور اس کا تیسرا ایڈیشن جس میں خاص توجہ یہودیت وعیسائیت سے تقابل پر دی گئی ہے، اسلامک فاؤنڈیشن لینسٹر نے GloriousQuran کے نام سے شایع کیا ہے جو یورپ اور امریکہ میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اب اس کا ہندوستانی ایڈیشن بھی لکھنو سے شایع ہوا ہے۔ اس میں ترجمہ تو اصل والا قائم رکھا ہے البتہ تفسیر حواشی کم کر دیے ہیں۔ اس کی ایڈیٹنگ وترتیب کی سعادت مولانا مرحوم کے نواسے اور پوتے ڈاکٹر عبدالرحیم قدوائی پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو حاصل ہوئی۔''[۱]

مولانا کی ترجمہ نگاری کی خصوصیت حسب ذیل ہیں۔

زبان صاف سادہ سلیس اور شگفتہ ہے۔ موضوع کے مطابق الفاظ اور ترکیبیں استعمال کی گئی ہیں۔ ان کے ترجمے نہ تو سر تا سر لفظی ہیں اور نہ متن سے علحیدہ تصنیف کہے جاسکتے ہیں۔ دوسری خصوصیات ترجموں میں آمد اور روانی ہے، یعنی کہیں سے یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ ہے اور آورد اور تصنع کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ مولانا کو لغت سے گہری دلچسپی تھی اور ان کا مطالعہ بھی بڑا وسیع تھا۔ اس لیے ان کے ترجموں کو قدر واعتبار کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ علاوہ تراجم کے انھوں نے بہت سے مضامین کے خلاصے یا تلخیص بھی کی جو افسوس ہے اب نایاب کے حکم میں داخل ہیں۔

۱؎ مولانا عبدالماجد دریابادی حیات وخدمات: عبدالعلیم قدوائی: ص: ۱۰۳۔۱۰۴

تاریخ اخلاق یورپ

انگلستان کے مشہور فاضل مصنف 'ایڈورڈ پول لیکی' کی انگریزی تصنیف HistoryOf EuropianMorals کا سلیس وشستہ ملخص ترجمہ 'تاریخ اخلاق یورپ' کے نام سے مولانا ماجد نے کیا تھا۔ اس کتاب میں قدیم یورپ کے اخلاقی نظریات کی عہد بہ عہد تغیرات کی تاریخ بیان کی گئی ہے، اور مذہب اخلاق ومعاشرت کے باہمی تعلقات پر گہرائی سے چھان بین کر کے داد دی گئی ہے۔ یہ کتاب تاریخ وتہذیب اور عمرانیات جیسے موضوع پر لکھے جانے کے باوجود بڑی دلچسپ اور زبان وبیان کے اعتبار سے بڑی اہم ہے۔ اسی وجہ سے مولانا نے اس کا ملخص ترجمہ اردو میں پیش کیا ہے۔ مولانا اس کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

> ''ترجمہ کو صحیح معنوں میں ترجمہ کہنا درست نہیں اس لیے کہ اس میں مصنف کے الفاظ کی پابندی ایک مقام پر بھی نہیں کی گئی، صرف اس کے مفہوم کو پیش نظر رکھ کر اس کے اصل خیال کو اردو میں ادا کر دیا گیا ہے۔''[۱]

تاریخ اخلاق یورپ دو جلدوں میں شائع ہوئی۔ حصہ اول میں یورپ کی قدیم ترین یعنی قبل مسیح کی اخلاقی حالات پر بحث کی گئی اور ساتھ ہی روم کے قبول مسیحیت اور اس کے اثرات ونتائج پر بحث کی گئی ہے۔ جلد دوم میں مسیحیت کے اخلاقی خوبیوں کو بیان کیا گیا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ ان کے تمدن کے تاریک پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ مسیحیوں کے خانقاہی رہبانی مزاج اور ان کے خصائص وکردار کی نشان دہی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کتاب یورپ کی اخلاقی، تہذیبی، تاریخی اور معاشرتی احوال کا آئینہ ہے۔ آخر میں یونان کی اخلاقی حالات، مسیحی اثرات ونتائج کے ساتھ ساتھ عورت کے فضائل وحقوق کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ تاریخ اخلاق یورپ' میں مولانا کی زبان وبیان اور اسلوب نگارش نے مورخ کے فلسفیانہ تجزیے ونظریات اور مسیحی علم کلام کے مباحث کو عام فہم بنا دیا ہے۔ مولانا کا یہ ترجمہ ترجمانی کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ تالیف سے قریب تر ہو گیا ہے۔ اس کتاب میں مولانا کی منفرد طرز تحریر اور ان کی عبارت آرائی پورے طور پر نظر آتی ہے۔ مولانا نے اس کتاب میں مصنف کے مباحث ونظریات کو قابل فہم بنانے کے لیے موزوں وبرمحل اشعار کا بھی سہارا لیا ہے۔

---

[۱] بحوالہ عبدالماجد دریابادی: سلیم قدوائی: ص:٦٩

تاریخ تمدن

'تاریخ تمدن' مسٹر ہنری ٹامس کی کتاب HistoryOfCivilizationInEngland ہے۔ یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ مولانا ماجد نے اس کے کچھ حصوں کا ترجمہ کیا ہے، وہ آپ بیتی میں لکھتے ہیں۔

دوسری کتاب HistoryOfCivilizationInEngland تھی۔ تین جلدوں میں، اس کے ایک بڑے حصہ کا ترجمہ ایک اور صاحب کر کے وفات پا چکے تھے، باقی کا تکملہ میں نے کیا۔''[۱]

مولانا ماجد نے 'تاریخ تمدن' کے آخری باب کا ترجمہ 'انگلستان کی اجمالی تاریخ' کے نام سے کیا ہے۔ مولانا ماجد صاحب نے دونوں کتابوں کی تلخیص و ترجمہ کے متعلق 'آپ بیتی' میں جو لکھا ہے، اس سے ان کے اس ترجمہ کے طریقہ کار کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

''میرے ترجمہ کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے پوری کتاب پڑھ ڈالتا۔ اس کے بعد ایک ایک باب پڑھتا، تیسری مرتبہ دو صفحہ تین صفحہ، غرض اتنا پڑھ لیتا، جتنا ترجمہ اس دن مقصود ہوتا، چوتھی بار ایک ایک پیراگراف پڑھتا، اس طرح مطلب و معنی پر پورا عبور ہو جاتا، اور پھر قلم برداشتہ ترجمہ کر ڈالتا۔''[۲]

منطق (استخراجی واستقرائی)

یہ کتاب پروفیسر پی کے رے کی کتاب TextBookOfDeductiveLogic کا ملخص ترجمہ ہے۔ مولانا ماجد نے اس کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ ہو چکا ہے اور یہ کتاب ہندوستانی کالجوں کے نصاب میں داخل ہے۔ اس لیے میں نے کتاب کا لفظی ورسمی ترجمہ نہیں کیا ہے، بلکہ کتاب کے مطالب و مفہوم کی ترجمانی و تلخیص اردو میں پیش کر دی ہے وہ لکھتے ہیں۔

''پروفیسر پی کے رے کی 'ٹکسٹ بک آف ڈیڈیکٹو لاجک' ایک مشہور درسی کتاب ہے جو ہندوستان کے اکثر کالجوں میں زیر درس رہتی ہے۔ اس کا ایک ترجمہ عرصہ ہوا پنجاب یونیورسٹی نے شایع کر دیا تھا۔ موجود کتاب بھی اسی کا ترجمہ ہے لیکن اس ترجمہ کو تالیف کہنا زیادہ قرین صحت ہوگا، اس لیے کہ۔

---

۱ آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص:۲۷۹

۲ ایضا: ص:۲۷۹

(۱) اس میں لفظی ترجمہ کی پابندی ایک مقام پر بھی نہیں کی گئی ہے بلکہ مصنف کے مطالب کو اردو میں ادا کر دیا گیا ہے۔

(۲) بہت سا حصہ جو مبتدیوں کے لیے غیر ضروری معلوم ہوا، حذف کر دیا گیا ہے۔

(۳) بعض مثالیں نئی اضافہ کر دی گئی ہیں۔

تاہم ناشکری ہوگی اگر مترجم اول کی محنت کا اعتراف نہ کیا جائے۔ ترجمہ ہذا کے وقت ترجمہ سابق پیش نظر تھا، اور اگر پیش نظر نہ ہوتا تو مترجم ثانی کی زحمتوں میں (خصوصاً مصطلحات کے متعلق) بہت کچھ اضافہ ہو جاتا۔''[۱]

مولانا ماجد کی ترجمہ و تلخیص کردہ مذہبی کتابوں میں 'مناجات مقبول' اور 'چہل حدیث' بہت مشہور ہیں۔

مناجات مقبول

مولانا اشرف علی تھانوی کی منتخب کردہ قرآن وحدیث سے ماخوذ و منقول دعاؤں کو سادہ سلیس زبان میں مولانا ماجد نے مفید حاشیوں کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔ اس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ مولانا اس کے دیباچے میں کتاب کی اہمیت وفضیلت کے متعلق لکھتے ہیں۔

''کتاب ماشاءاللہ مقبول بھی خوب ہوئی، گھر گھر پھیل گئی اور بار بار مختلف مطبعوں میں چھپی۔ میرے پیش نظر نسخہ مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی ثم پاکستانی کا شائع کیا ہوا ہے۔ لیکن ایک بڑی اور اہم ضرورت اس کے متن کی شرح کی تھی۔ بغیر عام فہم اور سلیس شرح وتحشیہ کے کتاب بیسویں صدی عیسوی کے ناظرین کے لیے بڑی حد تک بیکار سی تھی۔ بری بھلی خدمت اس سلسلہ میں اس نامہ سیاہ سے جو بن پڑی وہ اگلے صفحات میں حاضر ہے۔ ان تشریحی حاشیوں میں جو عبارتیں قوسین کے اندر ہیں وہ گویا نفس ترجمہ ہی کا تکملہ ہیں، انھیں ترجمہ سے ملحق ہی پڑھنا چاہیے۔ موجودہ ایڈیشن اپنے عربی متن کے لحاظ سے اسی دیوبندی نسخہ کی تقریباً نقل ہے، اردو ترجمہ اس خاکسار کا نظر ثانی کیا ہوا

---

[۱] بحوالہ مولانا عبدالماجد دریابادی احوال وآثار: ڈاکٹر تحسین فراقی: ص:۳۳۱

ہے اور صرف کہیں کہیں بالکل بدلا ہوا۔حق یہ ہے کہ مترجم اول حکیم صاحب مرحوم جس خوبی اور جس قابلیت سے ترجمہ کر گئے یہ انھیں کا حصہ تھا۔ترجمہ منظوم وغیرہ جو اس نسخہ میں شامل تھے اس میں حذف کر دیے گئے ہیں،البتہ جو مجموعہ ادبیات مثنوی معنوی کا اس میں بطور ضمیمہ شامل تھا وہ اس میں برقرار رکھا گیا ہے۔اور ایک چھوٹا سا چند سطری تتمہ ایک اور موجودہ مقبول بزرگ کی زبان سے منقول اس میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔شروع میں خیال تھا کہ ہر حدیثی دعا کی تخریج اصل کتب احادیث سے درج کر دی جائے۔اس کوشش میں پوری کامیابی تو نہ ہو پائی پھر بھی جس بڑی حد تک حوالے آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔ یہ کچھ تھوڑے سے تو کتاب کے اسی قدیم نسخہ کے حاشیے سے منقول ہیں۔اور زیادہ کے لیے یہ خاکسار مولانا ظہور احمد صاحب سابق مدرس دارالعلوم دیوبند کا شکرگزار ہے جنھوں نے مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی کے واسطے سے میری استدعا پر اس حد تک تخریج کی مشقت گوارا فرمائی اور اس طرح علاوہ شرح کے ایک یہ بھی جدید اور مفید اضافہ کتاب میں ہوگیا۔‘‘[1]

مولانا ماجد کا ترجمہ فصیح و بلیغ روزمرہ محاورہ اور سلاست روانی سادگی سے بھرپور ہے۔مولانا ماجد کی انشاپردازی زبان و بیان کی خوبیوں کا اعتراف اس کتاب کو پڑھ کر لگایا جاسکتا ہے’مناجات مقبول‘ میں تقریباً دوسو سے زائد قرآنی اور حدیثی دعائیں شامل ہیں۔مناجات مقبول میں حاشیہ طلب باتوں کی وضاحت مولانا ماجد نے حاشیہ میں لکھ کر کر دی ہے،اور مولانا نے قرآنی آیات اور احادیث کے اصل ماخذ کا بھی حوالہ نقل کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔جس کی وجہ سے اس کتاب کی تحقیقی اہمیت ہوگئی ہے۔

چہل حدیث

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے چالیس احادیث کا انتخاب ’چہل حدیث‘ کے نام سے مرتب کیا تھا۔جس کا ترجمہ وتشریح مولانا ماجد نے عام فہم سادہ سلیس زبان میں کیا ہے۔بعض مقامات پر ضروری حواشی بھی نقل کیے ہیں۔اس مختصر ترین انتخاب میں بھی مولانا کے زبان و بیان اور انداز تحریر کے نادر اسلوب کی

---

[1] دیباچہ مناجات مقبول:مترجم مولانا عبدالماجد دریابادی:ص:۴-۵

جھلک نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی مولانا ماجد کے تراجم و تلخیص کردہ کتابوں کی زبان و بیان کے متعلق لکھتے ہیں۔

''ان کے تراجم کے سلسلے میں اہم تر بات یہ ہے کہ انھوں نے اصل کی روح کو کامیابی سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا ہے اور اصل روح سے ہماری مراد صرف مفہوم، معانی اور مافیہ ہی نہیں بلکہ اسلوب بھی ہے۔ اصل اسالیب کی قوت اور تنوع کو برقرار رکھنا اور پھر 'ترجمہ پن' کا شائبہ تک نہ پیدا ہونے دینا کوئی چھوٹا کمال نہیں ہے۔''[۱]

عبدالماجد دریابادی بحیثیت مکتوب نگار

صنف مکتوب نگاری میں بھی مولانا ماجد کا ایک خاص مقام ہے۔ اس صنف کو ترقی دینے میں مولانا کے قلم برداشتہ مکتوبات کا اہم حصہ ہے۔ مولانا کے خطوط علمی، ادبی، سیاسی، سماجی، معاشرتی، تہذیبی اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں۔ مولانا کے مکتوبات کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صنف مکتوب نگاری کا اجمالی جائزہ لیا جائے۔

خط کو نصف ملاقات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ خطوط انسانی جذبات و احساسات کے ترجمان اور اظہار کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ خطوط اپنے لکھنے والے کی شخصیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ آپ بیتی کی طرح خطوط نگاری بھی دلچسپ اور معلوماتی صنف ہے۔ خطوط کسی کی سوانح مرتب کرنے میں بہت مددگار ہوتے ہیں۔ کیونکہ خطوط میں روزمرہ کے واقعات اور جزیات شامل ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے ادیبوں، شاعروں، کے نجی خطوط بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ خطوط کے ذریعہ خطوط نگار کی شخصیت کے بعض اہم اور گمنام پہلوؤں سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ جن کا تذکرہ سوانح عمریوں، تذکروں، تاریخی کتابوں میں نہیں ہو پاتا۔

اردو میں خطوط نگاری کی ابتدا فارسی کے زیر اثر ہوئی۔ شروعاتی دور میں جو خطوط لکھے گئے، ان میں مقفیٰ مسجع عبارت استعمال کی جاتی تھی۔ اردو میں سادہ سلیس، عام فہم زبان میں خطوط نگاری کی ابتدا اردو کے عبقری شاعر مرزا غالبؔ سے ہوئی۔ غالبؔ نے اس زمانے میں اردو نویسی کی طرف توجہ کی جب فارسی کا غلبہ تھا، بااثر اور صاحب اقتدار طبقہ فارسی میں خطوط لکھنا اپنے لیے باعث فخر جانتا تھا۔ فارسی کے اس ماحول میں

۱۔ مولانا عبدالماجد دریابادی احوال و آثار: ڈاکٹر تحسین فراقی: ص: ۳۶۴

غالب نے اپنی جدت طبع کی وجہ سے اپنی منفرد راہ نکالی، اور اردو خطوط نگاری کی داغ بیل ڈالی۔ خطوط انسانی جذبات کے اظہار کا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اس کے لکھنے والے کی شخصیت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ تکلفات، آر، جھجک وغیرہ کا عمل دخل خطوط میں نہیں ہوتا، جب کہ بالمشافہ گفتگو میں ان باتوں کا امکان رہتا ہے۔

خطوط کے موضوعات کا کوئی تعین نہیں ہوتا، ہر موضوع اور مختلف قسم کے خطوط لکھے جا سکتے ہیں۔ خطوط جہاں انسانی جذبات کے عکاس ہوتے ہیں، وہیں اپنے معاصر معاشرتی، تہذیبی، سیاسی احوال وکوائف سے بھی روشناش کراتے ہیں۔ خطوط سبھی لکھتے ہیں، مگر وہی خطوط ادب کے دائرے میں آتے ہیں جن میں سادہ سلیس زبان، ادبی شان، بے تکلفی، حقیقت پسندی اور رعایت لفظی کا استعمال فن کارانہ انداز میں کیا گیا ہو۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اردو میں بعض ادیبوں اور شاعروں کے خطوط ادبی دنیا میں خوشگوار اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً غالب، واجد علی شاہ، شبلی نعمانی، ابوالکلام آزاد، اکبر الہ آبادی، سید سلیمان ندوی، مہدی افادی، رشید احمد صدیقی، سجاد ظہیر، صفیہ اختر، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، محمد علی جوہر اور مولانا عبدالماجد دریابادی وغیرہم۔

مولانا ماجد کا حلقہ احباب خاصا وسیع تھا۔ اس میں عالم، فاضل صحافی، دانشور، ادیب وشاعر وغیرہ کے ساتھ ساتھ عام آدمی بھی شامل تھے۔ خط وکتابت سے مولانا کو خاص دلچسپی تھی وہ اپنے دوست واحباب کے خطوط کا جواب پابندی سے دیتے تھے۔ مولانا کے نظام الاوقات میں خطوط کا پڑھنا لکھنا بھی شامل تھا۔ مولانا کے بعض خطوط ادبی اعتبار سے بڑے دلآویز اور دلکش ہیں۔ ان کے یہ خطوط نجی اور کاروباری دونوں قسم کے ہیں۔ مولانا ایک سماجی مصلح قوم وملت کے خیر خواہ تھے اسی لیے ان کی تمام تحریروں کی طرح ان کے مکتوبات میں بھی اصلاح معاشرہ اور قوم وملت کی تعمیر وترقی کے خواہش کا اظہار ہوا ہے۔ مولانا کا تعلق صحافت سے تقریباً نصف صدی تک رہا اسی وجہ سے تمام ملکی وعالمی حالات اور علمی وادبی منظر ناموں، رسائل واخبارات اور نئی کتابوں وغیرہ پر ان کی گہری نظر ہوتی تھی اگر کوئی نئی کتاب یا مضمون مولانا کو پسند یا ناپسند ہوتے تھے تو مولانا مضمون نگار یا مصنف کی کھلے دل سے تعریف وتوصیف کرتے تھے، اور اگر ان میں کوئی خامی ہوتی تو وہ خطوط کے ذریعہ ان خامیوں کی وضاحت کر دیتے تھے۔ فرنگی تہذیب وتمدن کو وہ ناپسند کرتے تھے، مغربی تہذیب کے رہن سہن، رسم

ورواج کو مسلمانوں میں عام ہونے سے مولانا فکرمند رہتے تھے۔اسی لیے ان کے بعض خطوط میں مشرقی تہذیب، روایت واقدار کی بحالی اور بازیافت کی کوشش نظر آتی ہے۔اردو نثر نگاروں میں مولانا مرحوم نے شاید سب سے زیادہ خط لکھے ہیں۔وہ مجلسی آدمی نہ تھے اور جلسوں،جلوس اور پبلک اجتماعات میں شرکت سے پرہیز کرتے تھے۔اس کی کمی وہ دریاباد کے گوشہ نشینی میں بیٹھ کر خطوں کے ذریعہ پورا کرتے تھے اور اس معاملہ میں وہ غالبؔ کو اپنا استاد مانتے تھے۔مولانا ماجد کے خطوط کو'مکتوبات ماجدی' کے نام سے ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ نے شایع کیا اب تک اس کی چھ جلدیں آچکی ہیں،اور ایک ایڈیشن پاکستان سے'رقعاتِ ماجدی' کے نام سے بھی شایع ہوا۔مولانا کے خطوط کی ادبی وفنی عظمت کا اندازہ لگانے کے لیے ان کا اجمالی ذکر کیا جارہا ہے۔

مکتوبات ماجدی جلد اول

مولانا کا شمار ان خطوط نگاروں میں کیا جانا چاہیے جنھوں نے خطوط سے قومی وملی اصلاح وتعمیر کا کام لیا ہے۔اگرچہ مولانا نجی خطوط کو چھپوانے یا عام کرنے کے حق میں نہ تھے،پھر بھی انھوں نے بذات خود اپنے مشاہیر شبلی نعمانی،اکبرالہ آبادی،محمد علی جوہر،سید سلیمان ندوی وغیرہ کے اپنے نام لکھے گئے خطوط کو خود شایع کرایا اور اپنے لکھے ہوئے خطوط کو ۱۹۵۳ء سے تادم وفات تک نقل کرا کے محفوظ رکھنا شروع کردیا تھا۔ مولانا کے خطوط کی تعداد'مکتومات ماجدی' کے مرتب ڈاکٹر ہاشم قدوائی کے مطابق گیارہ ہزار سے بھی زیادہ ہیں۔ڈاکٹر ہاشم قدوائی'مکتوبات ماجدی' جلد اول کے'پیش لفظ' میں مولانا کے خطوط کی تعداد اور اس کی علمی وادبی اہمیت کا اعتراف اس طرح کیا ہے۔

> ''عم مرحوم جناب مولانا عبدالماجد دریابادی کے تعلقات بہت وسیع تھے اس لیے مراسلت کا دائرہ بہت وسیع تھا وہ خطوط کے جواب بڑی پابندی اور مستعدی سے دیا کرتے تھے۔۱۹۵۳ء سے انھوں نے خاص خاص خطوط کی نقل رکھنے کا انتظام کیا۔یہ خدمت زیادہ تر مولانا کی منجھلی صاحبزادی یعنی راقم مرتب کے منجھلے بھائی حبیب احمد قدوائی کی بیگم نے انجام دی جوان کی سب سے زیادہ مزاج شناس تھیں اور جن کا زیادہ تر قیام دریاباد ہی میں رہتا تھا دوسری صاحبزادیوں اور نواسیوں نے بھی یہ خدمت انجام دی۔تقریباً گیارہ ہزار سے زیادہ خطوں کے نقلیں

ان کاپیوں میں ملیں ۔ زیرنظر مجموعہ حضرت مرحوم کے ادبی خطوط اور تعزیت ناموں پر مشتمل ہے۔ ان میں مولانا کا منفرد طرز نگارش اور انشاپردازی کا رنگ وآہنگ نیز رعایت لفظی کا اہتمام ان خطوط میں پوری طرح جلوہ گر ہے۔ برصغیر ہند کے مشاہیر ادب اور اکابر سے مولانا کے گہرے روابط تھے اور ان سے مراسلت کا سلسلہ قائم تھا۔ ان خطوط کا مطالعہ اس لحاظ سے دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ ان سے اگر ایک طرف مولانا اور مشاہیر ادب کے درمیان جو بے تکلف روابط اور تعلقات تھے ان پر روشنی پڑتی ہے تو دوسری طرف ان کی ادبی اہمیت ثابت ہوتی ہے ۔ یہ مرحوم کے خطوط کی جلد اول ہے۔ جو دو حصوں میں منقسم ہے پہلے میں ادبی خطوط ہیں اور دوسرا حصہ تعزیت ناموں پر مشتمل ہے جو اپنی اثر انگیزی کے لحاظ سے بے مثال ہیں ۔''[1]

'مکتوبات ماجدی' جلد اول کا دیباچہ حکیم عبدالقوی دریابادی صاحب سے نے لکھا ہے، اور خطوط کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ایک کا عنوان دلآویز ادبی مکتوبات' اور دوسرے کا 'دلدوز تعزیتی مکتوبات' رکھا ہے۔ اس کے متعلق حکیم صاحب لکھتے ہیں۔

''..... پہلا حصہ ادبی نوعیت کے خطوط پر مشتمل ہے جن کا نام احقر نے 'دلآویز ادبی مکتوبات' رکھا ہے۔ ان میں ادبی لطافتوں (بعض خطوط تو رعایت لفظی کی صنعت کے شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں) لسانی بحثوں کے ساتھ ساتھ بہت سی مفید معلومات مولانا کے معاصرین سے متعلق ناظرین کے سامنے آجائیں گے۔ دوسرا حصہ تعزیتی خطوط پر مشتمل ہے ۔ جس کا نام 'دلدوز تعزیتی مکتوبات' رکھا گیا ہے۔ قدرۃً بڑا ہی موثر اور دردانگیز ہے۔ اس میں ہر قسم کے تعزیتی خطوط ملیں گے۔ مثلاً ماں یا باپ کے سایہ سے محروم ہونے پر اولاد کے نام ،لڑکے یا لڑکی کے دنیا سے اٹھ جانے پر غمزدہ باپ اور دل شکستہ ماں کے نام۔ بیوی کے غم میں مبتلا عورت اور رفیقہ حیات کی وفات پر محزون قلب مرد کے نام ۔ عزیز بھائی کی جدائی پر اس کے بھائی کے نام وغیرہ وغیرہ۔ ان خطوط تعزیت میں اظہار غم و ہمدردی کے ساتھ

---

[1] پیش لفظ مکتوبات ماجدی جلد اول: مرتب ڈاکٹر ہاشم قدوائی :ص:۴

ساتھ تسکین و تسلی کے وہ پہلو خاص طور سے نمایاں کیے گئے ہیں جو مذہب اسلام کے ساتھ مخصوص ہیں اور اس سلسلہ میں متعلقہ آیات قرآن اور احادیث کی ترجمانی کی گئی ہے۔ جن سے یہ ظاہر ہو کر رہتا ہے کہ موت اور سفر آخرت کی منزلیں ایک مسلمان کے حق میں کیسی کیسی نعمتوں اور بشارتوں کی حامل ہوتی ہیں۔''[۱]

مولانا کے مکاتیب کے مطالعہ سے ان کی شخصیت کے بہت سے پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ مولانا کے خطوط کے موضوعات بہت متنوع اور وسیع ہیں، ان میں سیاسی، سماجی، معاشرتی، ادبی، تنقیدی نوعیت کے ساتھ ساتھ لغاتی مباحث، لفظی تحقیقات، صرف و نحو کی باریک بینی، لفظوں کے صحیح استعمال وغیرہ کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ مولانا کے خطوط سادگی، بے تکلفی، رعایت لفظی، ضلع جگت کے استعمال کی وجہ سے منفرد اور دلکش و پر اثر ہو گئے ہیں۔ دلآویزی ادبی مکتوبات سے خطوط کے بعض حصے نقل کیے جا رہے ہیں تا کہ مولانا کے مکتوبات کی ادبی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جا سکے۔

''خط بنام سید آل عبا صاحب مارہروی آوارہ

'آوارگی' کے پردے میں یہ 'ردائے آل عبا' خوب نکلی۔ سبحان اللہ۔ ہماری کم نگاہی تم کہاں تھے ہم کہاں سمجھے۔ دل نے کہا 'فرقہ ملامتیہ' ابھی زندہ ہے۔ کل اٹھارہ جولائی کی شب میں وقت نکال کر ضرور آپ کی پیش کردہ 'بی بھٹیاری' سے دل بہلاؤں گا اور جی میں آئی تو پھر آپ کے اسٹیشن ڈائرکٹر کو اپنے تاثرات بھی بھیجوں گا۔''[۲]

''خط بنام محمد بن عمر صاحب حیدر آباد

جو 'زور' مجسم ہے اس کی مدح و توصیف میں مجھ جیسا 'کم زور' قلم اٹھا ہی کیا سکتا ہے ادارہ ادبیات اردو کے تو خیر وہ بانی ہیں۔ باقی حیدر آباد دکن سے کون ایسی ادبی تحریک ادھر ۲۵/۳۰ سال میں اٹھی جس کے وہ روح رواں نہ تھے۔ کوئی لکھنے کو قلم اٹھائے تو کیا لکھے اور کہاں تک لکھتا جائے۔ ان کے کمالات کو سمجھ لینا اور ان کی داد پر آمادہ ہو جانا یہ خود ہی ایک کمال ہے، آفتاب

---

۱ دیباچہ مکتوبات ماجدی جلد اول: مرتب ڈاکٹر ہاشم قدوائی: ص:۶۔۷

۲ مکتوبات ماجدی جلد اول: مرتب ڈاکٹر ہاشم قدوائی: ص:۹

کو روشن دیکھنا خود اپنی صحت بصارت کا اعلان کرنا ہے'' [۱]

'' مکتوب بنام جعفر علی خاں صاحب آثر لکھنوی

'علی گڑھ میگزین' کا 'مجاز نمبر' ابھی نظر سے گزرا۔ عالم 'مجاز' میں 'حقیقت'
ایک ہی نظر آئی اور وہ ہے آپ کا مضمون 'لکھنو کی زبان یا سرمایہ زبان اردو پر تنقید'۔
ماشاللہ وسبحان اللہ۔ مدت کے بعد زباں پر ایسا محققانہ مضمون نگاہ کے سامنے آیا۔
بے اختیار آپ کو لکھنے کا دل چاہا۔ اللہ آپ کی عمر وصحت میں برکت دے۔'' [۲]

'' مکتوب بنام حبیب احمد صدیقی صاحب

'حیرانگی' کا لفظ مجھے تو نہ کسی اردو لغت میں ملا نہ کسی اور ادیب کی تحریر
میں، ہاں بعض عوام کو بولتے سنا ہے۔ مولانا آزاد نے اگر استعمال کیا تو بے
خیالی میں ہی کر گئے ہوں گے بڑے سے بڑے ادیب سے بھی التفاتی اور بے
توجہی ہو ہی جاتی ہے۔'' [۳]

'' مکتوب بنام عبدالصمد صاحب تحصیل سہوان ضلع بدایوں

محاورہ واقعی سر پر احسان کرنے کا ہے۔ دل پر احسان خلاف محاورہ
ہے۔ البتہ میں اسے غلط نہ قرار دوں گا صرف غیر فصیح کہوں گا۔'' [۴]

منقولہ خطوط کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کس قدر حق پرست، علم دوست، احباب واقارب کے قدر دان تھے، اور ان کا تحقیقی و علمی شعور کتنا بالیدہ تھا۔ وہ ہمہ وقت ایک طالب علم کی طرح حصول علم میں مصروف رہتے تھے۔ مولانا کے یہ خطوط ادبی اہمیت کے ساتھ ساتھ تاریخی اور سوانحی اعتبار سے بھی بڑے گراں قدر ہیں۔

مولانا کے تعزیتی خطوط بھی پر تاثیر، سوز وساز، درد و کسک کی لے میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان میں نوحہ گری اور ماتم کے ساتھ ساتھ وارثین کے لیے صبر وجمیل اور مرحومین کے لیے دعائے مغفرت موجود ہیں۔ مولانا قرآن واحادیث، تاریخی واقعات وحقائق کی روشنی میں مرحوم کے وارثین اور پس ماندگان کی تسلی، دل

---

[۱] مکتوبات ماجدی جلد اول: مرتب ڈاکٹر ہاشم قدوائی: ۱۰

[۲] ایضاً: ص: ۱۶۔۱۷ : [۳] ایضاً: ص: ۱۴۶ : [۴] ایضاً: ص: ۱۴۹

جوئی اور صبر و جمیل کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں۔ دلدوز تعزیتی مکتوب سے بعض حصے ملاحظہ ہوں۔

''پروفیسر سید مسعود حسن رضوی صاحب کے نام

ابھی ابھی سانحہ کی خبر پڑھی۔ **انا للله وانا الیه راجعون**

رفیقہ حیات کی جدائی اور وہ بھی آناً فاناً جس درجہ کا صدمہ بشر کے لیے ہے وہ میری بھی تازہ آپ بیتی ہے اس لیے ہمدردی اور تعزیت آپ کے ساتھ رسمی نہیں بلکہ سوفی صدی دلی رکھتا ہوں۔ اللہ ہی آپ کو صبر عطا کرے۔''[1]

''جمیل مہدی صاحب ایڈیٹر 'عزائم' لکھنو

'بیباک' میں آپ کے عزیز بھائی کی خبر وفات پڑھی اور دعائے مغفرت کردی **الھم اغفر لہ وارحمھا**۔ بھائی کا رشتہ دنیا کے اہم ترین رشتوں میں ہے شرعاً، عرفاً ہر طرح سے۔ اللہ صبر جمیل کی توفیق دے''[2]

''خالد عثمان صاحب، عثمان پورہ حیدر آباد

اللہ آپ کے والد مرحوم کی مغفرت کاملہ فرمائے۔ مرحوم سے ملاقات مجھے یاد ہے گو اب سالہا سال سے نہیں ہوئی تھی۔ اللہ آپ کو توفیق صبر دے۔ جدائی دائمی نہیں صرف عارضی ہوتی ہے۔ ہم سب ہی اس منزل کے مسافر ہیں کوئی پہلے پہنچا کوئی بعد میں۔''[3]

''رانی محمود آباد، محمود آباد ہاؤس لکھنو کے نام

عورت کی زندگی میں بیوگی سے بڑھ کر سخت وقت اور کون آسکتا ہے اور اس کے لیے آپ سے دلی ہمدردی ہے۔ اللہ آپ کو اس امتحان میں ثابت قدم رکھے۔ مرحوم راجہ قابل رشک تھے کہ آخری وقت ماہ رمضان کے وسط میں نصیب ہوا اور دوسرے پھر وطن سے ہزار ہا میل دور پردیس میں۔ دہرے دہرے اجر کے پورے مستحق ہو گئے۔ اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔''[4]

---

[1] مکتوبات ماجدی جلد اول: مرتب ڈاکٹر ہاشم قدوائی: ص: ۳۵۵

[2] ایضا: ص: ۳۹۸ : [3] ایضا: ص: ۴۰۲ : [4] ایضا : ص: ۴۰۸-۴۰۹

مکتوبات ماجدی جلد دوم

'مکتوبات ماجدی' جلد دوم میں ۳۸۸ خطوط شامل ہیں۔ یہ خطوط زیادہ تر خانگی اور ادبی نوعیت کے ہیں۔ جلد دوم میں بھی حکیم عبدالقوی دریابادی صاحب کا 'پیش لفظ' اور اس کے مرتب ڈاکٹر ہاشم قدوائی صاحب کا 'دیباچہ' شامل ہے۔ مولانا کے ان خطوط میں بھی ادبی شان جابجا نظر آتی ہے۔ جلد دوم میں شامل خطوط کے متعلق ڈاکٹر ہاشم قدوائی لکھتے ہیں۔

''حضرت عم مرحوم مولانا عبدالماجد دریابادی کے مکتوبات کی دوسری جلد پیش خدمت ہے اس جلد میں خطوط کی تعداد ۳۸۸ ہے اور مکتوب الیہ حضرات کی تعداد تیرہ ہے۔''[۱]

مولانا ماجد کے خطوط کی ادبی وفنی اہمیت کا اندازہ ان کے خطوط کو پڑھ کر لگایا جا سکتا ہے۔ 'مکتوبات ماجدی' جلد دوم سے دو خطوط نقل کیے جا رہے ہیں۔

''بنام محمد احمد غریب صاحب تاجر کٹلری بازار بمبئی

ایسے صاحب فہم مخلص کی طرف سے بھی ایسی سخت فرمائش سن کر جی چاہا کہ سر پیٹ لوں۔ جس غریب کو ہر روز ۳۰/۲۵ اخبار دیکھنے پڑتے ہوں اور دو ایک رسالے بھی اور ہر مہینے صرف ریویو ہی کے غرض سے ۲۰/۱۵ کتابیں پڑھنی پڑتی ہوں اور روزانہ خط وکتابت کا سارا کام بغیر اسسٹنٹ کے اپنے ہاتھ سے کرنا پڑتا ہو اور خدا معلوم کتنے پیام اور دیباچے اور پیش لفظ ہر ہفتے لکھنے پڑتے ہوں اور دوسروں کے مسودات پر نظر ثانی اور انھیں بعض مشورے دیتے رہنے ہوتے ہوں اور ہفتہ وار کی ایڈیٹری اور مستقل شغل تصنیف وتالیف ان سب کے علاوہ! اور پھر یہ سارا کام بعد فجر سے قبل غروب آفتاب ختم کر دینا ہوتا ہو اس لیے کہ بعد غروب آنکھ پر زور پڑنے کے باعث لکھنا پڑھنا سالہا سال سے ترک ہے۔ ایسے شخص سے جو ساتھ ہی خانہ داری اور گھر بار کے سارے قضیے اور جھگڑے بھی رکھتا ہو اس سے یہ فرمائش کرنا خصوصاً اس سے اتنے لمبے سفر کی توقع رکھنا ظلم ہے یا نہیں۔''[۲]

۱۔ مکتوبات ماجدی جلد دوم: مرتب ڈاکٹر ہاشم قدوائی: ص:۵

۲۔ ایضاً: ص:۱۲

مولانا کے روزمرہ کے مشاغل کا اندازہ مذکورہ خط کو پڑھ کر لگایا جاسکتا ہے۔

''مکتوب بنام مولانا عبدالباری صاحب ندوی لکھنو

.....میں تو مسلمانوں کی طرف سے بالکل ہی مایوس ہو چکا ہوں۔فرنگی تہذیب سے کامل مقاطعہ ممکن نہیں (کم سے کم ہم پست ہمتوں کے لیے) اور اگر اشتراک رکھیے تو کس حد تک۔عملاً کوئی بھی حد قائم نہیں رہنے پاتی۔سوفی صدی اس میں ضم ہو جانا پڑتا ہے ہر ملک اور ہر زمانے کا تجربہ یہی ہے۔''[۱]

مولانا کا منقولہ خط ان کی قومی وابستگی اور ملی اصلاح کی خواہش کا ثبوت پیش کرتا ہے۔

مکتوبات ماجدی جلد سوم

'مکتوبات ماجدی' جلد سوم کی اشاعت ۲۰۰۱ء میں ہوئی اس میں کل ۳۹۹ خطوط شامل ہیں ،اور مکتوب الیہم کی تعداد ۸ ہے ۔اس جلد میں ان حضرات کے خطوط شامل ہیں جن سے مولانا کا خاص تعلق اور قلبی رشتہ تھا۔اس میں ڈاکٹر ہاشم قدوائی صاحب کا مختصر دیباچہ اور 'عرض ناشر' کے نام سے محمد منظور علی صاحب کی لکھی ہوئی مختصر تحریر بھی شامل ہے۔محمد منظور صاحب اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

''مکتوبات کی یہ تیسری جلد پہلی دو جلدوں کے مقابلہ میں بڑی اہمیت وافادیت کی حامل ہے۔ادارہ کے لیے یہ پیشکش باعث صد افتخار وانبساط ہے۔مکتوبات کی تعداد ۳۹۹ ہے اور یہ ۳۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔امید ہے حضرت مولانا دریابادی کی انشاء وتحریر کے عاشق اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔''[۲]

مکتوبات ماجدی جلد چہارم

'مکتوبات ماجدی' جلد چہارم کی اشاعت ۲۰۰۷ء میں ہوئی اس میں خطوط کی تعداد ۳۹۷ ہے اور مکتوب الیہم کی تعداد ۳۳ ہے۔چوتھی جلد کی ترتیب وتدوین کے دوران اس کے مرتب ڈاکٹر ہاشم قدوائی صاحب کی اہلیہ اور مولانا ماجد مرحوم کی تیسری صاحبزادی انتقال فرما گئیں۔ڈاکٹر ہاشم قدوائی نے 'پیش لفظ' میں اپنی شریک حیات کے داغ مفارقت دے جانے کا تذکرہ جذباتی انداز میں کیا ہے۔

''عم مرحوم ومغفور مولانا عبدالماجد دریابادی علیہ رحمتہ کے مکتوبات کی

۱۔ مکتوبات ماجدی جلد دوم: مرتب ڈاکٹر ہاشم قدوائی:ص:۱۹۱

۲۔ مکتوبات ماجدی جلد سوم: مرتب ڈاکٹر ہاشم قدوائی:ص:۶

چوتھی جلد پیش خدمت ہے۔ اسی دوران راقم مرتب کی شریک حیات جو عم مرحوم
کی تیسری صاحبزادی تھیں اور ان کو بہت زیادہ محبوب تھیں اور جنھوں نے
مرحوم کے متعدد خطوں کی نقل کرنے کی سعادت اپنے دریاباد کے قیام کے
دوران حاصل کی تھی ۱۲ جنوری ۲۰۰۵ء کو ارحم الراحمین کے جوار رحمت میں پہنچ
گئیں۔ ۵۸ سالہ کی رفاقت ختم ہوگئی اور مرتب کی زندگی میں زبردست خلا پیدا
ہوگیا، ناظرین کرام مرحومہ کی مغفرت کی دعا کریں اور ساتھ ہی اس کی اللہ
مرتب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔''[۱]

مکتوبات ماجدی جلد پنجم

'مکتوبات ماجدی' جلد پنجم کی اشاعت ۲۰۰۸ء میں ہوئی اس میں خطوط کی تعداد ۵۰۰ سے بھی زیادہ ہیں اور مکتوب الیہم کی تعداد ۴۹ ہے۔ اس جلد کے مکتوب الیہم میں ہر شعبے کے نامور مشاہیر علم وفن شامل ہیں۔ مثلا ابوالکلام آزاد، مولانا منظور نعمانی، مولانا امین احسن اصلاحی، جوش ملیح آبادی، پنڈت آنند نرائن ملا، رام بابو سکسینہ وغیرہ کے نام لکھے ہوئے خطوط شامل ہیں۔ اس جلد میں مرتب کا 'پیش لفظ' اور محمد منظور علی مرحوم کی مختصر تحریر 'عرض ناشر' کے عنوان سے شامل ہے۔ مرتب ڈاکٹر ہاشم قدوائی صاحب نے جلد پنجم میں شامل مکاتیب کی اہمیت اور خصوصیات کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

> ''بعض خصوصیتوں کی وجہ سے یہ جلد امتیازی پوزیشن رکھتی ہے۔ مثلا پچھلی جلدوں کے مقابلے میں اس جلد میں مکتوب الیہم کی تعداد دوسری جلدوں کے مقابلے میں زیادہ ہے یعنی ۴۹ ہے اسی طرح خطوط کی تعداد بھی پانچ سو سے متجاوز ہے جو دوسری جلدوں سے زیادہ ہے۔''[۲]

مکتوبات ماجدی جلد ششم

جلد پنجم کی اشاعت کے بعد مولانا ماجد کے معتقد ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ کے بانی محمد منظور علی لکھنوی صاحب کا انتقال ہوگیا تھا۔ جس کی وجہ سے جلد ششم کی اشاعت کافی دیر سے ہوئی منظور صاحب کے وارثین نے اس کی اشاعت کا اہتمام ۲۰۱۱ء میں کیا۔ اس جلد میں مکتوبات کی کل تعداد ۵۷۷ ہے اور مکتوب

---

[۱] مکتوبات ماجدی جلد چہارم: مرتب ڈاکٹر ہاشم قدوائی: ص: ۵

[۲] مکتوبات ماجدی جلد پنجم: مرتب ڈاکٹر ہاشم قدوائی: ص: ۷

الیہم کی تعداد ۸۷ ہے۔اس میں بھی ہر شعبے کے اہم شخصیات شامل ہیں۔مثلاً مولانا قاری محمد طیب صاحب، مولانا منت اللہ رحمانی،مولانا انظر شاہ کشمیری،مفتی محمد رضا فرنگی محلی،سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین، نواب احمد سعید خاں چھتاری،نواب جعفر علی خاں اثر،رشید احمد صدیقی،مولانا امتیاز علی خاں عرشی،مالک رام،مشفق خواجہ،مولانا ابوالاعلی مودودی وغیرہ۔چھٹی جلد میں پسران الحاج محمد منظور علی لکھنوی مرحوم کی لکھی ہوئی مختصر تحریر 'عرض ناشر' کے عنوان سے شامل ہے۔چھٹی جلد کے 'پیش لفظ' میں ڈاکٹر ہاشم قدوائی محمد منظور صاحب کے انتقال اور شامل مکتوبات کے متعلق لکھتے ہیں۔

> ''عم مرحوم ومغفور مولانا عبدالماجد دریابادی کے مکتوبات کی چھٹی جلد پیش خدمت ہے لیکن قبل اس کے پانچویں جلد شایع ہوکر منظر عام پر آئی اس کے ناشر اور ادارہ انشائے ماجدی کے بانی اور سربراہ عالی جناب الحاج منظور علی صاحب لکھنوی جو مولانا کے ارادت مند اور مخلص خصوصی تھے اور جنھوں نے مکتوبات کی چار جلدیں مولانا کے دیگر تصانیف کی طرح معیاری طباعت کے ساتھ شایع کی تھیں ارحم الراحمین کے جوار رحمت میں پہنچ گئے۔**انا للہ وانا الیہ راجعون** مرحوم نے مبارک ومقدس رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں ۲۷ رمضان کے متبرک ومقدس ترین تاریخ جو اللہ تعالی کے صالح ترین بندوں کے حصے میں آتی ہے، داعی اجل کو لبیک کہا۔یہ زبردست سانحہ نہ صرف حاجی صاحب علیہ رحمتہ کے جملہ متعلقین بلکہ حضرت مولانا دریابادی کے بے شمار عقیدت مندوں کے لیے حد درجہ اندوہ ناک ہے۔پروردگار حاجی صاحب کی بال بال مغفرت فرمائے اور انھیں اعلی سے اعلی مراتب عطا فرمائے۔اس جلد کے مکتوب الیہم کی تعداد ۸۷ ہے اور مکتوبات کی کل تعداد ۵۷۷ ہے مکتوب الیہم میں ہر شعبہ کے نابغہ روزگار ہستیاں شامل ہیں۔''[1]

رقعات ماجدی

پاکستان سے مولانا ماجد کے مکاتیب کا ایک مجموعہ 'رقعات ماجدی' کے نام سے بھی شایع ہوا ہے۔

---

[1] مکتوبات ماجدی جلد ششم: مرتب ڈاکٹر ہاشم قدوائی: ص:۹

مولانا کے معتقد اور مخلص دوست غلام محمد صاحب نے کراچی پاکستان سے اس کی اشاعت کرائی ہے۔اس مجموعہ کے تمام خطوط غلام محمد صاحب کے نام لکھے گئے ہیں۔رقعات ماجدی میں شامل بیشتر خطوط مکتوب الیہ اور مکتوب نگار کے باہمی رشتے اور تعلقات پر مبنی ہیں۔خطوط سے پہلے اس میں دو تحریریں بھی شامل ہیں۔غلام محمد 'عرض نیاز' کے عنوان سے 'رقعات ماجدی' کے متعلق لکھتے ہیں۔

''رقعات ماجدی' سے بیشتر ناظرین کی نگاہ میں دو تحریریں آئیں گی ایک میری اور دوسرے میرے ممدوح ومخدوم کی، پہلی کا عنوان ہے 'مولانا عبدالماجد دریابادی ذاتی تاثر' اور دوسری کی سرخی ہے 'میرا اعتبار ان کی نگاہ میں' جو میرا مضمون ہے وہ ماہنامہ فروغ اردو (لکھنو) کے ماجد نمبر بابت اکتوبر ۱۹۷۱ء میں چھپا تھا اور خود مولانا دریابادی نے اس کو پسند فرمایا تھا، اور جو ماجدی شہ پارے ہیں وہ ایک کے سوا، سب صدق ہی کے مختلف شماروں سے نقل ہیں، حوالے اپنے اپنے موقعوں پر سب کے ملیں گے، ان دونوں تحریروں کو پڑھ کر ناظرین کو 'من واو' کے باہمی ربط اور ربط کی نوعیت کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں رہے گی۔''[۱]

مولانا ماجد دریابادی کے خطوط کی اہمیت وافادیت کا اعتراف عبدالعلیم قدوائی صاحب نے اس طرح کیا ہے۔

''یہ خطوط علمی وادبی شان، سادگی اور بے تکلفی، طنز، حقیقت پسندی ورعایت لفظی کے لحاظ سے اردو کے ادب العالیہ میں جگہ دیے جانے کے مستحق ہیں۔ان خطوط میں تفسیری نکات، لغت والفاظ کی تحقیق، انواع واقسام کی کتب ومخطوطات اور مختلف قسم کے افراد کا تذکرہ بڑے شگفتہ اور دلچسپ انداز میں ملتا ہے۔اسی کے ساتھ ہی ان سے لکھنے والے کے مزاج، کردار اور میلانات کا بھی پتہ چلتا ہے اور اس زمانے کے مذہبی، سیاسی اور معاشرتی حالات کا بھی۔یہ خطوط انھوں نے اپنے دوستوں، علماء صحافیوں، طالب علموں، استادوں، شاعروں، دانشوروں اور بہت سے غیر معروف اور گمنام افراد کو بھی لکھے۔ان کے مطالعے

---

[۱] رقعات ماجدی: مرتب مولانا غلام محمد: ص: ج، د

سے مولانا کے سوانحی نقوش، ان کے حقیقت پسندانہ و مجتہدانہ اندازِ فکر، مسلم ممالک خصوصاً پاکستان کے سیاسی وتہذیبی انتشار، ہندوستان میں اردو اور اقلیتوں کے ساتھ ناانصافی، مستشرقین کے علمی کارناموں کی تنقید، ہندو مسلم اتحاد، صحیح زبان اور روزمرہ کے متعلق دلچسپ اور بصیرت افروز معلومات حاصل ہوتی ہیں۔''[1]

[1] مولانا عبدالماجد دریابادی حیات وخدمات: عبدالعلیم قدوائی: ص: ۱۲۷

باب ہفتم

عبدالماجد دریابادی کا اسلوب نگارش

مولانا دریابادی ایک منفرد و ممتاز صاحب طرز ادیب اور صاحب اسلوب نثر نگار تھے۔ انھوں نے ایک ایسے اسلوب نگارش کی بنیاد رکھی جس کے وہ خود ہی بانی و خاتم ہیں۔ مولانا کی خوبی یہ ہے کہ وہ بیک وقت ایک مفسر قرآن، عالم دین، صحافی، محقق، نقاد، شاعر، ڈرامہ نگار، سوانح نگار، نفسیات داں، مترجم، مکتوب نگار تھے۔ مولانا نے مختلف موضوعات پر تقریباً ۵۰ سے زائد کتابیں لکھی ہیں۔ مولانا اسلوب کی لطافتوں، نزاکتوں اور باریکیوں سے بخوبی واقف تھے۔ موضوع کی مناسبت سے طرز تحریر کا انتخاب کرتے تھے۔ موضوع کتنا ہی پیچیدہ کیوں نہ ہو پھر بھی وہ طرز بیان کی دلآویزی کو برقرار رکھتے ہیں۔ مولانا کے اسلوب نگارش کا جائزہ لینے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلوب نگارش سے متعلق بنیادی باتوں کا اجمالی جائزہ پیش کر دیا جائے۔ تاکہ مولانا کے اسلوب نگارش کی اہمیت وافادیت کا اندازہ لگایا جا سکے۔

'اسلوب' عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی طرز، طریقہ، روش وغیرہ کے ہیں۔ ہر شخص کا اپنا ایک منفرد انداز ہوتا ہے، اور تحریر کا انداز اسلوب کہلاتا ہے۔ یہ اسلوب صاحب اسلوب کی شخصیت کا اشاریہ ہوتا ہے، اسی لیے اسلوب بیان کو شخصیت کی علامت کہا جاتا ہے۔ مصنف اپنے خیالات وجذبات کو قاری تک پہنچانے میں اسلوب نگارش کا سہارا لیتا ہے۔ اپنے افکار، جذبات، احساسات کی کامیاب ترسیل کے لیے ایک فن کار دلکش انداز اور نادر و پرکشش طرز تحریر کا سہارا لیتا ہے یہی اسلوب نگارش کی کامیابی ہے۔ ابلاغ و ترسیل اسلوب کا بنیادی وصف ہے۔ اپنے جذبات ونظریات کے اظہار و ترسیل کے لیے مصنف مشکل، سادہ، سہل، تشبیہات واستعارات، تلمیحات ومحاورات وغیرہ کا سہارا لے کر اپنے اسلوب نگارش کو موثر بناتا ہے۔ ابلاغ خیال کے لیے یہ ضروری تصور کیا جاتا ہے کہ انشا پرداز موقع ومحل کی مناسبت سے موزوں ترین الفاظ وتراکیب کا استعمال کرے، ایک کامیاب انشا پرداز قاری کی دلچسپی اور وقت کا خیال کرتے ہوئے کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ خیالات ادا کرتا ہے۔ اسلوب کی اسی خصوصیت کو جامعیت وسلاست کہتے ہیں۔ اسلوب کا

تعلق اپنے عہد کی معاشرت ،ثقافت ،سیاست سے بھی ہوتا ہے ۔سماج ومعاشرے میں رائج خیالات، محاورات، واقعات، الفاظ وغیرہ کا سہارا لے کر ہی ایک مصنف اپنے اسلوب کو وضع کرتا ہے۔ایک مصنف اپنی انفرادی شخصیت کے باوجود اپنے عہد کے مذاق ،مزاج ،رجحان وغیرہ کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ ماحول کے علاوہ اسلوب کی تشکیل میں موضوع کا بھی اہم حصہ ہوتا ہے، ہر موضوع منفرد اسلوب کا متقاضی ہوتا ہے۔ مثلا علمی، تاریخی ،افسانوی ،صحافتی ،تدریسی وغیرہ جیسے موضوعات ایک خاص قسم کے اسلوب کے متلاشی ہوتے ہیں ۔اسلوب کی تشکیل میں مصنف کا انداز تخاطب بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مصنف قاری کی ذہنی سطح علمی استعداد وغیرہ کو ذہن میں رکھ کر اسلوب نگارش کا انتخاب کرتا ہے۔ایک کامیاب اسلوب تحریر کی یہی علامت ہے کہ قاری پورے طور پر اس سے ہم آہنگ ہوجائے۔

یہاں اردو نثر اور اسلوب نگارش کی روایت کا مختصر جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔جس سے اردو میں اسلوب نگارش کی تشکیل کا اندازہ لگایا جاسکے۔

اردو نثر کا آغاز عربی وفارسی کی مذہبی یا افسانوی کتابوں کے ترجموں سے ہوا۔ مذہبی کتابوں کے تراجم اور صوفیائے کرام کے اقوال کا مقصد عوامی تبلیغ تھا ،اور داستانوں کے تراجم کا مقصد عوام وخواص کو تفریح وانبساط کا سامان فراہم کرنا تھا۔اسی لیے مذہبی کتابوں کے تراجم سادہ، سلیس اور عام فہم ہوتے تھے، جبکہ اس کے برعکس داستانوں کے تراجم ،عبارت آرائی ،قافیہ پیمائی ،مشکل الفاظ ،وغیرہ سے لبریز ہوتے تھے۔مثلاً ملا وجہی کی سب رس، تحسین کی نوطرز مرصع وغیرہ اسی مرصع اسلوب کی یادگار ہیں۔انیسویں صدی کے وسط تک اردو ادب کا مذاق یہی رہا۔

انقلاب ۱۸۵۷ء سے پہلے ہمارے ادب کا تعلق صوفیاء کی خانقاہوں اور شاہی درباروں تک ہی محدود تھا،اور اس وابستگی نے اردو نثر میں داستان اور نظم میں قصیدہ کو فروغ دیا۔شاہی سرپرستی کی وجہ سے شاعروں وادیبوں میں خوش حالی وفارغ البالی پیدا ہوئی ،مگر ان خوبیوں کے ساتھ ان کی تخلیقات میں آورد، مبالغہ، تزئین الفاظ، تکلفات اور تصنع کی بھی آمیزش ہونے لگی۔انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد تمام شعبہ ہائے زندگی میں تبدیلی پیدا ہوئی، جاگیریں ،ریاستیں ختم ہونے لگیں ،ہمارے ملک میں انتشار ،سیاسی انارکی ،غربت وجہالت کے مسائل ابھر کر سامنے آئے جن کا اثر ادب پر بھی مرتب ہوا،اور اس میں موضوعات اور مقاصد دونوں میں زبر

دست تبدیلیا آئیں اورادب درباروں کی سرپرستی سے نکل کرقومی واصلاحی ترقی کا آلہ کار بن گیا۔ بامقصداور اصلاحی تحریروں کا آغاز علی گڑھ تحریک کے بانی سرسید احمد خان نے کیا۔ جبکہ سرسید سے قبل نامور شاعر مرزا غالبؔ اپنے مکتوبات کے ذریعہ عام فہم اور سادہ نثر لکھنے کی روایت قائم کر چکے تھے، اور سرسید کے سامنے بطور نمونہ غالب کے یہ خطوط موجود تھے۔ سرسید احمد خان نے ماہنامہ رسالہ 'تہذیب الاخلاق' جاری کر کے اردو نثر کو ایک نئی جہت عطا کی، اور اردو نثر داستانوی، رومانوی اور خیالی دنیا سے نکل کر حقائق کی دنیا میں آگئی، اور اب اردو نثر علمی، افادی، اصلاحی، فکری و مذہبی خیالات کی ترجمان بن گئی۔ ان موضوعات کے اظہار کے لیے اردو نثر نے سادگی، سلاست، کا روپ اختیار کرلیا۔ عبارت آرائی کی جگہ استدلال اور معنویت نے لی مبالغہ اور الفاظ کی تراش خراش کے بجائے جامعیت وقطعیت پر زور دیا جانے لگا۔ جس سے ادب کے مثبت واچھے اثرات قومی ومعاشرتی زندگی پر بھی مرتب ہوئے۔

سرسید احمد خان ایک ایسے مصلح ومفکر تھے جو ادب کے ذریعہ قوم کی اصلاح چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے ایسی زبان وبیان کا استعمال کیا جوان کے مقاصد کو من وعن قوم کے دلوں تک پہنچائے۔ سرسید کے رفقاء بھی اسی مشن کے اہم رکن تھے۔ ان لوگوں نے بھی اردو ادب کے دامن کو بہت وسعت بخشی۔ سرسید احمد خان کی بدولت ہی اردو زبان اب تک جو صرف حسن وعشق، لب ورخسار، زلف وکاکل، گل وبلبل کی ترجمان سمجھی جاتی تھی، اب سیاست، معاشرت، فلسفہ، سائنس، ثقافت، عمرانیات وغیرہ جیسے متنوع موضوعات کی ترجمان بن گئی، اوراس میں عوامی رنگ وامنگ کا اظہار ہونے لگا۔

سرسید کے دست راست الطاف حسین حالی نے بھی بامقصد اور اصلاحی تحریروں پر اصرار کیا۔ اردو نظم ونثر دونوں کو سادگی، سلاست اور عام فہم بنانے کی کوشش کی۔ حالی کے معاصر محمد حسین آزاد نے مقصد اور اصلاح کے بجائے اسلوب اور طرز ادا کو بڑی اہمیت دی، ان کے یہاں تصنع اور پرکاری کی کثرت ہے۔ محمد حسین آزاد کی نثر میں شاعرانہ آہنگ، لہجہ وتیور پایا جاتا ہے، اسی وجہ سے وہ صاحب اسلوب نثر نگار کہلاتے ہیں۔ اسی زمانے میں ڈپٹی نذیر احمد نے ایک ایسی نثر کی بنیاد ڈالی جس میں اصلاح ومقصد کے ساتھ ساتھ طرز ادا زبان وبیان کو بھی بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ لیکن نذیر احمد کی نثر میں روزمرہ محاورات ضرب المثال کی کی کثرت نے ان کو دوسرے نثر نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔

شبلی نعمانی کی نثر اردو ادب میں ایک اضافی کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے اردو میں فصاحت، بلاغت کا ایک اعلی معیار قائم کیا، ان کا اسلوب بیان اردو ادب میں ادبی، علمی نثر کا شاہکار ہے۔ شبلی نعمانی کے قائم کردہ دار المصنفین اعظم گڑھ نے اس طرز اسلوب کی راہ اور ہموار کردی، جس کے نمایاں ترین ارکان سید سلیمان ندوی، عبد السلام ندوی اور عبد الماجد وغیرہ ہیں۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے ابتدا میں جن عظیم صاحب اسلوب نثر نگاروں نے اردو نثر کو نئی جہتوں سے آشنا کیا ان میں محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، شبلی نعمانی، ابوالکلام آزاد، خواجہ حسن نظامی، مہدی افادی، سید سلیمان ندوی، اور مولانا عبد الماجد دریا بادی وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ یہ عظیم شخصیات اپنے زمانے کے مشاہیر علم وفن تھے، اور ان کی تصانیف کا ایک مقصد تھا۔ یہ صاحب اسلوب علماء وادیب اپنے زمانے اور اپنے قوم کے مبلغ و مصلح تھے، اور انھوں نے اپنے اس ہتھیار سے اپنے اصلاحی وفلاحی تصورات کی اشاعت پورے زور وشور کے ساتھ کی۔

مولانا عبد الماجد دریا بادی کا ایک مقصد حیات تھا۔ وہ زندگی کا ایک نظریہ اور نصب العین رکھتے تھے۔ مولانا اپنی تحریروں کے ذریعہ قوم وملت کو پیغام دینا چاہتے تھے، ان کی ابتر حالت کو بدلنا چاہتے تھے، وہ مصلح، عالم، فاضل تھے اور وقت وحالات کو سامنے رکھ کر قوم میں تبدیلی کے خواہاں تھے، مگر مشرقی تہذیب واقدار کے مٹنے پر انھیں قلق تھا۔ وہ قوم کو جہالت، غربت جیسے موذی مرض سے بچانا چاہتے تھے۔ مولانا تہذیب وتمدن اور دوسرے علوم وفنون سے پوری طرح واقفیت رکھتے تھے، اور ساتھ ہی زبان وبیان کے ذرائع اظہار پر ان کو قدرت حاصل تھی۔ عربی، فارسی، انگریزی، اردو زبان وادب کے وہ ماہر وفاضل تھے، اور مشرقی طرز بیان پر انھیں عبور حاصل تھا۔ ان کی تحریروں میں فصاحت، بلاغت، جذبات واحساسات، فکر وخیال، حکمت وغیرہ کا اظہار بڑے خلوص سے کیا گیا ہے۔ مولانا کے اسلوب نگارش کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں آمد، سلاست، ایجاز واختصار، برجستہ اشعار اور مصرعوں، صنائع وبدائع، رعایت لفظی، ضلع جگت، قافیہ پیمائی، روزمرہ محاورہ وغیرہ کا استعمال بڑے سلیقے سے کیا گیا ہے۔

مولانا ماجد کے اسلوب نگارش کی تشکیل میں اسلامی فکر، مشرقی تہذیب اور قومی اتحاد، حکمت وحقایات، عبرت وموعظت، منظرکشی، مکالماتی واستدلالی انداز، طنز ومزاح اور استہزائیہ انداز وغیرہ کلیدی حیثیت کے حامل ہیں۔ مولانا کی چند تحریریں بطور مثال ملاحظہ ہوں۔

''مظلومیت و غربت ، بے کسی اور بے بسی ، ہم پر ، آپ پر ، آج کسی درجہ میں طاری ہو ، اسوہ محمدیؐ سے بڑھ کر کون اسوہ ملے گا تسکین و تسلی کے لیے اس ذات کے سوا اور کہاں سامان نظر آئے گا؟ لیکن فراغت و غلبہ کے وقت بھی کیا اس کا سررشتہ ہاتھ سے چھوٹنے پائے گا؟ اچھا تو یہ بتایے کہ سرداری فتح مندی کی حالت میں کبھی اس سرداروں کے سردار کے قدم نے عبدیت کے حدود سے ذرا بھی تجاوز کیا ہے؟ انتہائے مشغولیت میں بھی غفلت طاری ہوئی ہے؟ بڑی سے بڑی جنگ اور معرکہ آرائی کے وقت رسد کا سامان اور روپیہ کا انتظام ، گھوڑوں کی فراہمی اور ہتھیاروں کی خریداری ، میدان جنگ کا انتخاب اور صفوف لشکر کی ترتیب کوچ کا حکم اور قیام کا ارشاد ، فوجوں کا لڑانا ، صلح کے شرائط طے کرنا ، مال غنیمت کی تقسیم اور ملوک و سلاطین سے نامہ و پیام یہ سارے کام جن کے لیے آج بیسوں ماہرین خصوصی کی ضرورت ہوتی ہے ۔ کمسریٹ والوں انجینیر وں کی ، جنرل اور مدبر کی ، خدمات بنفس نفیس ہی انجام دیتے تھے اور ممکن نہ تھا کہ ان میں پڑ کر کسی وقت کی نماز رہ جائے ۔ معمولات عبادت میں فرق آجائے ۔ پھر آج کسی کے مشاغل کیا ان سے زائد ہو سکتے ہیں ۔ کس کی مشغول زندگی اس مقابلہ میں لائی ممکن ہے؟''[۱]

''گھر! وہی مشرقی گھروندا ۔ ہاں وہی مشرق ، جہاں ہر صبح مسجدوں میں وضوع ہوتے ہیں اور دریاؤں میں اشنان ، جہاں ہر شام مسجدوں میں اذان اور مندروں میں گھنٹے بجتے ہیں ، جہاں صبح آفتاب نکلنے سے پہلے ہی شروع ہو جاتی ہے اور جہاں شام ، دن چھپنے کے ساتھ ہی آجاتی ہے ، جہاں یہ نہیں ہوتا کہ سائنس کا کمال رات کو دن بنا دے اور آرٹ کی جنت نگاہ دن میں رات کے سب مزے بھر دے ! یہ وہ زمین ہے جس پر آسمان کو ناز رہ چکا ہے ! نبی اور ولی اور بڑے بڑے رشی اور گیانی کسی زمانہ میں اسی زمین پر چلے پھرے ، رہے بسے

---

[۱] ذکر رسول یا مردوں کی مسیحائی : مولانا عبدالماجد دریابادی : ص: ۷۸ ـ ۷۹

ہیں۔اور آج بھی اپنے اپنے طریق پر خدا جانے کتنے ذکر وفکر کے حلقوں کو بسائے اور گیان دھیان کی سادھیوں کو رچائے ہوئے ہیں! یہ وہ خطہ ہے جہاں اب تک عزت ہورہی ہے برقع اور گھونگھٹ کی،نقاب اور چادر کی۔جہاں اب تک شوہر کو سرتاج اور سوامی کہا جاتا،اور باپ کو قبلہ وکعبہ لکھا جاتا ہے۔یہاں والوں کا اب تک یہ عقیدہ ہے کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے اور ماں کو ادب کے ساتھ سلام کرنا اس کے قدموں میں آنکھیں ملنا دستور میں داخل ہے۔ اولاد کا سلسلہ پیدائش روکنے کی جگہ یہاں اب تک بیٹا 'لخت جگر' اور بیٹی 'نور نظر' ہے۔غیرت یہاں اب تک سب سے بڑھ کر ماں اور بہن کی اور بیٹی کی، دلوں میں بیٹھی ہوئی ہے۔اور ان کی بے حرمتی کی طرف اشارہ، شریفوں کو چھوڑیے، بازاریوں اور آوارہ مزاجوں کی زبان میں بھی سب سے بڑی گالی ہے۔ادب اب تک یہاں بڑوں کا چلا آتا ہے۔محلّہ کا 'ادنی' اگر سن میں بڑا ہے تو 'اعلیٰ' ہے۔استاد اور گرو کا حق مانا جاتا ہے استادوں کے خلاف اور اسٹرائکوں (ہڑتالوں) کی جگہ الٹے ان کے حق دو دو پشتوں تک مانے جاتے ہیں۔خاندان کے معنی محض میاں بیوی کے جوڑے نہیں لیے جاتے ہیں۔ماں اور باپ کے علاوہ چچا اور ماموں اور پھوپھی اور خالہ اور بھاوج اور سالی اور سالے اور بہنوئی اور وہ بھی صرف سگے نہیں، رشتے کے، بیگانے نہیں، اپنے اور خاندان سے خارج نہیں، خاندان کا جزو سمجھے جاتے ہیں۔یہاں بیسویں صدی میں بھی تعلقات آٹھویں صدی اور ساتویں اور چھٹی صدی اور اس سے بہت پہلے کی صدیوں سے ٹوٹے نہیں قائم ہیں۔" [1]

"کوئی شخص اگر آپ کے کمسن بچہ کو آگ میں ہاتھ ڈال دینے، یا کنویں میں پھاند پڑنے، یا چھت سے کود آنے کی صلاح دے،تو آپ اس گھڑی سے اس شخص کے دشمن ہو جائیں۔کوئی شخص اگر زہر کا پیالہ آپ کی

---

[1] انشائے ماجدی: مولانا عبدالماجد دریابادی: ص: ۳۹۵

اولاد کے سامنے پیش کر دے، تو آپ اس شخص کے خون کے پیاسے ہو جائیں،
پر یہ کیا ہے، کہ اپنی اسی عزیز اولاد، اپنے انہی چہیتے جگر پاروں کے جسموں کی
نہیں، روحوں کی ہلاکت کا سامان آپ خود اپنے ہاتھ سے کر رہے ہیں۔ انھیں
روحانی موت کے گڑھے میں ڈھکیلنے کے لیے آپ خود ہنسی خوشی آمادہ ہو رہے
ہیں، انہی کو آپ اپنا، اور اپنی اولاد کا مخلص و خیر خواہ، دوست و غمگسار سمجھ رہے
ہیں۔ کیا آپ نے یہ فیصلہ کر لیا ہے، کہ جسمانی زندگی کے مقابلہ میں روحانی
زندگی حقیر، ہیچ و ناقبل التفات ہے؟ جسم و بدن تو بہر حال ایک روز فنا ہو کر رہیں
گے، یہ کیسی بدبختی و نادانی ہے، کہ اس ڈھلتی ہوئی چھاؤں کے پیچھے آپ روح
و اخلاق کی دولت لازوال کو اپنے ہاتھ سے ضائع کر رہے ہیں۔''[1]

مولانا کی تحریروں کا ابتدائی یا تمہیدی حصہ بڑا دلکش اور پرکشش ہوتا ہے۔ ابتدائی حصہ کو پڑھتے ہی قاری پر مولانا کے خاص اسلوب کا سحر طاری ہو جاتا ہے، اور وہ پورا مضمون بڑی دلچسپی سے پڑھ لیتا ہے۔

''امیر المومنین سیدنا حضرت علی کی خلافت کے حالات جب تاریخ
و تفسیر کی کتابوں میں نظر سے گذرے ہیں تو حیرت اور عبرت دونوں شدت کے
ساتھ ہوتی ہیں۔ رسول اکرمؐ کے قریب ترین عزیز اسلام لانے میں شرف
اولیت سے ممتاز، شجاعت میں بے مثال علم، عمل، تفقہ و ورع میں اپنی نظیر
آپ۔ تمام صحابی آپ کے فضل و کمال کے قائل، اس پر یہ حال کہ آپ خلیفہ
ہوئے نہیں کہ بغاوتیں ہر طرف پھوٹ پڑیں۔ ادھر شورش، ادھر بدامنی۔ آج
اس مخلص نے بغاوت کر دی، کل وہ وفادار غدار بن گیا۔ بڑے بڑے قدیم
مخلص غدر و فساد پر آمادہ، سرکشی و گستاخی پر مستعد، ہر ہر فرد معترض و نکتہ چین جیسے
کسی کی زبان میں لگام ہی نہیں۔ آنکھوں نے اس منظر کو ایک، ہلکے پیمانہ پر محمد علی
کی زندگی کے آخری دور میں دیکھ لیا۔ علیؓ صحابی ہی نہیں، خلیفہ راشد بھی تھے، محمد
علی بیچارہ عام امتی۔ اس کھلے ہوئے فرق مراتب سے قطع نظر کر لیجیے، تو تاریخ

---

[1] سچی باتیں جلد اول: مرتب نعیم الرحمٰن صدیقی قدوائی: ص:۱۷۲

اپنے کو دہراتی ہوئی موجود۔محمد علی ابھی چند سال قبل ملت کے عملاً 'امیر المومنین'
ہی تھے۔مسلمانان ہند کے محبوب ترین لیڈر۔یا اب یہ حال ہو گیا کہ بچہ بچہ
دشمن ونکتہ چیں ۔خال خال اخبارات مثلا انقلاب (لاہور) والا مان
(دہلی) ساتھ رہ گئے اور سچ تو اپنی محدود بساط کے ساتھ مخلص تھا ہی۔باقی
سارے کے سارے اخبارات اور اخبار نویس بس آستین چڑھائے ہوئے۔''[۱]

ابتدائیہ کی طرح مولانا کی تحریروں کا اختتامیہ بھی بڑا پر مغز اور جاندار ہوتا ہے۔مضمون یا مقالے کی تلخیص و ماحاصل کو مولانا بڑی فنکاری سے چند سطروں میں اس طرح بیان کر دیتے ہیں کہ قاری مولانا کی فکر سے پورے طور پر ہم آہنگ اور ہم خیال ہو جاتا ہے۔مولانا کا اختتامیہ ترسیل و ابلاغ کے اعتبار سے بھی بڑا اہم ہوتا ہے۔

''مریضہ کو یقین مرض الموت ہو جاتا ہے اور مسلمان گھرانے کی
پیدائش رنگ لاتی ہے۔خواہش نکاح کی پیش کرتی ہے اور عین اس کے مرض
الموت کے بستر پر جب نفس کی لذتوں کا کوئی بھی لگاؤ نکاح میں باقی نہیں رہ
جاتا وہ،سید اور سید زادہ اسے اپنی عقد زوجیت میں باقاعدہ لے آتا ہے۔شہر
کے ایک چشتی بزرگ کے ہاتھ پر کمسن مومنہ توبہ کرتی ہے۔بیعت کرتی ہے اور
گناہوں سے دھل دھلا پاک وصاف ،کلمہ توحید پڑھتی ہوئی جولائی ۱۸۷۶ء
مطابق شوال ۱۲۹۳ھ میں جنت کے سفر پر روانہ ہو جاتی ہے۔قبر پر جو طویل
کتبہ درج ہے اس میں بسم اللہ الرحمن الرحیم اور کلمہ شہادت اور آیتہً
''کل من علیھما فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام'' کے
بعد یہ تصریح بھی درج ہے کہ بر کلمہ توحید جان بحق تسلیم کرد،توحید کا کلمہ پڑھتے
ہوئے جان دی۔اللہ اللہ۔ساری ریاضتیں اور سارے مجاہدے اسی دن اور
اس گھڑی کے لیے تو ہوتے ہیں جس بندی کو وہ جس مرتبہ پر چاہیں پہنچا دیں۔
کسی کے بھی ایمان کی تحقیر کا حق کسی کو حاصل ہے؟''[۲]

---

[۱] محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق: مولانا عبدالماجد دریابادی:ص:۵۲۵

[۲] اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں: مولانا عبدالماجد دریابادی:ص:۲۹۶

مفکر اسلام علی میاں ندوی مرحوم مولانا ماجد کے اسلوب نگارش کی عظمت کا اعتراف بڑی فراخ دلی سے کیا ہے۔

''ایک فطری ادیب اور صاحب قلم کی پہچان یہ ہے کہ موضوع کیسا ہی سادہ سنجیدہ اور خشک و پرتقدس ہو وہ اپنے قلم کی جولانی، خیال کی رعنائی اور طرز ادا کی دلآویزی کو روک نہیں سکتا اور اس کے لیے اپنے ادبی ذوق اور اسلوب تحریر سے عاری وخالی ہو جانا ممکن ہوتا ہے خلافت وندوہ کے خطبات کا ثقہ ومتین ماحول ہو یا فلسفہ اجتماع یا فلسفہ جذبات کی سنگلاخ زمین اور پر خار وادی یا تفسیر وتصوف کا پرعظمت اور نازک میدان جہاں ہر ہر قدم پر ہوشیار اور نگاہ رو بہ رو کی آواز اور بڑے بڑے ادیبوں کے کان میں ''قدم سنبھال کے رکھیو یہ تیرا باغ نہیں'' کی صدا آتی ہے، اس کا قلم گل کاری اور گلفشانی سے باز نہیں رہتا اور یہی راز ہے کہ ادب وزبان کے رسیا اور لطف بیان کے جویا بھی یہ بھاری بھرکم تحریریں ذوق وشوق سے پڑھ لیتے ہیں اور گرانی محسوس نہیں کرتے۔ خالص ادیبوں میں یہ امتیاز مولوی محمد حسین آزاد کا ہے کہ شعرا کی محفل شعر وسخن ہو یا سلطان وقت دربار اکبری، ان کی ہر تصویر میں نیرنگ خیال اور ان کی ہر تحریر میں آب حیات نظر آتا ہے۔ عالموں اور محققوں میں مولانا شبلی کی خصوصیت یہ ہے کہ شعر العجم اور موازنہ انیس ودبیر جیسی خالص ادبی وتنقیدی تصنیف ہو یا الفاروق وسیرۃ النبی جیسی ثقہ پرشوکت و باعظمت موضوع یا الکلام وعلم الکلام جیسا سنگین وخشک مضمون ہر جگہ ان کی تحریر کی شگفتگی ورعنائی قائم رہتی ہے، اور ادب وزبان کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔ یہی اپنے رنگ میں مولانا عبدالماجد دریابادی کی خصوصیت ہے کہ ان کی کوئی تحریر ادب وزبان کی چاشنی سے خالی نہیں، اور کہیں ان کا اسلوب تحریر جو ان کی شخصیت بن گیا ہے ان کا ساتھ نہیں چھوڑتا، حد یہ ہے کہ لیکی کی کتاب

’ہسٹری آف یورپین مارکس کے ترجمہ تاریخ میں‘ اخلاق یورپ‘ میں بھی (جو اپنے موضوع، اپنے فنی اصطلاحات، اردو کی تنگ دامنی اور ترجمہ کی مشکلات کی وجہ سے نہایت مشکل کام تھا) وہ پورے طور پر کامیاب ہوئے ہیں۔ اور پوری کتاب میں کہیں ثقالت و خشکی اور ترجمہ پن نظر نہیں آیا۔ ... مولانا کے اسلوب تحریر اور ادبی خصوصیات کے متعلق میرا کچھ کہنا تو بے ادبی اور جسارت ہے مگر اتنا ضرور عرض کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے طرز کے بانی اور خاتم ہیں، طنز نگاری، اسالیب بیان اور اوصاف ادا میں نازک ترین اور دشوار ترین صنف ہے اس میں وہ ادیب، صاحب قلم کامیاب ہو سکتا ہے جو صحیح معنی میں زبان کا ادا شناس اور مزاج داں ہو۔ بلکہ اہل زبان ہو۔ کہ ذرا سی چوک بے احتیاطی اور بے اعتدالی سے بلکہ بعض اوقات محاروں کی چاٹ اور زبان کے چٹخارے میں طنز، ہجو، پھکڑ پن اور بے تمیزی کے حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ ... مولانا عبدالماجد کی حس اس بارہ میں ذکاوت حس تک پہنچی ہوئی ہے۔ اور زبان کے معاملہ میں ان پر گرفت مشکل ہے۔ بعض مرتبہ ان کا ایک فقرہ ایک شذرہ کا اور ایک شذرہ پوری کتاب کا کام کر جاتا ہے۔ اور کسی وقت ان کا ایک جملہ مخاطب یا مشار الیہ کے لیے ایسا بھی بھاری پڑ جاتا ہے کہ اس کا رکھنا بھی مشکل پڑ جاتا ہے۔ اور اٹھانا بھی۔ بعض مرتبہ وہ کسی پرانے شاعر کے مصرعہ کو عنوان بنا کر پورا کام کر جاتے ہیں۔ اور وہ مصرعہ سب کچھ کہہ جاتا ہے اس کے بعد جو کچھ ہوتا ہے سب اس کی تشریح اور تفصیل۔ اس موقع پر ان کی ادبیات کے ذخیرہ پر وسیع نظر ان کے انتقال ذہنی اور ان کے حسن انتخاب کی بے اختیار داد دینی پڑتی ہے کہ وہ یہ مصرعہ کہاں سے لائے اور کس طرح اس کو نگینہ کی طرح انگوٹھی میں جڑ دیا۔‘‘[۱]

مولانا کے مخصوص اسلوب نگارش کے ترجمان وعکاس ان کے خطوط بھی ہیں۔ مولانا کے خطوط

---

[۱] مولانا دریابادی ذاتی تاثرات (مضمون) ابوالحسن علی ندوی: فروغ اردو: (عبدالماجد دریابادی نمبر) اگست تا اکتوبر ۱۹۷۷ء لکھنو: ص: ۲۷۔۲۸۔۳۰۔۳۱

زبان و بیان ،اسلوب و آہنگ ،موضوعات کے تنوع اور جذبات و افکار کے اظہار میں خاص عظمت اور منزلت کے حامل ہیں۔ مولانا کے خطوط علمی و ادبی شان اور ایجاز و اختصار، رعایت لفظی، ضلع جگت اور برمحل اشعار و محاورات کے استعمال میں بھی بے مثال ہیں۔

''بنام مکتوب یوسف قمر

ہلال نو یوں بھی آبروئے آسمان اور پھر امت کا قومی نشان۔ اور اس کے ایڈیٹر یوسف قمر! جمال ہی جمال! نور علی نور چار چاند لگ جانا اسی کو کہتے ہیں۔ اس کی ٹھنڈی روشنی یقیناً ہر دیدور کے لیے سرمہ بصارت اور چشمہ بصیرت ثابت ہو رہی ہوگی۔''[۱]

''بنام مکتوب مرزا جعفر علی خاں اثر

انشا اللہ ۷ استمبر کی سہ پہر کو تقریباً پانچ بجے حاضر خدمت ہوں گا۔ برسات کا موسم ہے ایسا نہ ہو کہ عین وقت پر شدید بارش ہو جائے اور مجھے شرمندگی سے 'پانی پانی' ہونا پڑے۔''[۲]

''مکتوب بنام حاجی مقتدا خاں شیروانی علی گڑھ

آپ کے اشہب قلم نے سبزہ زار میں ماشا اللہ وہ جولانیاں دکھائی ہیں وہ کلیلیں بھری ہیں وہ وہ کاوے کاٹے ہیں وہ طرارے بھرے ہیں کہ میری ہمت تو تقلید کی بن نہیں پڑتی۔ اس میدان کے غازی تو آپ ٹھہرے۔ میرا ابلق خامہ اگر داد کی منہ زوری کا حوصلہ کرے تو پہلے ہی قدم پر ٹھوکر کھائے داغ پر داغ اٹھائے ایک ہی گردنی میں درست ہو جائے نعل در آتش ہو کر زبان بند کرتا ہوں۔ قافیہ تنگ ہے زینہار آگے قدم بڑھانے کی

---

۱ مکتوبات ماجدی جلد اول: مرتبِ ڈاکٹر ہاشم قدوائی: ص۱۲

۲ ایضا: ص:۲۳

ہمت نہیں کرتا۔ اللہ آپ کا کارساز ہے۔'' [۱]

''بنام مولوی محمد ہاشم فرنگی

سبحان اللہ کیا چیز (Cheese) آپ اس ناچیز کے لیے لے آئے ،

جزاک اللہ'' [۲]

''بنام پروفیسر آل احمد سرور

آپ ادھر پٹنے گئے ادھر یہ نیاز مند پٹنے کے قریب پہنچ گیا۔ ۳۲ دانتوں میں ایک زبان سنی تھی۔ ۳۱ جولائی کو الہ آباد میں دیکھنے میں آئی۔ اردو کا تن تنہا نمائندہ یہ بے زبان۔ آپ نے شرکت نہ کر کے ظلم کیا اردو پر، اکیڈمی پر، اور خود اپنے پر، کون جانتا تھا کہ یہ غم سرور کے ہاتھوں اٹھانا پڑے گا۔'' [۳]

مولانا کے بھتیجے اور داماد عبدالعلیم قدوائی صاحب مولانا ماجد کے اسلوب نگارش کے متعلق لکھتے ہیں۔

''مولانا کی انشا پردازی کے مختصر تجزیہ سے ان کی انفرادیت اور اعلی اسلوب کا پتہ چلتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر ایسے صاحب دل ادیب تھے جنھوں نے اپنی شخصیت، علم، احساس اور ادبی تزئین سے اردو نثر کو مالا مال کر دیا۔ اقلیم ادب میں انھوں نے صاحب قرآنی کی اور ٹکسالی زبان میں بے مثال طنز اور جاذب نظر سرخیوں کے ساتھ عصری مسائل پر اپنے خیالات زریں کا اظہار کیا اور ادب صالح اور معیاری صحافت کے بہترین نمونے پیش کیے۔'' [۴]

مولانا کی تحریروں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے، کہ وہ اسلامی فکر کی تبلیغ کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ موضوع کچھ بھی ہو مگر ان کا مقصد اسلام کی سر بلندی اور مشرقی اقدار کا ترجمان ہی ہوتا ہے۔ مولانا اپنی تحریروں میں خطابت، جوش، خود کلامی، اور مکالماتی انداز کے استعمال سے ایک پر تاثیر اور پر سوز فضا تخلیق کر دیتے ہیں۔ مولانا کی تحریریں شگفتگی، رعنائی کے ساتھ ساتھ حزن و یاس، درد و غم کی بھی

---

۱ مکتوبات ماجدی جلد اول: مرتب ڈاکٹر ہاشم قدوائی: ص: ۶۹

۲ ایضا: ص: ۱۱۷ ۳ ایضا: ص: ۱۴۲

ترجمان ہوتی ہیں۔مولانا کا خاص اسلوب قاری کومسرت وبصیرت کے ساتھ ساتھ فکروعمل کی دعوت بھی دیتا ہے۔موضوع چاہےفلسفہ،منطق،تاریخ،صحافت،تفسیروغیرہ کچھ بھی ہومگرمولانا کاقلم اپنامنفردودلکش اسلوب کا جوہرضرور دکھاتا ہے،اوران کی تحریروں میں ڈرامائی وغنائی کیفیت،سلاست وسادگی،جوش وجذبہ کاعنصر ہرجگہ نظرآتا ہے۔

اختتامیہ

مولانا عبدالماجد دریابادی ہمہ جہت و ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ وہ فلسفی، ماہر نفسیات، باکمال انشاپرداز ہونے کے ساتھ ساتھ ایک منفرد و ممتاز عالم دین اور مفسر قرآن بھی تھے۔ انھوں نے ادب میں ترجمہ تالیف، نقد و عرض، سیرت و سوانح، شاعری و صحافت، تحقیق و تدوین، مکتوب و سفرنامہ اور ڈرامہ جیسی اہم اصناف میں اپنی درخشاں شناخت چھوڑی ہے۔

مولانا ماجد دریابادی کا آبائی وطن قصبہ دریاباد ضلع بارہ بنکی ہے۔ مولانا کا بچپن بڑی خوشحالی و فارغ البالی میں بسر ہوا ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے گھر میں ملازم موجود تھے۔ شاید اسی وجہ سے بچپن ہی سے ان کی طبیعت میں کچھ تحکمانہ انداز خود رائی کے اثرات پیدا ہو گئے جو آخر عمر تک قائم رہے۔

مولانا ماجد کی ابتدائی تعلیم، قرآن ناظرہ، اردو، عربی، فارسی اور انگریزی کی گھر پر ہوئی۔ مولانا کے والد محترم سرکاری ملازمت کے اعلی عہدے پر فائز تھے۔ اور ان کا تبادلہ مختلف مقامات گونڈہ، بستی، گورکھپور، سیتا پور وغیرہ میں ہوتا رہا۔ مولانا کی پرائمری سے دسویں جماعت تک کی تعلیم سیتا پور کے ہائی اسکول میں ہوئی کیونکہ ان کے والد صاحب کا قیام یہاں طویل مدت تک رہا۔ مولانا کے والد صاحب کے احباب کا حلقہ بہت وسیع تھا اور ان میں عالم و فاضل، ادیب و شاعر، ڈاکٹر و حکیم شامل تھے۔ اہل علم اور دانشوروں کی صحبت اور اخبار و رسائل کے مطالعہ کی بدولت مولانا بچپن ہی سے علمی، ادبی، مذہبی اور سیاسی مسائل سے باخبر رہنے لگے تھے۔ گھر کے علمی ماحول کے نتیجے میں انھیں ہر چیز پڑھ ڈالنے کا شوق جنون کی حد تک ہو گیا تھا۔

مولانا نے اعلی تعلیم کے لیے کیننگ کالج لکھنو میں داخلہ لے لیا یہاں ان کے بڑے بھائی عبدالمجید صاحب پہلے سے تعلیم حاصل کر رہے تھے مولانا بھی انھیں کے ساتھ رہنے لگے۔ لکھنے پڑھنے کا شوق مولانا کو بچپن ہی سے تھا اور یہ شوق لکھنو آکر اور بڑھ گیا۔ کالج کی لائبریری کے علاوہ لکھنو کی تمام لائبریریوں سے انھوں نے استفادہ کیا۔ انٹرمیڈیٹ اور بی. اے کا امتحان مولانا نے کیننگ کالج لکھنو سے پاس کیا۔ اس کے بعد انھوں نے فلسفہ سے ایم. اے کرنے کے لیے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا لیکن اچھے استاد اور نصابی کتابیں نہ ملنے کی وجہ سے وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ لیکن اس کے بعد انھوں نے سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں داخلہ لیا، بدقسمتی سے اسی زمانے میں ان کے والد صاحب کا جو حج بیت اللہ کے لیے گئے ہوئے تھے مکہ

معظّمہ میں انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے ان کو تعلیمی سلسلہ منقطع کرنا پڑا اور وہ لکھنو واپس چلے آئے۔

کالج کی طالب علمی کے زمانے میں بغیر نگرانی و صحیح مشورے کے بکثرت انگریزی کتب کے مطالعہ اور عقل پرستوں اور آزادی فکر کے پرستاروں کی صحبت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے ذہن میں الحاد و تشکیک کے جذبات پیدا ہونے لگے۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر کتابوں کا مطالعہ بھی کسی صاحب فہم کی رہبری میں نہ کیا جائے تو وہ انسان کو غلط راہوں پر ڈال سکتی ہیں۔ مولانا کے ساتھ ایسا ہی ہوا اور بلا روک ٹوک ہر چیز کو پڑھ ڈالنے کی عادت نے انھیں غلط راہ پر ڈال دیا۔ ملحدوں کی کتابیں پڑھ پڑھ کر وہ مذہب بیزار ہو گئے، گرچہ مولانا کے گھر کا ماحول مذہبی تھا اور بچپن میں مطالعہ بھی زیادہ تر دینی کتابوں کا کر چکے تھے، پھر بھی وہ کالج میں آکر مذہب سے دور ہوتے گئے، اور آٹھ نو سال تک تشکیک و الحاد کا شکار رہے۔ مولانا کی مذہب بیزاری اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ انھوں نے انٹرمیڈیٹ فارم میں مذہب کے خانے میں مسلم کے بجائے اپنے کو ''ریشنلسٹ'' لکھا۔ اسی دوران انھوں نے مولانا شبلی کی کتاب 'الکلام' پر ایک مفصل تنقیدی مضمون لکھا جس کا اصل مقصد 'الکلام' کو بنیاد بنا کر عقائد اسلام اور وجود باری، نبوت اور ضرورت مذہب وغیرہ پر چوٹیں کرنا تھا۔ یہ مضمون رسالہ 'الناظر' میں قسط وار شایع ہوا۔ مولانا کی مذہب بیزاری اور مذہب کی طرف واپسی بھی مطالعہ کے ذریعہ سے ہوئی۔ مولانا لکھتے ہیں ''ضلالت مطالعہ کے راستے سے پائی۔ ہدایت بھی بحمد اللہ اسی کی راہ سے نصیب ہوئی''۔

مولانا کی سب سے پہلی ملازمت مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ میں بطور لٹریری اسسٹنٹ کی حیثیت سے ہوئی۔ اس کے بعد ان کا تقرر حیدرآباد میں بحیثیت مترجم فلسفہ کے ہوا لیکن دونوں جگہ سے انھوں نے استعفیٰ دے دیا، دراصل مولانا ملازمت کے لیے پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ بہر حال انھوں نے ملازمت نہیں کی جو ان کی صحافتی و ادبی خدمات کے اعتبار سے بہت مفید ثابت ہوئی۔

مولانا ماجد نے جب ادبی دنیا میں قدم رکھا اس وقت برطانوی سامراج پوری طرح سے ہندوستان کے سیاہ و سفید کا مالک بن چکا تھا۔ عوام و خواص میں انگریزوں سے مرعوبیت بڑی حد تک پیدا ہو چکی تھی، اور علم جدید ہی کی بدولت ہندوستانی نوجوانوں میں اپنا حق حاصل کرنے اور غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کا جذبہ بیدار ہونے لگا تھا، اور دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستانی عوام استبداد و استعماریت، جاگیرداری اور غلامی سے نکل کر آزادی، انصاف، مساوات کے لیے عملی جدوجہد کرنے لگے تھے۔ جس کے نتیجے میں بالآخر ہمارا ملک آزاد

ہوا۔ پرانے عقیدوں اور اقدار زندگی کی جگہ جدید خیالات وافکار وجود میں آرہے تھے، اور نئی تحریکیں جنم لے رہی تھیں جیسے خلافت تحریک، ترک موالات تحریک، کانگریس، مسلم لیگ وغیرہ۔ ان تحریکات کی بدولت ہندوستان میں سیاسی، سماجی اور ادبی اعتبار سے بھی بڑی تبدیلیاں ہونے لگیں۔ اردو ادب میں بھی موضوع، مواد، ہیئت وغیرہ میں تبدیلیاں ہونا ناگزیر تھیں۔ اسی زمانہ کے ادیبوں میں مولانا آزاد، حسرت موہانی، شبلی نعمانی، علامہ اقبال، مولانا محمد علی جوہر، سید سلیمان ندوی، اشرف علی تھانوی وغیرہ جیسی عظیم المرتبت شخصیات کا بول بالا تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان تمام دانشوران قوم وملت کے اثرات قبول کیے۔ مولانا ماجد نے اس خاص ماحول وسیاسی پس منظر میں اپنے ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ ان کی تحریروں میں ایک طرف ادبی چاشنی ہے، تو دوسری طرف حکمت وحکایات، اصلاح معاشرہ، مذہبی احکامات کی تعمیل کا بھی زور ہے۔

یہ مقالہ دراصل مولانا عبدالماجد دریابادی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں لکھا گیا ہے۔ لیکن اس مقالہ میں مولانا کی ادبی خدمات کے ساتھ ساتھ ان کی مختصر سوانح اور صحافتی و مذہبی خدمات پر بھی مختصر روشنی ڈالی گئی ہے کیونکہ ان کے ادب اور مخصوص طرز نگارش کی تفہیم وتحسین کے لیے ان کی جملہ خدمات کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔

کسی بھی ادیب یا فن کار کی شخصیت اور اس کے فن پارے کی تفہیم وتشریح سوانحی پس منظر کے بغیر ناقص ہے۔ دراصل ادیب کے تخلیقی سفر میں، خاندانی پس منظر، تعلیم وتربیت، ماحول، سماج کا دخل ہوتا ہے۔ اسی ضرورت کے تحت اس مقالہ میں مولانا کا مختصر سوانحی خاکہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

مولانا ماجد اپنی زندگی کے آٹھ دس سال مذہب بیزاری میں گذار کر جب از سر نو اسلام سے وابستہ ہوئے تو اس شدت سے کہ وہ ہر جگہ اسلام کی تبلیغ کی راہیں نکال لیا کرتے تھے۔ وہ ہمہ وقت ملک وقوم کی تعمیر واصلاح کے لیے فکر مند رہتے تھے۔ صحافت چونکہ قوم وملت کی تبلیغ واصلاح کا موثر ذریعہ ہے۔ اس لیے مولانا نے صحافت کو بطور مشن اپنایا۔ مولانا کا صحافتی سفر تقریباً نصف صدی تک جاری رہا اور ان کے ہفتہ وار اخبار کو ہندو پاک میں یکساں مقبولیت حاصل رہی۔ مولانا کی صحافتی خدمات کا جائزہ لینے سے یہ اندازہ ہوا کہ مولانا کا صحافتی لہجہ ادب سے قریب تر ہے۔ ان کی صحافتی تحریروں نے ادب اور صحافت کے درمیان حائل دیوار کو گرانے کی کوشش کی ہے۔ صحافت میں زبان وبیان کی درستگی محاورات وروزمرہ کا برمحل اور درست استعمال

مولانا کا صحافتی امتیاز ہے۔

مذہبی اعتبار سے بھی مولانا کا ایک خاص مقام ومرتبہ ہے۔مولانا کی مذہبی تصنیفات بہت ہیں۔لیکن اس مقالہ میں ان کی ترجمہ نگاری کی خدمات کے سلسلہ میں ان کی مذہبی کتابیں اور تفسیر ماجدی کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔مولانا کی تفسیری خدمات اور مذہبی تصنیفات اردو میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔مسیحیت ویہودیت کے تقابل، جدید جغرافی وتاریخی معلومات کے ساتھ زبان وبیان کی چاشنی اور روزمرہ محاورہ کی زبان کے استعمال نے 'تفسیر ماجدی' کو ادب میں ایک اہم مقام ومرتبہ عطا کر دیا ہے۔ان کا انگریزی ترجمہ قرآن وتفسیر موجودہ تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے بڑی مفید ہے۔

مولانا ماجد دریابادی نے شعروشاعری اور ڈرامہ میں اپنے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔مولانا کا مختصر شعری مجموعہ 'تغزل ماجدی' ہے یہ اشعار مولانا کے ابتدائی دور کے ہیں پھر بھی ان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔اسی زمانہ میں شاعری کے ساتھ مولانا نے ایک ڈرامہ 'زود پشیماں' کے نام سے لکھا۔لیکن بعد میں اپنی علمی خصوصاً قرآنی خدمات کی بناپر وہ اس میدان سے بالکل کنارہ کش ہوگئے۔

شعروشاعری کی تخلیقات کے ساتھ ساتھ مولانا نے فلسفہ،نفسیات جیسے خشک موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے اور بڑی کامیابی سے ان موضوعات کا حق ادا کیا ہے۔

مولانا اپنی علمی ودینی خدمات کے ساتھ ساتھ مختلف اسفار بھی کیے اور ان کی روداد بھی لکھی۔مولانا کے یہ سفرنامے تہذیبی، سیاسی، جغرافیائی، ثقافتی اعتبار سے بڑے اہم ہیں۔

مولانا مجلسی آدمی نہ تھے اور دریاباد میں گوشہ نشیں ہوکر علمی ومذہبی خدمات انجام دیتے رہے۔خطوط نویسی سے ان کو بڑی دلچسپی تھی ہزاروں خطوط ان کی یادگار ہیں۔ان خطوط میں ادبی، معاشرتی، تہذیبی معلومات کے ساتھ زبان وبیان کی چاشنی بھی موجود ہے۔مولانا نے سیرت وسوانح لکھ کر اردو ادب میں اپنی انفرادیت قائم کی۔

آخر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا ماجد کی ہمہ جہت شخصیت نے اردو انگریزی میں مختلف موضوعات پر تقریباً ۵۰؍سے زائد کتابیں لکھیں۔جن میں ایک طرف تفسیر ماجدی ہے تو دوسری طرف فلسفہ جذبات، فلسفہ اجتماع، انشائے ماجدی، تبصرات ماجدی بھی ہیں۔انشاپردازی اور عالمانہ تحقیق کے ساتھ ترجمہ نگار کی حیثیت

سے بھی ان کو اہم مقام حاصل ہے۔

عبدالماجد دریابادی کی تمام تحریریں خواہ وہ فلسفیانہ ہوں یا سوانحی ہوں یا ادبی ہوں یا مذہبی ایک خاص شان رکھتی ہیں۔مختلف موضوعات پر لکھی گئیں مولانا کی کتابیں موضوع ومواد کے ساتھ ساتھ اسلوب بیان کے اعتبار سے بھی اہم ہیں۔مولانا دراصل اسلوب بیان کی لطافتوں،نزاکتوں اور باریکیوں سے واقف تھے اور ہر موضوع کو زبان کی لطافت اور کمالات کی وسعت کے ساتھ پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔مولانا جس موضوع پر لکھتے اپنی انفرادیت برقرار رکھتے اور موضوع کی مناسبت سے طرز تحریر کا انتخاب کرتے تھے۔موضوع کتنا ہی پیچیدہ کیوں نہ ہو مولانا کی طرز بیان کی دلآویزی برقرار رہتی ہے۔مولانا اپنے اسلوب کی بدولت اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے مولانا کی تمام تحریریں اردو ادب میں ادب عالیہ کی حیثیت رکھتی ہیں،اور ان کا شمار اردو کے بہترین ادیبوں میں کیا جاتا ہے۔

کتابیات

☆ مولانا عبدالماجد دریابادی آپ بیتی مکتبہ فردوس مکارم نگر لکھنؤ ۲۰۰۴ء

☆ مولانا عبدالماجد دریابادی اکبرنامہ یا اکبر میری نظر میں ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ ۲۰۰۸ء

☆ مولانا عبدالماجد دریابادی انشائے ماجد یا لطائف ادب ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ ۱۹۹۱ء

☆ مولانا عبدالماجد دریابادی (مرتب) بحر المحبت مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۸۲ء

☆ مولانا عبدالماجد دریابادی بشریت انبیاء صدق جدید بک ایجنسی لکھنؤ ۱۹۵۹ء

☆ مولانا عبدالماجد دریابادی (مترجم) پیام امن مولانا عبدالماجد دریابادی اکاڈمی ۱۹۸۱ء

☆ مولانا عبدالماجد دریابادی (مترجم) تاریخ اخلاق یورپ انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۳۲ء

☆ مولانا عبدالماجد دریابادی (مترجم) تاریخ تمدن علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ کالج علی گڑھ ۱۹۱۸ء

☆ مولانا عبدالماجد دریابادی (شاعری) تغزل ماجدی مولانا عبدالماجد دریابادی کاڈمی لکھنؤ ۱۹۷۹ء

☆ مولانا عبدالماجد دریابادی تفسیر ماجدی جلد اول مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ ۲۰۰۸ء

☆ مولانا عبدالماجد دریابادی تفسیر ماجدی جلد دوم مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ ۲۰۰۸ء

☆ مولانا عبدالماجد دریابادی تفسیر ماجدی جلد سوم مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ ۲۰۰۸ء

☆ مولانا عبدالماجد دریابادی (مرتب) تحفہ خسروی منشی نول کشور لکھنؤ ۱۹۲۱ء

☆ مولانا عبدالماجد دریابادی (مترجم) چہل حدیث صدق جدید بک ایجنسی لکھنؤ ۱۹۶۹ء

☆ مولانا عبدالماجد دریابادی حکیم الامت نقوش وتاثرات سعدی بکڈ پو الہ آباد س.ن

☆ مولانا عبدالماجد دریابادی خطبات ماجد یا ہدیہ زوجین صدق فاؤنڈیشن لکھنؤ ۲۰۰۷ء

☆ مولانا عبدالماجد دریابادی (مرتب) خطوط مشاہیر (حصہ اول) نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۶۹ء

☆ مولانا عبدالماجد دریابادی ذکر رسول یا مردوں کی مسیحائی صدق فاؤنڈیشن لکھنؤ ۲۰۰۷ء

☆ مولانا عبدالماجد دریابادی (ڈرامہ) زود پشیماں الناظر پریس لکھنؤ ۱۹۱۷ء

☆ مولانا عبدالماجد دریابادی سیرت نبوی قرآنی صدق جدید بک ایجنسی لکھنؤ ۱۹۶۳ء

☆ مولانا عبدالماجد دریابادی سفر حجاز ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ ۲۰۰۶ء

☆ مولانا عبدالماجد دریابادی سیاحت ماجدی صدق فاؤنڈیشن لکھنؤ ۲۰۰۶ء

☆مولانا عبدالماجد دریابادی (مرتب) فیہ مافیہ — دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۲۸ء

☆مولانا عبدالماجد دریابادی — فلسفہ جذبات — انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۱۴ء

☆مولانا عبدالماجد دریابادی — فلسفہ اجتماع — انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۱۵ء

☆مولانا عبدالماجد دریابادی — محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق — صدق فاؤنڈیشن لکھنو ۲۰۰۵ء

☆مولانا عبدالماجد دریابادی — معاصرین — ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ ۱۹۹۵ء

☆مولانا عبدالماجد دریابادی (مترجم) مکالمات برکلے — دارالمصنفین اعظم گڑھ ۲۰۱۱ء

☆مولانا عبدالماجد دریابادی (مترجم مناجات مقبول — برنی پرنٹنگ کمپنی کراچی ۱۹۶۴ء

☆مولانا عبدالماجد دریابادی (مترجم) منطق استخراجی واستقرائی — دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ۱۹۱۹ء

☆مولانا عبدالماجد دریابادی (مرتب) مکتوبات سلیمانی (حصہ دوم) — شاہی پریس لکھنو ۱۹۶۷ء

☆مولانا عبدالماجد دریابادی (مرتب) مکتوبات سلیمانی (حصہ اول، دوم) — نفیس اکیڈمی اردو بازار کراچی ۱۹۸۶ء

☆مولانا عبدالماجد دریابادی — محمود غزنوی — وکیل بک ٹریڈنگ ایجنسی امرتسر ۱۹۱۱ء

☆مولانا عبدالماجد دریابادی — مبادی فلسفہ (جلد اول) — دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۳۱ء

☆مولانا عبدالماجد دریابادی — مبادی فلسفہ (جلد دوم) — دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۳۴ء

☆مولانا عبدالماجد دریابادی (مترجم) ناموران سائنس — میکملن اینڈ کمپنی لمیٹیڈ کلکتہ ۱۹۲۴ء

☆مولانا عبدالماجد دریابادی — وفیات ماجدی یا نثری مرثیے — ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ ۲۰۰۲ء

☆مولانا عبدالماجد دریابادی — ہم آپ — ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد ۱۹۴۸ء

☆اعجاز الحق قدوسی — اقبال اور علمائے پاک و ہند — اقبال اکیڈمی پاکستان لاہور ۱۹۷۷ء

☆جنید احمد — شخصیات واقعات جنھوں نے مجھے متاثر کیا — جنید بک ہاؤس ممبئی س.ن

☆حکیم عبدالقوی دریابادی — ذکر ماجد — عبدالماجد دریابادی اکاڈمی لکھنو ۱۹۸۱ء

☆حکیم عبدالقوی دریابادی — مولانا عبدالماجد حیات وخدمات — عبدالماجد اکاڈمی لکھنو ۱۹۷۸ء

☆حسین قدوائی (مرتب) — چند سوانحی تحریریں — عبدالماجد دریابادی اکاڈمی ۱۹۸۵ء

☆حامد حسن قادری — داستان تاریخ اردو — اردو اکیڈمی سندھ ۱۹۸۸ء

☆ڈاکٹر ہاشم قدوائی (مرتب) — مکتوبات ماجدی (جلد اول) — ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ ۱۹۸۲ء

☆ڈاکٹر ہاشم قدوائی (مرتب) — مکتوبات ماجدی (جلد دوم) — ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ ۱۹۸۷ء

☆ڈاکٹر ہاشم قدوائی (مرتب) — مکتوبات ماجدی (جلد سوم) — ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ ۲۰۰۱ء

☆ڈاکٹر ہاشم قدوائی (مرتب)	مکتوبات ماجدی (جلد چہارم)	ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ ۲۰۰۷ء
☆ڈاکٹر ہاشم قدوائی (مرتب)	مکتوبات ماجدی (جلد پنجم)	ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ ۲۰۰۸ء
☆ڈاکٹر ہاشم قدوائی (مرتب)	مکتوبات ماجدی (جلد ششم)	ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ ۲۰۱۱ء
☆ڈاکٹر تحسین فراقی	مولانا ماجد دریابادی احوال و آثار	ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۹۳ء
☆ڈاکٹر سلیم اختر	اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ	کتابی دنیا دہلی ۲۰۰۵
☆ڈاکٹر گیان چند جین	تحقیق کا فن	ایجوکیشنل بک ہاؤس لکھنو ۲۰۰۵ء
☆رام بابو سکسینہ	تاریخ ادب اردو	ادارہ کتاب الشفاء نئی دہلی ۲۰۰۰ء
☆سلیم قدوائی	عبدالماجد دریابادی	ساہتیہ اکادمی نئی دہلی ۱۹۹۸ء
☆عبدالعلیم قدوائی (مرتب)	تبصرات ماجدی	قومی کونسل اردو زبان نئی دہلی ۲۰۰۹ء
☆عبدالعلیم قدوائی (مرتب)	نشریات ماجدی (حصہ اول)	خاتون منزل لکھنو ۱۹۹۷ء
☆عبدالعلیم قدوائی (مرتب)	نشریات ماجدی (حصہ دوم)	خاتون منزل لکھنو ۱۹۹۹ء
☆عبدالعلیم قدوائی	مولانا دریابادی حیات و خدمات	صدق فاؤنڈیشن لکھنو ۲۰۰۹ء
☆عبدالعلیم قدوائی	مولانا ایک باکمال انشاپرداز	صدق فاؤنڈیشن لکھنو ۲۰۱۰ء
☆مولانا غلام محمد (مرتب)	رقعات ماجدی	احمد برادرز پرنٹر ناظم آباد کراچی ۱۹۸۱ء
☆مالک رام	معاصرین (جلد چہارم)	مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۸۲ء
☆مرزا ہادی رسوا	امراؤ جان ادا	ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ ۱۹۹۴ء
☆مولانا سید ابوالحسن علی ندوی	پرانے چراغ (حصہ اول)	مکتبہ فردوس لکھنو ۱۹۸۰ء
☆مولوی عبدالحق	چند ہم عصر	انجمن ترقی اردو علی گڑھ ۱۹۶۶ء
☆نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی (مرتب)	سچی باتیں (جلد اول)	صدق فاؤنڈیشن لکھنو ۲۰۰۴ء

رسائل واخبار

☆اقبال ریویو (اقبالیات ماجد خصوصی نمبر)	حیدرآباد	اپریل۲۰۰۰ء
☆سچ	لکھنو	۲اگست۱۹۲۶ء
☆سچ	لکھنو	۲۴جنوری۱۹۲۷ء
☆سچ	لکھنو	۱۵دسمبر۱۹۳۳ء
☆صدق	لکھنو	۱۷اکتوبر۱۹۴۷ء
☆صدق	لکھنو	۱۵دسمبر۱۹۴۷ء
☆صدق جدید	لکھنو	۱۴دسمبر۱۹۵۱ء
☆صدق جدید	لکھنو	۲نومبر۱۹۶۷ء
☆صدق جدید	لکھنو	۲۹مارچ۱۹۶۸ء
☆صدق جدید	لکھنو	۲۱جنوری۱۹۷۷ء
☆فروغ اردو (مولانا ماجد نمبر)	لکھنو	اگست تا اکتوبر۱۹۷۱ء
☆کتاب نما	دہلی	دسمبر۲۰۰۸ء
☆معارف	اعظم گڑھ	جولائی۱۹۵۱ء
☆نقوش (شخصیات نمبر)	لاہور	اکتوبر۱۹۵۶ء
☆نقوش	لاہور	اگست۱۹۶۰ء
☆نقوش (آپ بیتی نمبر)	لاہور	جون۱۹۶۴ء
☆نقوش	لاہور	ستمبر۱۹۶۸ء
☆نگار		مئی۱۹۲۸ء
☆نیا دور (مولانا ماجد نمبر)	لکھنو	اپریل، مئی۱۹۷۶ء